از هر چه می رود سخن دوست خوشترست
"پیغام آشنا" نفس روح پرورست
سعدی

دوست کی بات ہر چیز سے زیادہ خوبصورت ہے، اس کے پیغام
کا ملنا ایک روح پرور لمحہ ہوتا ہے۔

به این بهانه درین بزم محرمی جویم
غزل سرایم و "پیغام آشنا" گویم
اقبال

اس بہانے سے بزم میں محرم راز کی تلاش کرتا ہوں، میں غزل سرا
ہوں اور دوست کو پیغام دیتا ہوں۔

ٹائیٹل
۱۔ بلور سے لیا گیا کوہ دماوند کی چوٹی کا ایک منظر

بیک ٹائیٹل
۲۔ قزوین کے نواح میں الموت کا نظارہ

اندرونی بیک ٹائیٹل
۱۔ چاہ بہار بندرگاہ (کنارک) ساحل سمندر

Marfat.com

سہ ماہی

پیغام آشنا

شمارہ نمبر ۲۰ (سرما)

جنوری تا مارچ، ۲۰۰۵ء

محبت رسول کریم ص ۵۰

بسم الله الرحمن الرحيم

Marfat.com

Marfat.com

سہ ماہی

پیغام آشنا

شمارہ ۲۰

جنوری۔ مارچ ۲۰۰۵ء

ایران اور پاکستان کے درمیان ثقافتی تعلقات کے بارے میں مطالعات اور تحقیقات پر مشتمل سہ ماہی مجلہ

مدیر اعلیٰ

علی اورسجی

کلچرل کونسلر اسلامی جمہوریہ ایران

مدیر اعزازی

ڈاکٹر محمد سلیم اختر

مدیر معاون

جاوید اقبال قزلباش

ثقافتی قونصلیٹ اسلامی جمہوریہ ایران

مکان نمبر 25 ‘ اسٹریٹ نمبر 27 ‘ F-6/2 ‘ اسلام آباد

فون نمبر: 8-2827937، فیکس: 2821771

Marfat.com

Marfat.com

اہم گزارشات

ایران اور پاکستان صدیوں سے دوستی اور اخوت کے بے شمار رشتوں میں منسلک ہیں۔ پیغام آشنا کے اجراء کا مقصدِ وحید ان دونوں ملکوں کے درمیان اس خطے کی مشترکہ میراث اور دور حاضر میں زندگی کے مختلف شعبوں میں دیگر اشتراکات کے بارے میں مناسب شعور پیدا کر کے ان تعلقات کو مزید مضبوط اور مستحکم بنانا ہے۔ اس سلسلے میں پیغام آشنا برصغیر پاک و ہند کے اہل علم وقلم کے ہر قسم کے تعاون کا بالعموم اور پاکستانی دانشوروں کی تحریروں کا بالخصوص خیر مقدم کرتا ہے۔

❁ پیغام آشنا ہر سال چار مرتبہ شائع ہوتا ہے۔

❁ پیغام آشنا میں معمولاً غیر مطبوعہ علمی، تنقیدی، ادبی اور ثقافتی مقالات شامل کیے جاتے ہیں، جن میں تحقیقی رنگ غالب ہونا چاہیے۔ مطبوعہ مقالے کے لکھنے والے کو متعلقہ شمارہ کے اس نسخے کے علاوہ اعزازیہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔

❁ پیغام آشنا میں شائع ہونے والے مواد کے نفس مضمون کے بارے میں تمام تر ذمہ داری متعلقہ مصنف و مترجم پر عائد ہوتی ہے اور ادارہ کا تمام حقائق، آراء اور تعبیرات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

❁ بغرض اشاعت ارسال کیے گئے تمام مضامین کاغذ کے ایک طرف ٹائپ یا صاف ستھرے خط میں، دونوں جانب مناسب حاشیے کے ساتھ لکھے ہوئے ہونے چاہئیں۔ حوالہ جات اور حواشی مآخذ کی ضروری تفاصیل کے ساتھ مقالے کی آخر میں منسلک کرنا نہ بھولیں۔ ضروری مکمل حوالوں کے بغیر موصول ہونے والے مقالات پیغام آشنا میں بالعموم شائع نہیں کیے جاتے۔

❁ پیغام آشنا میں کسی مقالے کی اشاعت کے لیے ادارہ کی طرف سے نامزد کردہ ماہرین کی تائید ضروری ہے اور اس سلسلے میں ادارہ ناقابل اشاعت تحریروں کی مصنفین کو واپسی کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔

❁ اشاعت کے لیے قبول کیے جانے والے مقالات میں ادارہ ضروری ادارتی ترمیم، تنسیخ اور تلخیص کا حق محفوظ رکھتا ہے۔

❁ پیغام آشنا میں اشاعت کے لیے جملہ نگارشات مدیر اعلیٰ، پیغام آشنا، کلچرل قونصلیٹ اسلامی جمہوریہ ایران، مکان نمبر 25، گلی نمبر 27، F-6/2، اسلام آباد۔ فون نمبر 8-2827937 فیکس نمبر: 2821771 کے پتے پر ارسال کی جاسکتی ہیں۔

❁ پیغام آشنا میں شائع شدہ مواد سے ماخذ کے ذکر کے بغیر استفادہ ممنوع ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

مجلس مشاورت

افتخار عارف	صدر نشین، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد
بشیر انور	سابق استاد، ایجوکیشن کالج، ملتان
صغریٰ بانو شگفتہ موسوی	سابق صدر شعبہ فارسی، نمل، اسلام آباد
ظفر اسحاق انصاری	ڈائریکٹر جنرل، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد
سید علی رضا نقوی	سابق صدر، شعبہ فقہ اسلامی، اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد
غضنفر مہدی	سیکرٹری، انجمن تاریخ و آثار، اسلام آباد
گوہر نوشاہی	استاد زبان و ادبیات اردو، دانشگاہ نمل، اسلام آباد
سید محمد اکرم شاہ	پروفیسر و صدر شعبہ اقبالیات، پنجاب یونیورسٹی، لاہور
محمد صدیق خان شبلی	سابق صدر شعبہ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
مرتضیٰ موسوی	سابق ڈائریکٹر جنرل، پاکستان نیشنل سنٹرز، اسلام آباد

☆☆☆

Marfat.com

فہرست

عزت مآب جناب محمد ابراہیم طاہریان، سفیر اسلامی جمہوریہ ایران کا پیغام		۱
رسالت مآب حضرت محمدؐ کا حسن و جمال	سعید احمد	۵
مرثیہ اور سلام	نیساں اکبر آبادی	۱۱
شعراء کا نذرانہ عقیدت بحضور شہدائے کربلا	سید حسین عارف نقوی	۲۰
دبستان لکھنؤ کا آخری نمائندہ۔ سید آل رضا	ڈاکٹر محسنہ نقوی	۲۷
افتخار عارف کا مدینہ سے کربلا تک کا شعری سفر	علی کمیل قزلباش	۴۶
دنیا کی عظیم ترین ثقافتوں میں سے ایک، ایرانی ثقافت	لوریس چکنا واریان	۵۶
انقلاب اسلامی ایران	ڈاکٹر رشید نثار	۶۴
اسلامی جمہوریہ ایران حقوق انسانی کے آئینے میں	جاوید اقبال قزلباش	۷۰
بابا فغانی شیرازی کا شہرہ پاک و ہند میں	ڈاکٹر انعام الحق کوثر	۸۰
سچل سرمست کے فکر و عرفان پر عطار کا اثر	ڈاکٹر گل حسن لغاری	۹۱
شاہزادہ اسد عبدالرحمٰن قدسی اور ان کی شاعری	ڈاکٹر محمود الرحمٰن	۱۰۶
عطاء اللہ خان اور امت مسلمہ	عنایت اللہ خان گنڈا پور	۱۱۶
مولوی نذیر احمد گجراتی۔ رباعیات خیام کا ایک گمنام مترجم	ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی	۱۲۲

Marfat.com

ڈاکٹر رانا محمد نصر اللہ احسان الٰہی جیسا کہ میں نے انہیں دیکھا	ڈاکٹر امین اللہ وثیر	۳۴
شاہ غلام دہلوی مجددی کے ملفوظات۔ ایک نو دریافت مجموعہ	ڈاکٹر عارف نوشاہی	۴۲
عربی، فارسی اور اردو حروف تہجی کا تقابلی جائزہ	ڈاکٹر محمد عطا اللہ خان	۴۷
اردو شاعری میں احوال چشم جاناں	محمد شعیب	۵۲
ڈارون کا تصور ارتقا اور اقبال۔ ایک تحقیقی جائزہ	ڈاکٹر محمد آصف اعوان	۵۹
بیدل و اقبال	محمد شاہ ضعیف	۶۸
رومی و اقبال	گلشن قیصرہ	۸۰
رنگوں کا نفسیاتی مفہوم اور ان کے ذہن انسانی پر اثرات	عابد حسین قریشی	۸۸
زیارات شام	حافظ افتخار احمد قادری	۰۳
''غالب کا ذوق تماشہ''	پروفیسر جمیل آذر	۰۹
''یادِ یارِ مہربان''۔ ایران ذوالفقار علی شاہ کی نظر میں	رانا سمیع اللہ	۱۴

☆☆☆

Marfat.com

اسلامی انقلاب کی چھبیسویں سالگرہ پر

عزت مآب جناب محمد ابراہیم طاہریان فرد سفیر محترم اسلامی جمہوریہ ایران کا پیغام

عزتمند پاکستانی قوم!

ایران کے اسلامی انقلاب کی چھبیسویں سالگرہ کے موقع پر اپنے پاکستانی بھائیوں بہنوں سے مخاطب ہونے کا اعزاز حاصل کرتے ہوئے مجھے انتہائی مسرت ہورہی ہے۔ ہردل عزیز انقلاب کا وہ پودا جو ایسے ہی پرمسرت دنوں میں ایک عظیم عالم دین کے توانا ہاتھوں نے بویا آج استحکام، ترقی اور نشوونما کے حساب سے ایک مثالی طاقت کے ساتھ بلندی وعظمت حاصل کر کے اپنے علاقے اور جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کے اندر امن و سلامتی کا آرزومند ہے۔ انقلاب اسلامی ایران اوراس کے معمار اور بانی امام خمینیؒ نے ہمیشہ ایک ایسے چراغ کا کردار ادا کیا جس نے انسانیت کو آزادی اور وقار وعظمت کا راستہ دکھایا اور جن کے پیغام کا منتہائے مقصود مادہ پرست استعمار کے قید و بند اور اسارت کی زنجیروں کو توڑنا تھا۔ ایسے بے مثال، بے نظیر مظاہر جنہوں نے اس انقلاب کی مدد کی ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ استعمار کی گزشتہ کئی سالوں کی مسلسل مخاصمت اور دشمنی کے باوجود یہ انقلاب مستحکم رہا اور دشمنان دین اپنی اس مخالفانہ راہ پر چلتے چلتے اپنی کامیابی سے مایوس اور ناامید ہوچکے ہیں۔ بے شک اس نظام کی کامرانی اور استمرار و بقا کا راز خدا کی رسی کو تھامنے میں مضمر ہے۔

میرے پاکستانی بھائیو اور بہنو!

اسلامی جمہوریہ ایران نے گزشتہ سال کے دوران اپنے خارجہ تعلقات میں تمام ممالک سے عموماً اور علاقائی اور بین الاقوامی روابط کے سلسلے میں منعقدہ معاہدوں کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے اقتصادی، ثقافتی اور دفاعی شعبوں میں خاص طور پر ہمہ جانبہ تعاون کو فروغ دینے پر خاص توجہ مبذول کیے رکھی۔ علاوہ ازیں ملک کے داخلی امور میں بھی تعمیر نو اور اقتصادی اور بنیادی معاشرتی ڈھانچے کو بہتر بنانے پر بھی خصوصی طور پر زور دیا گیا اور اس جدوجہد کے نتیجے میں اب تک بیشمار ثمرات ونتائج حاصل ہوچکے ہیں۔

Marfat.com

ان ثمرات و برکات میں اقتصادی ترقی کا حصول، قومی پیداوار میں اضافے کے اشاریے، شرح افراط زر، بے روزگاری اور بیرونی قرضوں میں کمی، معاشرے کی ضروریات کے مطابق اقتصادی اور مالی پالیسیوں میں توازن خصوصاً اس کے مظلوم طبقات کے سلسلے میں، انفراسٹرکچر اور ترقیاتی منصوبوں پر عمل درآمد میں تیزی، آزاد تجارتی علاقوں کا قیام، ان کا استحکام اور ان کو روبہ عمل لانا، غیر پیٹرولیم مصنوعات کی پیداوار اور برآمدات میں اضافہ، پر امن مقاصد کے لیے سافٹ ویر اور ٹیکنالوجیکل پروگرام پر توجہ، خود انحصاری میں پیشرفت، خصوصاً گندم کی پیداوار میں اضافہ، سائنسی اور صنعتی بنیادوں کی تقویت، قدرتی اور اسٹریٹجک وسائل کی تلاش، محرومی، فقر اور غربت کے خاتمے پر مناسب توجہ، سوشل اور بیمہ کی خدمات کو منظم کرنا، حفظان صحت کے مختلف پروگراموں کو فوقیت دینا، معاشرتی ضرروں اور نقصانات کے خاتمے نیز خاندانی روابط کی تحکیم کی طرف مناسب توجہ، معاشرے میں نظم و ضبط کی روح کی بالادستی، سول معاشرے میں مذاکرے اور گفتگو کی ثقافت کا فروغ، شہریوں خصوصاً نسلی اور مذہبی اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت، خاص طور پر خواتین کے حقوق کی نگہداری و تحفظ وغیرہ شامل ہیں۔ اسلامی جمہوریۂ ایران میں توانائی کے وسیع ذخائر اور وسائل کی فراوانی کے پیش نظر قومی استعداد اور صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اس شعبے میں غیر ملکی سرمایہ کاری پر بھی توجہ دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اسی سلسلے میں ملک میں غیر ملکی سرمایہ کاروں کو سہولتیں فراہم کرنے اور اس عمل میں سرعت پیدا کرنے کے لیے قانون سازی بھی کی گئی ہے۔

ملکی اقتصادیات کو سرگرم اور متحرک صورت دینے کی یہی ایک راہ ہے۔ انقلاب اسلامی کی کامرانی کے بعد ایران میں تعلیم و تربیت نے قابل رشک ترقی کی ہے یہاں تک کہ موجودہ صورت میں چھ سال سے اوپر کے افراد میں شرح خواندگی ۸۱،۸۵ فیصد تک پہنچ چکی ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا کی تعداد پچیس لاکھ ہے جن میں ۵۳،۴ فیصد لڑکیاں اور ۴۶،۶ فیصد لڑکے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ گذشتہ سال یونیورسٹیوں میں داخلے کی خواہش مند لڑکیوں کی شرح ۶۴ فیصد تھی۔

عزتمند پاکستانی قوم!

اسلامی جمہوریۂ ایران کی خارجہ پالیسی کی میکرو اسٹریٹجی کا اہم ترین ستون ہمسایہ ممالک کے ساتھ ترقی اور سلامتی کے فلسفے پر کاربند رہنا ہے۔ اسلامی جمہوریۂ پاکستان کا، جو ایران کا ہمسایہ مسلمان ملک ہے اور جس کے ساتھ اس کی طویل سرحدیں ملتی ہیں، اس نظریے کے لحاظ سے ایران کے لیے ایک خاص مقام ہے۔ ایک خیر خواہ ہمسایہ ملک ہونے

Marfat.com

کے ناتے پائیدار اور ترقی یافتہ پاکستان کا وجود ایران کے لیے موجب اطمینان ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے تہران اور اسلام آباد کے رہنماؤں کی بصیرت اور دونوں حکومتوں کے مابین دو طرفہ سنجیدہ سیاسی عزم اور علاقائی اور بین الاقوامی تعاون میں اضافہ کے لیے مطلوبہ مثبت فضا کی موجودگی سے خیر سگالی کے جو جذبات پیدا ہوتے ہیں انہیں دونوں قوموں کی سعادت اور سلامتی کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ دونوں قوموں کی تاریخی اور لازوال دوستی کی جڑیں مصلحین اور باہمی تعلقات کی دلدادہ شخصیتوں میں پیوست ہیں اس لیے کوئی بھی حادثہ ان دو حکومتوں اور قوموں کے برادرانہ تعلقات کو کمزور نہیں کرسکتا۔

پاکستان ان گنے چنے ملکوں میں سے ایک ہے جن سے ہم نے پیمان وفا باندھا ہے اور تہرن اور اسلام آباد کی موجودہ مثبت فضا دونوں قوموں کے لیے ایک غیر معمولی موقع ہے۔اسی سلسلے میں بم میں قدرتی زلزلے کا جو سانحہ رونما ہوا اس نے ایک ایسا بے مثال حماسہ پیدا کیا جس کے پرتو میں ہم نے پاکستان کی حکومت اوز قوم کے ایسے پرولولہ جذبات کا مشاہدہ کیا جو اس سانحے کے آفت زدگان کی مصیبتوں اور آلام میں کمی کا سبب بنے۔ اس حادثے نے دونوں مسلمان ہمسایہ ممالک کے درمیان موجود گہرے دلی دوستانہ تعلقات کو ایک بار پھر ظاہر و مشہود کردیا۔ گزشتہ سال پہلے تو دونوں ممالک کے اعلیٰ حکام نے دونوں ملکوں کے مسلسل دورے کیے اور پھر ایران و پاکستان کے مشترکہ کمیشن کا اجلاس دونوں ممالک کے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات کے افق پر رو بہ ترقی اور بلند آہنگ سیاسی اقتصادی و ثقافتی تعلقات کا پیغامبر بن کر ابھرا۔

علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر موجودہ دور میں ایک اور چیلنج جو ہمیں درپیش ہے وہ دہشت گردی کا خطرہ ہے۔ اسلامی جمہوریہ ایران انقلاب اسلامی کی کامرانی کی ابتدا ہی سے اس مذموم عمل کا مسلسل شکار رہا ہے اور اس نے بارہا دہشت گردی کی کاروائیوں اور بے گناہ لوگوں کے قتل عام کی ہر شکل میں مذمت کی ہے۔اسلامی جمہوریہ ایران کا خیال ہے کہ اس منظم وجود سے نبٹنے کے لیے ترجیحی اقدامات کے بجائے ابتدائی طور پر اس کی نشوونما میں سرگرم جڑوں کو، جن میں فقر، بے روزگاری، تعصب اور امتیازات اور غصب حقوق شامل ہیں، شناخت کرکے ان کا خاتمہ کیا جانا ضروری ہے تاکہ عالمی برادری امن اور سلامتی سے ـــــ جو انسانی معاشرہ کی ترقی کی ضمانت ہے ـــــ رہ سکے ۔ اس سلسلے میں تمام ممالک کا بین الاقوامی اداروں سے تعاون نیز دو طرفہ اور چند طرفہ باہمی تعاون مؤثر ہوسکتا ہے ۔ علاقے کی دیگر مشکلات ومسائل

Marfat.com

میں سے ایک منشیات جیسے خانہ برانداز عنصر اور اس میں ملوث بڑے بڑے بین الاقوامی مافیاؤں کے وجود کے خلاف جدوجہد ہے۔

اسلامی جمہوریہ ایران اس انسان دشمن عنصر سے ہمیشہ سنجیدہ طور پر نبردآزما رہا ہے اور اب تک اس راہ میں فوج اور پولیس کے ہزاروں افراد کے جانوں کا نذرانہ پیش کرچکے ہیں اور لاکھوں ٹن پکڑی گئی منشیات کو قومی اور بین الاقوامی مبصرین کی موجودگی میں تلف کیا جاچکا ہے۔

ایٹمی توانائی کے شعبہ میں اسلامی جمہوریہ ایران کا یہ راسخ اور پختہ یقین اعتقاد ہے کہ دنیا کے تمام ممالک کو ایٹمی توانائی سے پرامن استفادے کا حق حاصل ہے اور اس پر بعض انتہا پسند اور جارح ممالک کی اجارہ داری نہیں ہونی چاہیے۔اس بنا پر ایران نے ایٹمی ٹیکنالوجی کے پرامن استفادے کی راہ میں اب تک ایٹمی توانائی کے تمام علاقائی اور بین الاقوامی اداروں سے انتہائی تعاون کیا ہے،مذکورہ اداروں کے انسپکٹروں اور مبصرین کے لیے اپنی پرامن ایٹمی تنصیبات کے دروازے کھول دیے اور انہوں نے بارہا ایران کی طرف سے اس ٹیکنالوجی کے فوجی استعمال کی نفی پر زور دیا ہے۔

اسلامی جمہوریہ ایران قتل عام کے اسلحہ جات کے وجود کو دین اور عقل کی مخالفت جانتے ہوئے اور اپنی اس ڈاکٹرائن کے سلسلے میں کہ ایٹمی ہتھیاروں کو نہیں ہونا چاہیے مدتوں سے علاقائی اور بین الاقوامی فورموں میں جدوجہد کرتا رہا ہے کہ مشرق وسطیٰ کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک کردیا جائے۔

آخر میں ایرانی حکومت اور عوام کے نمائندے کے طور پر میں خداوند تبارک و تعالیٰ کی حمد، اور شکر ادا کرتے ہوئے دو طرفہ تعلقات کے سلسلے میں خیر سگالی کی مثبت فضا پیدا کرنے کے لیے انقلاب اسلامی ایران کی چھبیسویں سالگرہ کا پیغام، جو اقوام عالم اور بالخصوص پاکستان کی عزتمند قوم کے ساتھ دوستانہ تعلقات اور پرامن بقائے باہمی کے جذبات پر مبنی ہے، آپ بہن بھائیوں کو پیش کرتا ہوں۔خدا کرے ان دونوں ممالک کی سربلندی و دوستی کا چراغ ہمیشہ روشن رہے اور خداوند تعالیٰ کی برکتیں آپ سب کے شامل حال رہیں۔ آمین

☆☆☆

Marfat.com

رسالت مآب حضرت محمد مصطفیٰ کا حُسن و جمال

سعید احمد

قرآن مجید فرقان حمید میں ارشاد باری ہوتا ہے کہ والضحیٰO والیل اذا سجیٰ O ما ودعک ربک وما قلیٰO جس کا ترجمہ ہے کہ:

آفتاب کی روشنی کی قسم۔ اور رات (کی تاریکی) کی جب وہ چھا جائے۔ (اے محمدؐ تمہارے پروردگار نے نہ تم کو چھوڑا اور نہ (تم سے ناراض) ہوا۔

مندرجہ بالا آیت ربانی میں تفکر کا مقام ہے کہ اللہ رب العزت نے آفتاب کی روشنی کی قسم اٹھائی ہے۔ آفتاب کی قسم اٹھانے سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ جس طرح آفتاب کے نکل آنے سے اس کی روشنی پوری دنیا میں پھیل جاتی ہے اور وہ روشنی ہر ایک چیز پر غالب آجاتی ہے اسی طرح امام الانبیاء، آفتاب نبوت، بدرالدجیٰ، خیرالوریٰ، سرور لولاک، رسالت مآب حضرت محمدؐ کے دنیا میں تشریف لے آنے سے آپؐ کا حسن و جمال پوری دنیا کے حسن وجمال پر غالب آگیا ہے۔ سبحان اللہ! اللہ رب العزت کے بعد سراج المنیر سید الکونین حضرت محمدؐ سب سے زیادہ حسین وجمیل ہیں۔

امام غزالیؒ لکھتے ہیں کہ جتنے جسم کے اعضا اعتدال اور مناسب ہوں گے اتنا ہی جسم خوبصورت کہلائے گا۔ مثلاً آدمی کی ناک مناسب ہو'نہ زیادہ بڑی ہو اور نہ ہی زیادہ چھوٹی ہو، اور نہ زیادہ موٹی ہو اور نہ ہی زیادہ پتلی ہو، تو ناک خوبصورت کہلائے گی اور چہرہ تھوڑا خوبصورت ہوجائے گا۔ اگر اسی طرح چہرے کے تمام اعضا مناسب حالت میں ہوں اور جسم کے باقی تمام اعضا بھی مناسب حالت میں ہوں تو ایسا انسان خوبصورت کہلائے گا۔

یہ حسن و جمال کیا چیز ہے؟ اور حسن و جمال کس چیز کو کہتے ہیں؟ امام غزالی فرماتے ہیں کہ شکل وصورت دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک ظاہری صورت ہوتی ہے جو ہمیں نظر آجاتی ہے اور ایک باطنی صورت ہوتی ہے جو اہل باطن ہی سمجھ سکتے ہیں۔ مسلمان جو صحابہ سے محبت رکھتے ہیں، جیسے ابوبکر صدیقؓ یا حضرت علیؓ سے، اس کی وجہ یہی ہے کہ ابوبکر صدیقؓ سچے تھے۔

☆ محلہ مہر پورہ مشرقی، ضلع اٹک

Marfat.com

اللہ اور آنحضرتؐ سے بہت محبت رکھتے تھے۔ اسی طرح حضرت علی بہت بہادر تھے۔ تو یہ سخاوت، محبت، شجاعت اور بہادری باطنی اوصاف کہلاتے ہیں۔ امام غزالیؒ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ مسلمان فقہائے دین اور اولیاء اللہ سے بھی محبت رکھتے ہیں جیسے امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ وغیرہ سے، اور امام ابوحنیفہؒ یا امام شافعی سے محبت رکھنے کی یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ بڑے متقی اور صاحب علم تھے اور اس کے ساتھ ساتھ سخاوت، صدق و وفا، خوف و رجا اور زہد والے بھی تھے۔ یہی چیزیں باطنی اوصاف کہلاتی ہیں۔ حالانکہ مسلمانوں نے صحابہؓ اور بزرگانِ دین کو دیکھا بھی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود محبت رکھتے ہیں تو محبت رکھنے کی وجہ یہی ہے کہ ان کے اندر باطنی خوبصورتی بہت زیادہ تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ حسن و جمال تناسب اور اعتدال کی ایک کیفیت کا نام ہے۔ اگر انسان میں ہے تو خوبصورت انسان ہے، نباتات میں ہے تو پھول ہے، عمارت میں ہے تو تاج محل ہے۔ پس ثابت ہوا کہ ایک ظاہری صورت ہوتی ہے اور ایک باطنی صورت ہوتی ہے۔ حضرت محمدؐ جہاں ظاہری حسن و جمال میں پوری دنیا سے اعلیٰ و ارفع، اور اکمل و اجمل ہیں، اسی طرح باطنی حسن و جمال میں بھی پوری دنیا سے اعلیٰ و ارفع اور اکمل و اجمل ہیں۔

امام محمدؒ کوفہ سے بصرہ کی طرف جارہے تھے۔ آپ نے اپنی تمام کتب فقہ اونٹوں پر لادی ہوئیں تھی۔ راستے میں ایک یہودی ملا۔ اس نے امام محمدؒ کے شاگرد سے پوچھا کہ ان اونٹوں پر کیا ہے؟ شاگرد نے جواب دیا کہ ان اونٹوں پر فقہ کی کتابیں ہیں جو ہمارے امام صاحب نے قرآن و حدیث سے استنباط کر کے لکھی ہیں۔ یہودی نے کہا تمہارے امام صاحب نے اتنی کتابیں اکیلے لکھی ہیں؟ شاگرد نے جواب دیا ہاں، ہمارے امام صاحب نے اتنی کتابیں اکیلے لکھی ہیں۔ یہودی نے کہا کہ ذرا اپنے امام صاحب کی زیارت تو کراؤ۔ جب یہودی کو امام محمدؒ کی زیارت کرائی جاتی ہے تو وہ فوراً کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جاتا ہے۔ جب یہودی سے پوچھا گیا کہ صرف امام محمدؒ کی زیارت سے کیوں مسلمان ہو گئے، ان میں آخر تجھے کیا نظر آیا، تو یہودی نے جواب دیا کہ جب چھوٹے محمد اتنے خوبصورت ہیں جن کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ یاد آجاتے ہیں تو بڑے محمدؐ کتنے خوبصورت ہونگے؟ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک ہے اسی طرح آنحضرتؐ کی انسانیت اعلیٰ و ابدیت کبریٰ بھی وحدہ لاشریک ہے کیونکہ آپؐ کی انسانیت اور ابدیت میں کوئی شریک نہیں اور نہ ہی آپؐ کے حسن و جمال میں کوئی شریک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں ہم دیکھتے ہیں کہ تمام انبیاءؑ کا ذکر جہاں کہیں کیا گیا وہاں ان سب کو ان کے ناموں سے پکارا گیا ہے اور اگر بعض انبیاء

Marfat.com

کے لیے ''عبد'' کا لفظ استعمال ہوا بھی ہے تو اس کے ساتھ نام کی بھی تصریح کردی گئی ہے، مثلاً سورۂ مریم میں حضرت زکریاؑ کے لیے ارشاد ہوتا ہے: ذکر رحمت ربک عبده زکریا ٥ یعنی (یہ) تمہارے پروردگار کی مہربانی کا بیان (ہے جو اس نے) اپنے بندے زکریا پر (کردی تھی)

سورۂ ص میں حضرت داؤدؑ کے لیے فرمایا: و اذکر عبدنا داود ذاالاید ج
یعنی اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کرو جو صاحب قوت تھے۔

سورۂ ص میں ایوبؑ کے لیے آیا ہے۔واذکر عبدنا ایوب م
ترجمہ: اور ہمارے بندے ایوبؑ کو یاد کرو۔

حضرت محمدؐ کا اکثر مقامات میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ نہ تو آپؐ کا نام لیا گیا اور نہ آپؐ کو کسی دوسرے وصف سے نامزد کیا گیا بلکہ صرف ''عبد'' کے لفظ سے پروردگار نے آپؐ کو یاد فرمایا ہے: سبحن الذی اسری بعبده لیلا من المسجدالحرام الی المسجد الاقصا الذی برکنا حوله لنریه من ایلتنا ط

ترجمہ: وہ (ذات) پاک ہے جو ایک رات اپنے بندے کو مسجدِ حرام (یعنی خانہ کعبہ) سے مسجدِ اقصیٰ (یعنی بیت القدس) تک جس کے اردگرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں، لے گیا تاکہ ہم اُسے اپنی (قدرت کی) نشانیاں دکھائیں۔

الحمدالله الذی انزل علیٰ عبده الکتب ولم یجعل له عوجا ٥ ترجمہ: سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر (یہ) کتاب نازل کی اور اس میں کسی طرح کی کجی (اور پیچیدگی) نہ رکھی۔

فاوحیٰ الیٰ عبده ما اوحیٰ٥ ترجمہ: پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کی طرف جو بھیجا سو بھیجا۔

اس خصوصیت و امتیاز سے اسی حقیقت کو واضح کرنا مقصودِ الٰہی تھا کہ آپؐ کے وجود گرامی کی عبدیت اور بندگی اس درجہ آخری و مرتبہ قصوی تک پہنچ چکی تھی کہ جو انسانیت کی انتہا تھی۔اس لیے بغیر اضافت و نسبت کے صرف ''عبد'' کا لقب آپؐ کی پہچان کے لیے کافی تھا کیونکہ تمام کائنات میں آپؐ سا کوئی عبد نہیں۔پس جس کی یگانگی و بے ہمتائی کا یہ مرتبہ ہو، اس کی یاد میں جتنی گھڑیاں بھی کٹ جائیں، اُس کے عشق میں جتنے آنسو بھی بہہ جائیں، اس کی محبت میں جتنی آہیں بھی نکل جائیں اور اس کی مدح و ثنا میں جس قدر بھی زبانیں زمزمہ پیرا ہوں کم ہیں۔

اب تفکر کیا جائے کہ اُس ''عبد'' کے حسن و جمال کا کیا عالم ہوگا کہ جس کو اللہ تعالیٰ

Marfat.com

قرآن مجید میں یاد فرماتا ہے تو "عبد" کہہ کر یاد فرماتا ہے۔

○ امام غزالی لکھتے ہیں کہ انسان کو جن جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ چیزیں اللہ رب العزت نے انسان کو عطا کردیں اور اگر اس سے زیادہ چیزیں انسان کے لیے ضروری ہوتیں تو وہ چیزیں بھی قدرت عطا کردیتی اور کوئی ایسی چیز جو انسان کے لیے ضروری تھی اور قدرت نے اسے عطا نہ کی ہو تو یہ بخل ہوگا، اور اللہ تعالیٰ ان چیزوں سے پاک ہے۔ جو چیزیں ضروری تھیں وہ انسان کو سب کی سب مل گئی ہیں۔اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ اللہ رب العزت نے امام الانبیاء حضرت محمدؐ کو ظاہری اور باطنی طور پر اتنا حسین و جمیل بنایا ہے کہ اس سے بڑھ کر بنانا ممکن ہی نہ تھا۔ اگر ممکن ہوتا تو قدرت جود وسخا اور لطف و عطا کا مزید مظاہرہ کرتی۔ اللہ رب العزت نے امام الانبیاء حضرت محمدؐ کو اتنا بلند تر درجہ عطا کردیا ہے کہ اس سے بڑھ کر بلند تر درجہ ہے ہی نہیں۔ اگر اس سے بڑھ کر درجہ ہوتا تو اللہ رب العزت وہ درجہ بھی اپنے محبوب حضرت محمدؐ کو عطا کردیتے۔

○ حضرت محمد سے محبت ایزدی کے پانچ بڑے درجے

○ ا۔محبت کا پہلا درجہ یہ ہے کہ جب کسی چیز کو محبوب رکھا جاتا ہے۔ تو جہاں محبوب رہتا ہے وہ بھی عزیز ہوجاتی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے

لا اقسم بھٰذا البلد ○ و انت حل بھٰذا البلد ○ ترجمہ: ہمیں اس شہر (مکہ) کی قسم اور تم اسی شہر میں تو رہتے ہو۔اللہ رب العزت مکہ شہر کی قسم اٹھا رہے ہیں اور قسم اس لیے اٹھائی جارہی ہے کہ اس مقدس شہر میں اللہ رب العزت کے محبوب نبی رہتے ہیں۔ جس جگہ نبیؐ کے شب و روز گذرے ہوں اگر اسی جگہ کی قسم اللہ تعالیٰ نے اٹھائی ہو تو اس محبوب کے حسن و جمال اور حُسن و کمال کا کیا عالم ہوگا؟

○ ۲۔محبت کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ اگر کسی کے ساتھ بہت ہی زیادہ محبت ہو تو پھر اس کا لباس تک بھی عزیز ہوجاتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے: یاایھا المزمل ○
ترجمہ: اے (محمدؐ) جو کپڑے میں لپٹ رہے ہو۔
یاایھا المدثر ○ ترجمہ: اے (محمدؐ) جو کپڑا لپیٹے پڑے ہو۔

جس نبیؐ کے کپڑوں کا بھی ذکر قرآن مجید میں موجود ہو اُس کے حسن وجمال اور حسن وکمال کا کیا عالم ہوگا؟

○ ۳۔محبت کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ اگر محبوب کے ساتھ سچی اور پُرخلوص وابستگی ہو تو پھر اس کی جان بھی عزیز ہوجاتی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: لعمرک انھم لفی

Marfat.com

سکرتھم یعمھون ○ ترجمہ: (اے محمدؐ) تمہاری جان کی قسم! وہ اپنی مستی میں مدہوش (ہو رہے) تھے۔

جس نبیؐ کی جان کی قسم اللہ رب العزت نے اٹھائی ہو اس نبیؐ کے حسن و جمال اور حسن و کمال کا کیا عالم ہوگا؟

○ ۴۔محبت کا چوتھا درجہ یہ ہے کہ محبوب کے ساتھ بے انتہا محبت کی صورت میں من و تو کا امتیاز مٹ جاتا ہے اور اس کے ہر فعل اور خواہش کو عاشق کو اپنا فعل اور خواہش قرار دینے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہوتا ہے: وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ ترجمہ: اور (اے محمدؐ) جس وقت تم نے کنکریاں پھینکی تھیں تو تم نے نہیں پھینکی تھیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھیں۔

جس نبیؐ کے فعل کو اللہ رب العزت نے اپنا فعل قرار دے دیا ہو تو اس نبیؐ کے حسن و جمال اور حسن و کمال کا کیا عالم ہوگا؟

○ ۵۔محبت کا پانچوں اور آخری درجہ یہ ہے کہ محبوب کے ساتھ بے انتہا محبت کی صورت میں عاشق محبوب کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دے دیتا ہے۔قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہوتا ہے: من یطع الرسول فقد اطاع اللہ ترجمہ: جس شخص نے رسولؐ کی فرمانبرداری کی بے شک اس نے اللہ تعالیٰ کی فرمابرداری کی۔

جس نبیؐ کی اطاعت کو اللہ رب العزت نے اپنی اطاعت قرار دے دیا ہو تو اس نبیؐ کے حسن و جمال اور حسن و کمال کا کیا عالم ہوگا؟

حضرت محمدؐ سے محبت کے مندرجہ بالا پانچ سب سے بڑے درجے بیان ہوئے ہیں اور اگر کوئی حضرت محمدؐ سے بے انتہا محبت کرنا چاہے تو زیادہ سے زیادہ پہلے تین درجے طے کرسکتا ہے اور آگے والے دو درجے طے کرنا اور ان درجوں پر پہنچنا ناممکن ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے چوتھا اور پانچواں درجہ اپنے اور اپنے محبوب کے درمیان رکھ لیا ہے تاکہ زمین و آسمان کی تمام مخلوق کو پتا چل جائے کہ جہاں امام الانبیاء سید المرسلین خاتم النبیین بدرالدجیٰ خیر الوریٰ صاحب لولاک سرور کائنات حضرت محمدؐ کا رتبہ بہت ہی بلند ہے وہاں دوسری طرف رب ذوالجلال بھی اپنے محبوب سید الانبیاء سید السادات، سید الکونین، سید الاولین و الآخرین، شارع اسلام داعی حق حضرت محمدؐ سے اتنی زیادہ محبت کررہا ہے کہ اس سے زیادہ محبت کا کوئی درجہ ہی نہیں اور اس سے بڑھ کر محبت ہو ہی نہیں سکتی اور یہی اللہ رب العزت اور اس کے محبوب محمدؐ کے درمیان محبت کے دو درجے ہیں جہاں مخلوق کی رسائی ممکن ہی نہیں۔

Marfat.com

قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہوتا ہے کہ و اذ اخذالله میثاق النبین لما اتیتکم من کتٰب و حکمة ثم جاء کم رسول مصدق لما معکم لتومنن به و لتنصرنه قال ءَ اقررتم واخذتم علی ذلکم اصری ط قالوا اقررنا ط قال فاشهدوا وانا معکم من الشّٰهدین ٥ فمن تولّٰی بعد ذلک فاولئک هم الفٰسقون ■ ترجمہ: اور جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے عہد لیا کہ جب میں تم کو کتاب اور دانائی عطا کروں پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرے تو تمہیں ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد کرنی ہوگی اور (عہد لینے کے بعد) پوچھا کہ بھلا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا ذمہ لیا۔ (یعنی مجھے ضامن ٹھہرایا) انہوں نے کہا (ہاں) ہم نے اقرار کیا۔ (اللہ نے) فرمایا کہ تم (اس عہد و پیماں کے) گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں تو جو اس کے بعد پھر جائے وہ فاسق ہیں۔

مندرجہ بالا آیات ربانی سے یہ ثابت ہورہا ہے کہ اللہ رب العزت نے ازل میں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ سے اس بات کا عہد بھی لیا تھا کہ جب میں تمہاری زندگی میں اپنے محبوب نبی حضرت محمدؐ کو بھیج دوں تو تمہارا فرض ہوگا کہ اس پر ایمان لاؤ اور اس کی مدد بھی کرو۔ تمام انبیاء نے وعدہ کیا کہ ہم آنحضرتؐ پر ایمان لائیں گے اور مدد بھی کریں گے۔ تو جس نبیؐ پر ایمان لانا اور جس نبیؐ کی مدد کرنے کا وعدہ اللہ رب العزت نے ازل میں ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ سے لے لیا ہو تو اس نبیؐ کے حسن و جمال اور حسن وکمال کا اندازہ کیسے کیا جاسکتا ہے؟ اسی لیے امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح اللہ کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا اسی طرح رسول اکرمؐ کو سوائے رسولؐ کے اور کوئی نہیں جان سکتا۔ مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں جتنے بھی انبیاءؑ کے واقعات بیان ہوئے ہیں ان انبیاءؑ کے جو جو کمالات اور خوبیاں بیان ہوئی ہیں وہ تمام کے تمام کمالات اور خوبیاں امام انبیاءؑ سید المرسلین خاتم النبیین آفتاب نبوت بدرالدجیٰ خیر الوریٰ، شاہ لولاک، شارع اسلام، داعی حق، سرور کائنات محسنِ کائنات، رسالت مآب محبوب دوعالم حضرت محمدؐ میں جمع ہوگئیں ہیں۔ اسی طرح ہم یہاں پر بھی کہتے ہیں کہ اللہ رب العزت نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ کے حسن و جمال اور حسن وکمال کو امام الانبیاء سید المرسلین خاتم النبیین آفتاب نبوت بدرالدجیٰ خیر الوریٰ صاحب لولاک سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰؐ کے مقدس وجود میں جمع کردیا تھا۔

☆☆☆

Marfat.com

مرثیہ اور سلام

نیسان اکبر آبادی☆

آیئے سب سے پہلے مرثیہ کے معنی دیکھیے۔ وہ نظم جس میں مرنے والے کے اوصاف بیان کیے جائیں اور اظہار غم ہو اُسے مرثیہ کہتے ہیں اور اسے بھی مرثیہ کہتے ہیں جو شہدائے کربلا کے فضائل و مصائب اور شہادت کا ذکر ہو۔ اب مرثیہ کا لفظ اپنے پہلے معنی سے ہٹ کر دوسرے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مرثیہ کا لفظ کان میں پڑتے ہی لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ شہدائے کربلا کا ذکر ہوگا۔ بعض الفاظ اپنے لغوی معنی سے ہٹ کر اصطلاحی معنوں میں استعمال ہونے لگتے ہیں۔ اس کی مثال ایک اور لفظ سے دیتا ہوں۔ مرحوم کے معنی ہیں رحمت کیا گیا، بخشا گیا۔ اب یہ اپنے اصلی معنی سے ہٹ کر صرف اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو مرجاتا ہے۔ جب یہ لفظ بولا جائے گا تو ذہن فوراً ہر انسان کا سمجھ لے گا کہ کسی مرنے والے کی بات ہورہی ہے۔ اسی طرح مرثیہ کا لفظ اب خالصتاً واقعات کربلا سے مختص ہو کے رہ گیا ہے۔

اردو مرثیہ کی ابتداء سب سے پہلے دکن سے ہوئی قلی قطب شاہ (۱۶۱۱ء۔ ۱۵۰۸ء) اردو کا پہلا مرثیہ نگار رہے۔ اس زمانہ کے شعراء وجہی، غواصی، نصرتی اور ہاشمی مشہور ہیں۔ یہ شعراء مرثیہ کہتے تھے۔ دکن کے علاوہ بھی ہندوستان میں مرثیہ کہنے والے کئی گذرے ہیں ان میں فضلی، دہلی کا پہلا مرثیہ گو کہلاتا ہے۔ میرتقی میر اور سودا مرثیہ گوئی کی تاریخ میں اس حوالہ سے زیادہ اہم ہیں کہ انہوں نے مرثیہ کو مسدس کا روپ دیا۔

سودا کے بعد میر ضمیر، خلیق، دلگیر اور فصیح کی مرثیہ نگاری بہت اہمیت رکھتی ہے۔ انہوں نے مرثیہ کی صنف کو کافی ترقی سے ہمکنار کیا۔ دہلی سے اکثر شعراء لکھنو اور فیض آباد آئے۔ اودھ کے فرمانروا عقائد کے لحاظ سے شیعہ تھے اور مرثیہ گوئی زاد آخرت کی حیثیت رکھتی تھی۔

دہلی سے لکھنو منتقل ہونے والے شعراء میں سید ضمیر اور خلیق کو اس لیے نسبتاً زیادہ جوہر دکھانے کا موقع ملا کہ دلگیر کی زبان میں لُکنت تھی اور مرزا فصیح حج کے لیے عرب گئے اور

☆۱۳۱۳۔ اسٹریٹ نمبر ۵۶، ۸/۳۔ I، اسلام آباد

Marfat.com

وہیں مقیم ہوگئے۔ میر ضمیر اس عہد کے بہت بڑے مرثیہ نگار تھے۔ انہوں نے مرثیہ گوئی کے قالب میں ایک نئی روح پھونکی۔

انیس و دبیر کا عہد مرثیہ گوئی کا دورِ عروج تھا۔ اگرچہ دونوں کا میلان طبیعت اور مذاق جدا ہے لیکن کمالِ مرثیہ گوئی دونوں کے یہاں ملتا ہے۔ ان دونوں مرثیہ گویوں نے اردو شاعری کے محاسن کو اپنے مرثیوں میں سمو دیا ہے جس سے مرثیہ میں جان پڑ گئی۔ان دونوں کا کمال یہ ہے کہ مذہبی معتقدات کی پابندی کا لحاظ رکھتے ہوئے شعری خوبی کے ساتھ ساتھ لسانی جذبات و رویوں کا خاص خیال رکھا ہے۔ انیس و دبیر نے اردو مرثیہ کو فن کی جس بلندی پر پہنچا دیا ہے وہاں تک آئندہ کسی شاعر کے لیے پہنچنا بہت مشکل امر ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعد میں آنے والے شعراء نے مراثی خوب خوب کہے لیکن انیس و دبیر کے ہم پلہ نہ ہوسکے۔ان کے بعد جن کے نام مرثیہ گویوں میں قابل قدر اور نمایاں ہیں وہ یہ ہیں۔ مرزا تعشق، میر محمد ہادی، وحید محمد، جعفر اوج اور پیارے میاں رشید ان سب نے اس صنف کو آگے بڑھایا۔شبلی نے موازنۂ انیس و دبیر میں مرثیہ میں پیدا ہونے والی بے اعتدالیوں کی نشاندہی کی تاہم اسے اہم صنف سخن کی حیثیت سے تسلیم بھی کیا۔ ۱۹۱۸ء میں علامہ اقبال نے رموز بیخودی میں حضرت امام حسینؑ کے انقلابی کارناموں کو بیان کرتے ہوئے اسوۂ حسینی کو آزادی اور حریت کا نصب العین اور لاالہٰ کی بنیاد قرار دیا۔

راقم الحروف کے دادا محمد حسن اور نانا سید وقار علی عروج بھی اپنے عہد کے نمایاں مرثیہ گویوں میں شمار ہوتے تھے۔ نانا وقار علی عروج کے مرثیوں کی دو ٹیپ نقل کرتا ہوں جس سے ان کی منزلتِ شاعری واضح ہوجائے گی۔ دشمن آپس میں گھبرا کر یہ کہہ رہے ہیں:

اب جان کے بچنے کا کوئی طور نہیں ہے
عباسؑ ہیں عباسؑ کوئی اور نہیں ہے
ایسا تو زمانہ میں کوئی شیر نہیں ہے
عباسؑ کے تو نام میں بھی زیر نہیں ہے

۱۹۱۸ء میں دلو رام کوثری نے مرثیہ بعنوان ''قرآن اور حسینؑ'' کہا۔ ۱۹۲۳ء میں عزیز لکھنوی نے جدید مرثیہ ''درسِ وفا'' اور ۱۹۳۰ء میں جمیل مظہری نے پہلا مرثیہ ''عرفان عشق'' کہا جو ڈاکٹر اقبال کے جدید افکار سے متاثر ہوکر کہا گیا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں جوش مرحوم کے پہلے مجموعۂ کلام میں شائع ہونے والی دو نظموں ''ذاکر سے خطاب'' اور ''سوگوارانِ حسینؑ سے خطاب'' کے باعث جدید مرثیہ نگاری کے لیے زمین ہموار ہوگئی۔ ۱۹۳۷ء میں نسیم امروہوی

Marfat.com

مرحوم نے ایک جدید مرثیہ کہا جس میں حضرت علیؑ کے مناقب بیان ہوئے تھے۔ان کے دادا شمیم امروہوی بھی بڑے نامور مرثیہ گویوں میں شمار ہوتے تھے۔ سید آل رضا نے ۱۹۳۹ء میں نجم آفندی (مرحوم) کے نوحوں کی بیاض اشارات غم سے متاثر ہوکر جدید مرثیہ نگاری کی ابتدا کی جس میں بقول جوش ملیح آبادی عصر جدید کے تفکر کا اثر نمایاں نظر آتا ہے۔

۱۹۴۰ء میں جوش نے ''حسینؑ اور انقلاب'' لکھ کر جدید مرثیہ کو بام عروج تک پہنچا دیا اور جابر حکومت کے خلاف بغاوت کو اسوۂ حسینی قرار دیا۔ مرثیہ گویوں میں سے جوش کے ہم عصر میرے والد سید اسمٰعیل حسین نیر اکبر آبادی اور میرے رشتہ کے ماموں جناب نجم آفندی مرثیہ گوئی میں بڑا مقام رکھتے تھے۔

یہاں صرف مختصر سا ذکر نجم آفندی صاحب ہی کا کروں گا۔ ان کا پہلا مرثیہ ''فتح مبین'' جوش کے مرثیہ ''حسین اور انقلاب'' کے تین سال بعد ۱۹۴۳ء میں اور دوسرا مرثیہ ''معراج فکر'' ۱۹۶۰ء میں منظر عام پر آیا۔ جو جدید مرثیہ کے زمرے میں آتا ہے۔ جوش اور نجم جیسے شعرائے عظیم کا عقیدہ یہ تھا کہ ''جو مرثیہ تقلید حسینؑ پر ابھارے وہ جدید ہے اور جو مرثیہ تقلید حسین پر نہ ابھارے چاہے وہ جدید عہد ہی میں لکھا جائے وہ قدیم ہے۔ ماموں نجم آفندی نے بھی جو مراثی کہے وہ جدید مرثیہ نگاری کی بنیاد پر ہیں۔ خود نجم آفندی صاحب کے چند نظریات پیش کرتا ہوں۔ مرثیہ کہنے کا حق ان کو ہے جن کے دل گداز ہوں، جو سانحۂ کربلا کو محض ایک واقعہ نہیں سمجھتے بلکہ یہ جانتے ہوں کہ اس سانحہ کے پس منظر میں ایک درسِ عظیم پنہاں ہے۔ آپ ہی کا قول ہے کہ اب زمانہ وہ آگیا ہے کہ ضرورت ہے کہ اہل بیتؑ کا صحیح کردار دنیا کے سامنے پیش کیا جائے اور قوم کو صحیح معنوں میں قوم بنایا جائے۔ لہٰذا آپ نے جو مراثی بھی لکھے وہ انہی نظریوں کے تحت لکھے۔ راقم الحروف نے جہاں دیگر اصناف سخن میں طبع آزمائی کی، وہاں اب تک تین مرثیے بھی کہے ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں ''علم بردار حق'' کہا اور یہ مرثیہ مورگاہ میں اپنے ایک مہربان محترم اکبر نواب (مرحوم) کے گھر جا کر جوش ملیح آبادی صاحب کو (جب وہ تنہا اکبر نواب صاحب کے سبزہ زار میں تشریف فرما تھے) یہ کہہ کر سنایا کہ میں مبتدی ہوں اور ایک مرثیہ سنانا چاہتا ہوں، کیا آپ سننا پسند فرمائیں گے؟ فرمایا ہاں سنایئے۔ جب میں مرثیہ پڑھ رہا تھا تو وہ اپنے خاص انداز میں سر ہلا کر تعریف کرتے رہے۔ جب میں نے مرثیہ ختم کیا تو کہا جوش صاحب! مبتدی کی اس مشق پر اصلاح فرما دیں۔ فرمایا کہ یہ مبتدی کی کاوش نہیں، کہنہ مشقی ظاہر ہورہی ہے اور اس میں کہیں گنجائش اصلاح نہیں۔ ان کا یہ ریمارک میرے کہے ہوئے مرثیہ کے لیے سند بن گیا۔ اس مرثیے کے چند بند ملاحظہ

Marfat.com

ہوں:

وہ حسینؑ ابن علیؑ جو صبر کا پروردگار
مصطفیٰؐ کا جو چہیتا، انبیاء کا افتخار
نورِ عین مرتضیٰؑ، عالی نسب، عالی وقار
جس نے خوں دے کر کیا ہے گلشن دیں پر بہار
جس نے دنیا کو دکھائے جوہر شمشیر بھی
جس نے اک شب میں بدل ڈالا رخ تقدیر بھی

منزل عزم و عمل کا جو تھا راہی وہ حسینؑ
جادۂ حق کا تھا جو بانکا سپاہی، وہ حسینؑ
جس کی مظلومی نے ڈھایا قصر شاہی، وہ حسینؑ
جس کی ٹھوکر میں تھا ناز کجلاہی، وہ حسینؑ
فقر کے عالم میں بھی تھا جو امیروں کا امیر
جس کی ڈھونڈے سے زمانہ میں نہیں ملتی نظیر

جس نے آندھی میں چراغ حق جلایا، وہ حسینؑ
جس نے میداں میں قدم اپنا جمایا، وہ حسینؑ
جو کسی قوت کے چکر میں نہ آیا، وہ حسینؑ
بارشِ تیر و تبر میں مسکرایا، وہ حسینؑ
قوت بازو سے توڑی جس نے باطل کی کمر
اب اجالا ہی رہے گا دے گیا ایسی سحر

جس نے سرکش کفر و باطل کو جھنجوڑا، وہ حسینؑ
جس نے سنگ جور و استبداد توڑا، وہ حسینؑ
ظلم کے طوفان کے رخ کو بھی موڑا، وہ حسینؑ
جس جری نے موت کا پنجہ مروڑا، وہ حسینؑ

Marfat.com

خون کے دریا میں اپنے دیں کی کشتی کھے گیا
ہر خس و خاشاکِ باطل کو بہا کر لے گیا

وہ حسینؑ ابن علیؑ جو رہنمائے راہِ حق
جس کی ہیبت سے کلیجہ کفر کا ہوتا ہے شق
رعبِ مظلومی سے جس کے ظلم کا چہرہ ہے فق
کارنامے سے ہے روشن جس کے تاریخی ورق
جس نے سچائی کا دائم بول بالا کردیا
جس کی جرأت نے سرِ انساں کو اونچا کردیا

وہ حسینؑ ابن علیؑ جس نے رکھی ایماں کی لاج
جس نے سمجھا ہے بہ آسانی شریعت کا مزاج
وہ جو لے لیتا ہے طوفانوں سے بھی نذرِ خراج
جس نے پہنایا سرِ اسلام کو نصرت کا تاج
جو خزاں ناآشنا ہے، وہ گلستاں دے گیا
گل نہ ہوگی جو، وہی شمع فروزاں دے گیا

جس کو کہیے آسمانِ مہر و الفت، وہ حسینؑ
جس سے قائم ہے زمانہ میں عبادت، وہ حسینؑ
ڈال دی تھی جس نے اعدا میں قیامت، وہ حسینؑ
دشمنوں نے دی جسے دادِ شجاعت، وہ حسینؑ
فتنہائے شور و شر سارے کچل کے رکھ دیے
زندگی و موت کے معنی بدل کر رکھ دیے

سلام

لفظ سلام کے لغوی معنی سلامتی، تسلیم، آداب، خاتمہ، نماز پر سلام پھیرنا، غزل کے انداز پر نظم جس میں واقعاتِ کربلا اور شہیدانِ باوفا کے کردار کا ذکر ہو، کھڑے ہو کر رسولؐ

Marfat.com

اللہ کی بارگاہ میں سلام عرض کرنا، وغیرہ ہیں۔ عموماً سلام کا لفظ اب ان معنوں میں زیادہ لیا جاتا ہے جس میں واقعات کربلا اور شہیدان باوفا کے کردار کا ذکر ہو۔ یہ لفظ ایک صنفِ سخن کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

سلام کو بعض ناقدین مرثیہ کی ذیلی صنف قرار دیتے ہیں، لیکن ہیئت، بحر اور تعداد اشعار کے لحاظ سے یہ غزل کی صنف سے قریب ترین ہے۔ سلام نگاری کا تعلق اہل بیت اور ائمہ معصومینؑ کی سیرت اور ان کے کارناموں کی تشریح وتعبیر سے ہے تاکہ عمل خیر کی ترغیب دی جاسکے۔ سلام کے لیے غزل کا سانچہ مخصوص کردیا گیا ہے۔

سلام نگاری کی ابتدا بھی دکن ہی سے ہوئی۔ سلام مرثیہ کا پیش لفظ قرار دیا جاتا ہے۔محرم کے ایام میں چونکہ غزل کا کہنا اور سننا اچھا نہیں سمجھا جاتا،لہٰذا اس زمانہ میں غزل کے بدلے کے طور پر سلام نویسی کا اجراء ہوا اور مشاعروں کے بجائے مسالموں کی محفلیں ہونے لگیں اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

دکن میں ایسے شعراء کی کثرت تھی جن کا تمام تر کلام مرثیہ، سلام اور نوحہ تک محدود رہا۔ دکنی دور کے سلام نگاروں میں ذوقی، مرزا، وجہی، نوری اور ولی دکنی کے نام نمایاں ہیں۔ ان شعراء کے سلاموں میں حضرت امام حسینؑ کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کیا گیا ہے اور دیگر اہل بیت کے مصائب کا بھی ذکر ہے۔

دلی میں سلام نگاری

شمالی ہند پر بھی دکنی ادب کے اثرات مرتب ہوئے۔ اس صنف کو محمد شاہ (۱۷۵۸ء۔ ۱۷۱۹ء) کے عہد میں خاص اہمیت دی گئی۔ اس کے دو مقاصد تھے۔ ایک مقصد تو عیدِ میلادالنبیؐ کے سلسلے میں حضورؐ پاک پر درود و سلام کی محفل کا انعقاد تھا اور دوسرا مقصد ایام عزا میں شہدائے کربلا کو خراج عقیدت وتحسین پیش کرنا تھا۔دہلی کے سلام نگاروں میں شاہ حاتم، مسکین، سکندر، اور فضلی شامل ہیں۔میر و سودا کے عہد میں بھی سلام نگاری کا رجحان جاری رہا ۔ پرانے سلام نگاروں میں مصحفی، جرأت اور قائم چاند پوری کی سلام نگاری کے باعث سلام کی مقبولیت عام ہوئی۔ بہادر شاہ ظفر کے دور میں غالب، مولوی باقر شہید اور ظہیر دہلوی کے سلاموں میں ادب کے گہرے نقوش پائے جاتے ہیں۔ غالب کے ایک سلام کا مطلع سنیئے:

سلام اُسے کہ اگر بادشہ کہیں اس کو
تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اس کو

Marfat.com

لکھنؤ میں سلام نگاری

لکھنؤ میں ضمیر، خلیق، دلگیر اور فصیح نے سلام نگاری کو اعلیٰ معیار پر پہنچا کر اس کا ادبی قد بڑھایا اور بالآخر میر انیس کی سلام نگاری کی بدولت سلام، غزل کی خصوصیات سے اتنا قریب ہوگیا کہ بقول ڈاکٹر فرمان فتحپوری غزل اور سلام کے اشعار میں فرق کرنا مشکل ہوگیا۔ یہ بات فرمان فتحپوری صاحب کی حقیقت سے قریب تر ہے کیونکہ انیس کا ایک سلام ہے جس کا مقطع یہ ہے:

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

اور اسی سلام میں اس انداز کے اور شعر بھی ہیں جو غزل کے شعر لگتے ہیں سلام کے نہیں، لیکن ان کے سلام میں شامل ہیں۔ اسی طرح غزل میں نعت، سلام اور منقبت کے اشعار شامل کر لیے جاتے ہیں۔

میر انیس کے ہمعصر مرزا دبیر نے بھی بہت سلام لکھے۔ انہوں نے خالص رثائی سلام لکھے۔ میر انیس اور مرزا دبیر کے بعد ان کے خاندان کے شعراء کے علاوہ سلام نگاروں کی فہرست اچھی خاصی طویل ہے۔ سلام نگاری کا مقصد صرف بیہٖ اشعار لکھنا کافی نہیں سمجھا گیا، بلکہ اس میں شہادت حسینؑ کے مقاصد اور اس کے تعمیری پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا گیا۔ جن شعراء کے اسمائے گرامی سلام نگاروں میں آتے ہیں ان کی فہرست تو بڑی لمبی ہے مگر چند نمایاں نام درج کرتا ہوں۔ صفی لکھنوی، آرزو لکھنوی، جوش ملیح آبادی، سید آل رضا، نسیم امروہوی، آغا شاعر، عزیز لکھنوی، محشر لکھنوی، نیر اکبرآبادی، نجم آفندی، مہر اکبرآبادی اور راقم الحروف کی دادی اماں۔ دادی اماں کے سلام کے صرف پانچ شعر نمونے کے طور پر درج کرتا ہوں:

عاشق جو ہم گل رخ سرورؑ کے ہوگئے
جنت کے جتنے باغ تھے سب گھر کے ہوگئے
جب مرتضیٰؑ نے دوش نبیؐ پر رکھے قدم
رتبے بلند اور بھی حیدرؑ کے ہوگئے
کعبہ میں کی بتوں نے خدائی بہت دنوں
لیکن علیؑ کے آتے ہی، پتھر کے ہوگئے

Marfat.com

آئی ہے جن کی آیۂ تطہیر شان میں
محتاج آج آہ وہ چادر کے ہوگئے

ان کے لیے زمانہ میں یہ انقلاب، آہ!
جنت میں جن کے گھر ہوں، وہ بے گھر کے ہوگئے

میں نے سلام نگاروں میں ابتک سارے مسلمانوں ہی کے نام درج کیے حالانکہ مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں نے بھی بڑے عمدہ سلام کہے ہیں۔ ایک ہندو شاعر نافذ دہلوی کے سلام کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

آ بھی جاتا شہہ کے بچوں تک تو کیا پیتا کوئی
مل گیا تھا خون بھی عباس کا پانی کے ساتھ

ایک اور شعر انہی کا جس میں امام حسینؑ کے صبر کی انتہا دکھائی ہے:

خاموش کچھ ایسے رہے سرورؑ تہ خنجر
دشمن کے لیے بن گئے خنجر تہِ خنجر

گویا امام حسینؑ کی ذات گرامی ایسی ہستی ہے کہ جو پوری کائنات کے ہر شخص پر اثرانداز ہوتی ہے۔ سلام نگاری کے ضمن میں نجم آفندی کا نام پورے ہندوپاک میں مشہور ہے۔ انہوں نے سلام کو جدید عہد کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی اور اس لحاظ سے وہ جدید سلام نگاروں میں خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے نزدیک سلام نگاری کا مقصد روایتی نہیں بلکہ وہ ذکر حسینؑ اور شہدائے کربلا کے ذکر سے صحیح انسانی قدروں کو اجاگر کرنے کا مؤثر ذریعہ ہے۔ ان کے سلاموں کی خصوصیت اور مرکزی مقصد قوم کو عمل کی ترغیب دینا ہے۔ سلام نگاری کا اصل مقصد یہ ہے کہ شہدائے کربلا کے کردار اور اعمال صالحہ کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیا جائے کہ صالح عمل کی ترغیب ہو۔ مثال کے طور پر نجم آفندی کے سلام کے صرف پانچ شعر لکھ کر یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان کی سلام نگاری کا انداز ایسا ہے جس میں سانحۂ کربلا کی مقصدیت، کردارسازی کی ترغیب اور ذہن وفکر کی جلا ہوجائے۔ سلام کے مختلف اشعار:

اپنی طرف سے چھیڑ، نہ اپنی طرف سے جنگ
یہ مسلک حسین علیہ السلام ہے

☆☆☆

سبق حسینؑ کی محنت سے لو خدا کے لیے
لہو بہایا تھا کیا ارضِ کربلا کے لیے

☆☆☆

Marfat.com

تربیت کی ذہن انساں کی غمِ شبیرؑ نے
صاحب دل بن گئے جو غم کے خوگر ہو گئے
چاند نے زہرا(س) کے مستقبل درخشاں کر دیا
قومیت کی روح آزادی کو جولاں کر دیا

☆☆☆

پھر جائیں دن جو ذوق عمل بھی نصیب ہو
اب تک غمِ حسینؑ بحدِ خیال ہے

پانچ شعر پروفیسر سید علی سجاد مہر اکبر آبادی کے بھی اس لیے درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ معلوم ہو سکے کہ سلاموں میں بھی علوِ فکر کی کتنی گنجائش ہے:

جب انسانوں کو معراج شعور و آگہی ہوگی
حسینؑ ابن علیؑ سے درس دنیا لے رہی ہوگی
اٹھائے جب سر شبیرؑ نیزہ کی انی ہوگی
قیامت ہی سے پہلے اک قیامت آگئی ہوگی
حسینؑ اپنے لہو سے کر گئے روشن چراغ ایسے
قیامت تک نہ حائل روشنی میں تیرگی ہوگی
نہ روئے ہوں گے جب بے شیر کی میت پہ بھی سرور
شجاعت اپنے حدِ آخری کو چھو رہی ہوگی
غم سبطِ پیمبر مہر ہر غم کا مداوا ہے
زمانہ میں کسی غم کو یہ عظمت کب ملی گی

☆☆☆

Marfat.com

شعراء کا نذرانہ عقیدت بحضور شہدائے کربلا

سید حسین عارف نقوی☆

۶۲ھ / ۶۸۲ء میں کربلا کا لٹاہوا قافلہ مدینہ منورہ پہنچا غالباً پہلی مجلس اس وقت منعقد ہوئی جب امام زین العابدین علیہ السلام نے بشیر بن جذلم کو مدینے میں اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لیے بھیجا اور اس نے مدینے کی گلیوں میں پکار کر کہا:

یا اھل یثرب لا مقام لکم بھا قتل الحسین فادمعی مدرا را

اور سیدہ ام کلثوم بنت علی علیہا السلام نے ایک رقت آمیز مرثیہ پڑھا جس کا ایک شعر ہے:

خرجنا منک باھلین جمعا رجعنا لا بنات و لا بنین

مدینہ منورہ، عراق، ترکی اور ایران میں مجالس عزا میں مرثیہ و نوحہ خوانی کا رواج صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ برصغیر میں بھی ابتدائے مجلس میں رباعی و قطعات کا رواج رہا۔ بعد ازاں مرثیہ، حدیث خوانی اور نوحہ خوانی بھی رواج پا گئی ہمایوں اور اکبر کے زمانہ سے عزاداری بھی ہونے لگی۔

شعراء نے بھی اپنا اپنا نذرانہ عقیدت رباعیات، قطعات، مراثی، اور نوحوں کی صورت میں پیش کیا۔ مرور زمانہ کے ساتھ ان پرانی منظومات کو بھلا دیا گیا ان میں سے بعض درج ذیل ہیں:

رباعیات و قطعات

(۱)

شہنشاہ اجمیر حضرت خواجہ غریب نواز معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ:

☆سابق پرنسپل گورنمنٹ فیڈرل ہائی اسکول، اسلام آباد

Marfat.com

شاہ است حسین بادشاہ است حسین　　دین است حسین دین پناہ است حسین
سر داد نداد دست در دست یزید　　حقا کہ بنائے لا الہ است حسین

(۲)

حضرت قاری حافظ عبدالودود صاحب شمس حنفی لکھنوی:

السلام ای تشنہ لب جان امامت السلام　　السلام ای راکب دوش امامت السلام
السلام ای وارث دین پیمبر(ص) السلام　　السلام ای مالک تسنیم و کوثر السلام
السلام ای راز دار سر وحدت السلام　　السلام ای تاجدار باغ جنت السلام
السلام ای فاطمہؑ زہرا کے دلبر السلام　　السلام ای تشنہ لب مذبوح خنجر السلام

محمد عربیؐ کے پسر پہ لاکھ سلام　　لب فرات کے تشنہ جگر پہ لاکھ سلام
تڑپ تڑپ کے نہ کیونکر کہے دل مومن　　بتولؑ پاک کے نور نظر پہ لاکھ سلام

(۳)

امام بارگاہ علمدار حسین انبالہ میں آپ کے صاحبزادے میرزوار حسین خود حدیث پڑھتے اور مجلس کا آغاز اس رباعی سے کرتے:

فریاد بر غریبی و بی یاری حسینؑ　　وز نالہ ہای دمبدم و زاری حسینؑ
شد سرنگوں چوں خیمہ زنگاری حسینؑ　　مشغول شد علیؑ بہ عزاداری حسینؑ

(۴)

مولانا سید سبط عباس فرقت لکھنوی:

ای حسین ابن علیؑ لاریب احسان کردہ ای　　ہر بشر را در لباس عقل انسان کردہ ای

Marfat.com

جان و مال و عزت دنیا سپردہ خلق را　　　تا ابد درچشم حق بین حق نمایان کردہ ای(۴)

(۵)

پنڈت ایسری پرشاد پنڈت دھلوی

نکلیں جو غم شہ میں وہ آنسو اچھے　　　برہم ہوں جو اس غم میں وہ آنسو اچھے

رکھتے ہیں جو حسینؑ سے کاوش پنڈت　　　ایسے تو مسلمانوں سے ہندو اچھے(۴)

سلام

حکیم چھنومل نافذ دھلوی شاگرد بیخود دھلوی:

سلامی کیا کوئی بیکار ہے جی سے گزر جانا　　　حیات جاودان ہے شاہ کے ماتم میں مرجانا

نہ آتا جنھیں راہ حقیقت سے گزر جانا　　　حسین ابن علیؑ سے سیکھ لیں وہ لوگ مرجانا

غم آل نبی ممکن نہیں دل سے اتر جانا　　　نہ بھولیں گے کسی کا ہم جواں ہوتے ہی مرجانا

مٹائے سے کسی کے نام مٹ جائے ابھی کیونکر　　　ابھی تو رنگ لائے گا شہ بیکس کا مرجانا

بجائے اشک آنکھوں سے نہ آئے خون کیوں نافذ　　　قیامت ہے کسی کے باپ کی گودی میں مرجانا(۵)

(۲)

قاضی سید محمد عبدالعلی رضوی عابد (ایڈیٹر اخبار مخبر عالم مراد آبادی) شاگرد رشید حضرت داغ دھلوی:

شہید وادی کرب و بلا سلام علیک　　　حسینؑ ابن علی مرتضی سلام علیک

درود تجھ پہ کہ سردین پہ دیا تو نے　　　امام خستہ تن بے خطا سلام علیک

کٹایا دین پہ سرکی نہ بیعت فاسق　　　حسینؑ مرحبا صل علی سلام علیک

درود پڑھتا ہے رو رو کے مدح گو عابد　　　قبول کیجیے شہ کربلا سلام علیک(۶)

Marfat.com

(۳)

عثمان علی خان فرمانروائے حیدرآباد دکن:

از جہاں تو بہ جناں ای علی اصغرؑ رفتی　　صبر بردی ز دل و سوی برادر رفتی
روی بی شیر ندیدند عزیزان صد حیف　　زود تر ہمچو قرار دل مادر رفتی
تشنہ لب بودی و از تیر جفا برحلقوم　　زخم خوردی و برنگ گل احمر رفتی
از کنار شہ ذیجاہ لب آب فرات　　صورت ماہی بی آب تو مضطر رفتی
کاش آنجا نہ فراموش کنی عثمان را　　تو کہ در خدمت پیغمبرؐ و حیدرؑ رفتی (۷)

(۴)

سرکشن پرشاد شاد صدراعظم دولت آصفیہ' حیدرآباد دکن:

حسینؑ ابن علیؑ ہیں فرد یکتا　　کوئی مظلوم ایسا تھا نہ ہوگا
دیا سر آپ نے راہ خدا میں　　کیا دین نبیؐ کو دین اپنا
جگر بند علیؑ و فاطمہؑ ہے　　رسول اللہؐ کا پیارا نواسہ
کیا آل نبی کو قتل صد حیف　　مسلمانو کیا یہ ظلم کیسا؟
ولائے سبط پیغمبر ہے نعمت　　یہ نعمت ہو عطا ہراک کو مولیٰ
علی اصغرؑ ہوئے جب گود میں قتل　　ہوا خیمے میں شہ کے حشر برپا
ہمیشہ کی مری عقدہ کشائی　　معاون شاد کے ہیں آپ مولیٰ (۸)

(۵)

مولانا عرشی بنارسی:

اے مطلع نور خدا عرشی سلامت می کند　　چشم و چراغ مصطفیؐ عرشی سلامت می کند
ای راکب دوش نبیؐ وی زین آغوش نبی　　محبوب محبوب خدا عرشی سلامت می کند
ای وارث آدمؑ صفی ای وارث نوح نجی　　زیب سریر اصطفا،عرشی سلامت می کند
ای اکبر زیبا جوان، ای کشتہ تیغ سنان　　ای ہم شبیہ مصطفیؐ، عرشی سلامت می کند
ای دافع رنج والم' ای داروی ہر درد و غم　　ای تربت خاک شفا' عرشی سلامت می کند
ای حامل رنج و بلا محروس دشت نینوا　　ای خامس آل عبا عرشی سلامت می کند (۹)

Marfat.com

مرثیہ

سلطان عالم واجد علی شاہ:

تیزی رخ فولاد کی حدّاد سے پوچھو
مظلوم کی حالت ستم ایجاد سے پوچھو
بلبل کا پھڑکنا دل صیاد سے پوچھو
بے رحمی و سختی کسی جلاد سے پوچھو
تنہائی غم سبط پیمبر کو ہے معلوم
گرمی خلف ساقی کوثر کو ہے معلوم
شیرازہ ایمان کتاب نبوی ہے
قبضے میں سب آثار و حد مرتضوی ہے
حیدر سا پدر کس کا ہے ماں کس کی ہے زہرا(س)
نانا ہے نبی کس کا حسن بھائی ہے کس کا(۱۰)

(۲)

مولانا عالم لکھنوی:

ای تشنہ لب برادر من از وطن جدا
فرق مقدس تو جداہست و تن جدا
در خیمہ شور حشر بپا شد برای تو
طفلان جدا بدرد تو نالند و من جدا
کلثوم نالہ کش بفراق تو مثل من
سجاد اشک بریزید بیت الحزن جدا
ای شمع من تو کشتہ شدی اندرین جہان
نالد بدرد ہجر تو، ہر انجمن جدا
سوی مدینہ دید و فغان زد کہ یا رسولؐ
ہستند ذریات تو با خاطر ملول(۱۱)

نوحے

(۱)

سید محمد نقوی چھپروی (بہار):

کربلا تیری کہانی رہ گئی
عاشقوں میں خون فشانی رہ گئی
غنچۂ باغ نبی مرجھا گئے
بہتے دریا کی روانی رہ گئی
دل کے آئینے میں اک تصویر غم
بن کے اکبر کی جوانی رہ گئی
رن سے لانے کو جواں بیٹے کی لاش
شاہ دین کی ناتوانی رہ گئی
اے نقی پھر ہے یہ روزِ دار و گیر
اپنی قسمت آزمانی رہ گئی(۱۲)

Marfat.com

(۲)

سید زین العابدین عابد نقوی آف کھجوہ:

پوچھتی ہے روح زہرا(س) حرملہ کے تیر سے		کیا خطا سرزد ہوئی تھی اصغر بے شیر سے
چھید کر حلق علی اصغر وہ تیر حرملہ		حشر تک نکلا نہ قلب بانوئے دلگیر سے
ہو چکا سب فتح لشکر آ گیا وقت زوال		مانگتے ہیں شاہ ملبوس کہن ہمشیر سے
جب چلے مقتل کو اصغر مسکرائے کس لیے		حشر میں پوچھوں گا عابد حضرت شبیرؑ سے (۱۳)

(۳)

یہ نوحہ جعفر علی خان اثر لکھنوی کی بیٹی کا ہے جنکا تخلص انور تھا(۱۴)

حوصلہ اے چشم گریاں رہ گیا		ماتم سرور کا ارماں رہ گیا
تیر جب اصغر کی گردن پر لگا		ایک ہچکی لے کے ناداں رہ گیا
سہرا اکبر کے نہ دیکھا جیتے جی		دل میں بانو کے یہ ارماں رہ گیا
ہائے وہ بیکس لٹا جس کا لباس		ہائے وہ لاشہ جو عریاں رہ گیا
ہند انور ہم چلے آئے مگر		کربلا میں قلب نالاں رہ گیا

(۴)

مرزا باقر علی افسر بی اے منشی فاضل:

فرزند مصطفیٰؐ در دشت کربلا		شد کشتہ از جفا ای وامصیبتا
شمشیر آن لعین برحلق نازنین		باشد کجا روا ای وامصیبتا
جن و بشر گریست خیرالنساء گریست		در نالہ شد قضا ای وامصیبتا
ای شاہ بی کفن در دست من رسن		بستند اشقیا ای وامصیبتا
این دخترت ز من پرسد بہر زمن		بابم بگو کجا ای وامصیبتا
افسر بصد بکا گوید زدل شہا		روحی لک الفدا ای وامصیبتا(۱۵)

(۵)

سروش ملیح آبادی برادر زادہ جوش ملیح آبادی:

یوں شب عاشور گھبراتی رہی		غم سے ہر تارے کو نیند آتی رہی
ہاں مدینہ چھوڑ کر شاہ چل دیے		قبرماں کی گود پھیلاتی رہی
حشر تک قبر سروش زار سے		ماتم شہ کی صدا آتی رہی(۱۶)

Marfat.com

حوالہ جات

۱ - ماہنامہ الواعظ لکھنو، جون ۱۹۳۹ء، ص ۱۵

۲ - ہفت روزہ رضاکار لاہور، تاریخ عزاداری نمبر، جون ۱۹۶۲ء ص ۱۳۸

۳ - ہفت روزہ اسد، لکھنو، محرم نمبر، مارچ ۱۹۳۷ء، ص ۶۵

۴ - ایضاً، ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۵ء، ص ۱۱

۵ - ایضاً، ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء، ص ۸۵

۶ - ایضاً، ہفت روزہ اسد لکھنو محرم نمبر، ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء، ص ۶۹

۷ - ایضاً، ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء، ص ۷

۸ - ایضاً، ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء، ص ۵۱

۹ - ایضاً، ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء، ص ۸

۱۰ - ایضاً، ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء، ص ۵۱

۱۱ - ایضاً، ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء، ص ۵۷

۱۲ - ہفت روزہ سرفراز لکھنو، محرم نمبر ۱۳۶۸ھ/۱۹۳۸ء، ص ۲۳

۱۳ - ہفت روزہ اسد لکھنو، محرم نمبر ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء، ص ۷۰

۱۴ - ہفت روزہ سرفراز، لکھنو محرم نمبر، ۱۳۵۹ھ/۱۹۳۱ء، ص ۲۰

۱۵ - نوحہ افسر، خواجہ بک ایجنسی لاہور، ص ۱۰

۱۶ - ہفت روزہ سرفراز، لکھنو، محرم نمبر، ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء، ص ۳۰

☆☆☆

Marfat.com

دبستان لکھنؤ کا آخری نمائندہ

سید آل رضا

ڈاکٹر محسنہ نقوی☆

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ نہایت تواتر سے یہ صدا گونجی کہ ایسی انسانی قدریں ابھاری جائیں جو ہمہ گیر نوعیت کی ہوں جو تحریک آزادی میں شامل اہل وطن کو ایک راستہ دکھا سکیں اور انگریزوں کے خلاف نبردآزما ہونے کا جذبہ فزوں کرسکیں، حکومت برطانیہ کی مسلط کی ہوئی غلامی کے طوق کو توڑنے کا عزم ابھار سکیں اور جو بہرصورت، مایوسی اور خوف و ہراس کے ہر سو چھائے ہوئے اندھیرے میں مشعل بن سکیں۔

اس جدید فکری رجحان نے اردو ادب کو ایک نیا موڑ دیا نئے آہنگ اور لے کی دھمک فضا میں تھرتھرانے لگی، شعر و ادب کی بزم میں نئی صفیں تشکیل پانے لگیں اور قدیم اصناف کے قالب بھی بدلنے لگے۔

اس بڑھتے ہوئے انقلاب سے متاثر ہوکر متذکرہ دور کے شعراء نے بھی اپنی روش بدلی۔ شکستہ حال قوم میں ہمت و ولولہ پیدا کرنے کی خاطر انہوں نے اپنے فن کا سہارا لیا۔ حق و باطل اور خیر و شر کی مسلسل آویزش میں انہوں نے آزادی کشمیر اور پاکی نفس کو اجاگر کیا اور اعلیٰ انسانی قدروں کی پاسداری اور حمایت و حفاظت کی جانب عوام الناس کی توجہ مبذول کرائی۔سب سے اہم تاریخی حقیقت یہ ہے کہ نئی تحریکوں اور نئے رجحانات کے نتیجے میں جدید دبستان شاعری کا آغاز متنوع انسانی مسائل کے پیچ وخم سے ہوا۔ عمرانی شعور، اجتماعی ادراک، طبقاتی احساس اور معاشی مسائل جدید ادب میں در آئے۔ اس ہمہ گیر تصور نے محدودیت اور عصبیت کے حلقے کو توڑ کرشاعر کو آفاقی اور کائناتی احساس کا خوگر بنادیا۔ غرض اس جدید فکری لہر نے اردو زبان کے ہر باشعور ادیب و شاعر کو کسی نہ کسی طرح متاثر کیا۔ اسی کاروانِ شعراء میں سید آل رضا بھی شامل تھے۔

☆شعبۂ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

Marfat.com

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ سید آل رضا کے شعور اور شاعری کا زمانہ بالکل وہی ہے جو برصغیر میں اجتماعی اور سیاسی انقلاب کا زمانہ تھا۔ چونکہ آل رضا ایک بالیدہ شعور، بے پایاں احساس اور حد درجہ غور وفکر کے شاعر تھے، لہٰذا وہ اپنے عہد کے ادراک اور ارتقائی انداز سے متاثر ہوتے رہے۔ چنانچہ ان کی شاعری میں قدیم اصولوں کی پابندی کے ساتھ ساتھ ایک نیا احساس، نیا جذبہ اور نیا تجربہ ملتا ہے۔ پروفیسر یوسف جمال انصاری کے بقول " انہوں نے روایت سے روگردانی نہیں کی لیکن وقت کے تقاضوں کا ساتھ بھی نہیں چھوڑا۔ گویا روایت اور جدت کو یک جان کر دیا۔"(۱)

اس میں کلام نہیں کہ سید آل رضا برصغیر پاک و ہند کے مشہور و معروف شاعر تھے۔ان کا شمار اپنے دور کے نمائندہ سخن سنجوں میں ہوتا ہے۔ ان کا درجہ مسلم الثبوت استاد کا سا ہے۔ وہ بیسویں صدی کے ان شعراء میں تھے جنہوں نے جلال لکھنوی، آرزو لکھنوی اور صفوی لکھنوی جیسے اساتذہ فن کی جلائی ہوئی شمع کو روشن رکھا۔ مزید برآں آل رضا نے سراج لکھنوی اور قدیر لکھنوی کے ساتھ مل کر لکھنؤ کے نئے شعری دبستان کو تقویت بخشی۔ یہی نہیں، موصوف لکھنوی مزاج، لکھنوی تہذیب، لکھنوی شاعری اور لکھنویت کے بھی قابل احترام نمائندے تھے۔ جہاں ان کے کلام میں آرزو لکھنوی اور عزیز لکھنوی کی شاعری کا پرتو ہے وہاں ان کا اپنا انفرادی رنگ بھی بہ حسن و خوبی عیاں ہے۔

ہم اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کر سکتے کہ سید آل رضا کی طبیعت میں قیامت کا سوز و گداز اور بلا کی گداختگی ہے۔(۲) قدرت کی طرف سے اس ودیعت شدہ صفت کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ غزل اور مرثیے، دونوں اصناف سخن میں دلوں کو مرتعش کرنے والے اشعار پیش کرتے ہیں۔ ان کی شعر گوئی میں نہ تصنع کا شائبہ ہے نہ ملاوٹ کی پیوندکاری۔ اپنے کلام میں انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے وہ مخصوص تازگی و شگفتگی کا اظہار اور احساس حسن و جمال کا صحیح اور واضح تصور پیش کرتے ہیں۔ آل رضا کی شاعری میں فکر و شعور کی گہرائی بھی ہے اور لطیف و نازک احساسات کی ترجمانی بھی۔ ان کے موضوعات وسیع و ہمہ گیر ہیں اور احساس کی شدت، جذبات کے خلوص اور شعور کی پختگی سے مالا مال بھی۔ سب سے اہم بات یہ کہ سید آل رضا کو بیسویں صدی کی متغیر زندگی کا بخوبی ادراک ہے اور اپنے فکر و فن سے اسے سنوارنے کی دلی آرزو بھی۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

رت اور فضا بدلی، زنداں کی ہوا بدلی
بیڑی کی صدا بدلی، دیوانہ پریشاں ہے

Marfat.com

چراغ اتنے نڈر تھے شب جوانی کے
ہوا کے رخ پہ جلے اور رات بھر ٹھہرے

یہی غزل گو آل رضا جب مرثیہ نگاری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اپنے انفرادی مزاج، فن کارانہ صلاحیت اور محبت اہل بیت کی بدولت اس صنف سخن میں بھی ایک امتیازی مقام حاصل کرلیتے ہیں۔ انہیں جدید مرثیے کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔(۳) مرثیے کی دنیا میں انہوں نے نمایاں کام کیا ہے۔ آل رضا کے مرثیے میں زندگی کی نئی رمق اور سماجی اقدار کی تبدیلیوں کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ اس حقیقت میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں کہ موصوف نے اپنے مرثیے کو قدیم مرثیے سے جدا کر کے لکھا اور اس صنف سخن میں مسدّس کی اصطلاح کو ایک نئے معنی و مطلب کا جامہ پہنایا۔ سب سے اہم بات یہ کہ آل رضا نے اپنے مسدّس نما مرثیے میں غزل کی زبان اور تغزل کے لب و لہجے کو نہایت عمدگی کے ساتھ برتا۔ وہ جہاں اس صنف سخن کی روایت کو لے کر آگے بڑھے وہاں اس میں غزل گوئی کی رعنائی اور شعریت کے رمزیہ اور کنائیہ اسلوب کی رنگ آمیزی بھی کی۔ ان کے مرثیے کے درج ذیل چند اشعار کی پیش کش سے یہ بات ظاہر ہوگی کہ انہوں نے جان دار شعریت کے ساتھ مرثیوں کے قالب پیش کیے ہیں:

کتنا پانی ہے جو بے وقت برس جاتا ہے
اور کبھی قافلہ پیاسوں کا ترس جاتا ہے
دل جگمگا دیے ہیں دماغوں کے ساتھ ساتھ
روشن کیا ہوا کو، چراغوں کے ساتھ ساتھ

تسخیر کائنات کی قدرت لیے ہوئے
خالق کی بارگاہ میں سر خم کیے ہوئے
دونوں پہ ایک ساتھ حکومت حسینؑ کی
سجدہ حسین کا ہے، شہادت حسینؑ کی

بچوں کو رو کے، بھائی کو رخصت کیے ہوئے
زینب کھڑی ہیں بار امانت لیے ہوئے
بانوئے دل فگار نے چپکے سے آہ کی
جھولے کو دیکھا، شاہ کی جانب نگاہ کی

Marfat.com

یہ عزم بے پناہ دکھایا حسینؑ نے
آندھی چلی، چراغ جلایا حسینؑ نے
آواز دی ہے فاطمہؑ کے نورِ عین کو
انسانیت پکار رہی ہے حسینؑ کو

اردو ادب میں لکھنؤ کی شاعری دلّی کی شاعری کی حریف سمجھی جاتی ہے۔ یہاں شعر وسخن کا آغاز تو دہلوی شعراء کے ذریعے ہوا، مگر رفتہ رفتہ بعض سیاسی اور معاشرتی حالات کی وجہ سے لکھنؤ کی شاعری دبستان دہلی کے رنگ و آہنگ سے الگ ہوتی چلی گئی۔ کچھ عرصہ بعد اس نے منفرد حیثیت اختیار کرلی اور ایسی کہ مہاجر شعراء بھی ماسوائے چند، لکھنو کے رنگ میں رنگ گئے۔

شروع شروع میں یہاں میر، سودا، میر حسن وغیرہ کے دم سے دبستان دہلی کی خصوصیات کا چرچا رہا، بعد ازاں معاشی و معاشرتی حالات و کوائف کے نتیجے میں دبستان لکھنؤ کی شاعری کا رنگ بدلنا شروع ہوگیا۔ یہ تبدیلی غلام ہمدانی مصحفی، انشاء اللہ خان انشاء، اور قلندر بخش جرأت کے کلام میں پہلی بار نظر آتی ہے۔ اس کے بعد امام بخش ناسخ، خواجہ حیدر علی آتش اور ان کے معاصر شعراء کے کلام میں بالکل منفرد انداز نمایاں ہوجاتا ہے۔ نتیجے کے طور پر لکھنؤ کی شاعری دلی کی شاعری سے الگ تھلگ نظر آنے لگتی ہے۔ گویا دبستان لکھنؤ اپنی جملہ خصوصیات کے ساتھ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوجاتا ہے۔(۴)

اگر ہم سرسری سا جائزہ بھی لیں تو یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ دلّی کی شاعری میں عشق کے موضوعات نفسیاتی، جذباتی، وارداتی اور متصوفانہ تھے، لکھنؤ کی شاعری میں یہ کیفیت نہیں رہی۔ یہاں محبوب کی صفات کے بیان پر زور دیا گیا۔ عاشق و معشوق کے درمیان ہونے والے معاملات پر زیادہ توجہ دی گئی۔ پھر لکھنؤ کی تمام شاعری یا کم از کم اس کا معتدبہ حصہ جمال محبوب کی رنگینیوں کے بیان اور کاروبار دلداری کے حوالے سے وجود میں آنے لگا۔(۵)
خیال آفرینی شعرائے لکھنؤ کی اہم خصوصیات بن گئی اور مبالغے کا استعمال عام ہوگیا۔

دبستانِ لکھنؤ کی یہ بنیادی خصوصیت تو اپنی جگہ تھیں، لیکن بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے بعد لکھنوی شعراء کی مسلسل شعری وفکری کاوشوں کے نتیجے میں خوش آئند تبدیلیاں نظر آنے لگیں۔ روایتی غزل کے لب و لہجے میں نیا رنگ و آہنگ پیدا ہوا۔ نئے شعور و ادراک نے یہاں کی شاعری میں اپنی جگہ بنانی شروع کردی۔

یہی وہ زمانہ تھا جب دبستان لکھنؤ کے اہم رکن مولانا حسرت موہانی اپنے کلام کا جادو جگا رہے تھے۔ وہ زبان لکھنؤ پر مکمل عبور رکھتے تھے کیونکہ ان کا تعلق اودھ سے تھا ان کے

Marfat.com

کلام میں اصلیت کی جلوہ گری تھی۔ لہٰذا ان کی غزلوں نے لکھنوی اسکول کی روایت کو آگے بڑھانے اور اسے جاندار بنانے میں اہم حصہ لیا۔(۶)

اسی عہد میں مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کی غزل گوئی دبستان کو فروزاں کیے ہوئے تھی۔ وہ قادر الکلام اور صاحب طرز شاعر تھے۔ انہوں نے لکھنؤ میں دہلی کی روش کو قائم کیا اور دنیائے تغزل کو نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کیا۔(۷) اپنے کلام کی جدت اور لطف ادا سے لکھنوی سخن سنجی کو زیبائی عطا کی۔

اسی دور میں ریاض خیر آبادی حسن تغزل کو فروغ دے رہے تھے۔ ان کی زبان مستند ہونے کے ساتھ ساتھ پُرلطف بھی تھی۔ ان کے مخصوص اشارے اور کنائے دنیائے شعر وسخن کو متاثر کررہے تھے۔ ان کا جو مقام اس عہد میں تھا اس کا اندازہ نیاز فتح پوری کے اس فقرے سے لگایا جاسکتا ہے کہ" شاید ریاض کے برابر صحیح شعر کسی اور نے نہیں کہے۔"(۸)

مرزا ذاکر حسین ثاقب لکھنوی دبستان لکھنؤ کے وہ قادر الکلام شاعر تھے جنہوں نے میر و غالب جیسے بلند پایہ شعراء کی تقلید کی اور غالب کے تخیل اور میر کی زبان کو اپنا مسلک بنایا۔ ثاقب نے طرز بیان اور صفائی زبان میں میر کا اتباع کرکے اپنے لکھنوی کلام میں جان ہی پیدا نہیں کی بلکہ دلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کو بھی شعری وفکری لحاظ سے قریب لے آئے۔ وہ خالص لکھنوی شاعر تھے، مگر ان کی لکھنویت بھی کچھ ایسی آن بان اور ٹھاٹھ والی تھی جسے نقادان فن کبھی نظر انداز نہ کرسکے۔(۹)

یہی وہ زمانہ تھا، جب فضائے لکھنؤ میں غزل کا یہ شعر ارتعاش پیدا کررہا تھا اور برصغیر کے تمام شعرائے اردو دم بخود ہوکر رہ گئے تھے:

غزل اس نے چھیڑی، مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

اس شعر کے خالق تھے سید علی نقوی صفی لکھنوی جنہوں نے اپنے اثر آفریں کلام سے اردو شاعری کا رخ بدلا اور غزل کے لیے نئی عمارت تعمیر کی۔(۱۰) صفی نے خیال و بیان کی سادگی کے جوہر کو اپنی شاعری کا جزو لاینفک بنا دیا اور اپنے کلام کو روایتی ابتذال و رکاکت سے بالکل محفوظ رکھا۔

اسی دور میں مرزا یاس یگانہ چنگیزی اور اثر لکھنوی جیسے شعراء اپنے دل نشیں کلام سے شبستانِ ادب کو درخشاں کیے ہوئے تھے۔ ان کے انفرادی رنگ اور طرز سخن نے سخن فہموں ہی کو نہیں چونکایا، سخن سنجوں کو بھی نئی سے نئی راہ اپنانے کا جذبہ عطا کیا۔

Marfat.com

یگانہ کی شاعری صحیح معنوں میں اردو غزل گوئی میں ایک اہم اضافہ ہے۔ اس کی بدولت اس صنفِ سخن میں نیا رنگ روپ اور نئی تاب و توانائی نمایاں ہوئی۔ منفرد اسلوب، فکر کی گہرائی، خیالات کی بلندی، طنز کی آمیزش اور تاثرات کی ہمہ گیری کی بدولت ان کا کلام ادب اردو میں ممتاز مقام کا حامل ہوگیا۔(۱۱) یگانہ کی پوری شاعری فضائے لکھنؤ میں ایک ارتعاش پیدا کررہی تھی۔

یگانہ ہی کے ہم عصر اور دبستان لکھنؤ کے ممتاز شاعر میرزا جعفر اثر لکھنوی ایک امتیازی مقام کے حامل ہیں۔ وہ عشق و محبت کی کیفیات کے بڑے رمز شناس اور نکتہ داں تھے۔ انہوں نے اپنی غزل گوئی میں ایک انفرادی طرز اختیار کیا تھا، یعنی معمولی الفاظ کے ذریعے اشاروں میں ایسی تہہ کی باتیں بیان کرجاتے تھے کہ بقول ڈاکٹر سید اعجاز حسین سمجھنے والے سمجھتے ہیں اور بیخود ہوجاتے ہیں۔(۱۲)

روزمرہ اور صفائی زبان کا حد درجے خیال رکھنے کی وجہ سے اثر لکھنوی کے کلام میں دلکشی بڑھ جاتی ہے۔ یہ عزیز لکھنوی کے شاگرد تھے اور ان کے اسلوب و انداز کو نہایت چابک دستی سے اپناتے رہے۔(۱۳)

انہیں شعراء کی صف میں امتیازی مقام کے حامل سید انور حسین آرزو لکھنوی بھی تھے جو اپنے کلام بلاغت نظام سے شبستانِ ادب کو درخشاں کیے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری کی ابتدا تو اپنے استاد اور دبستانِ لکھنؤ کے نامور شاعر جلال لکھنوی کی گرمی و چستی سے کی تھی، لیکن ان خصوصیات میں اپنے مخصوص انداز بیان کی سادگی کا اضافہ کرکے خود شعر و ادب کے بامِ عروج پر پہنچ گئے۔ انہوں نے، بقول پروفیسر آل احمد سرور، غزل کی زبان کو بول چال کی زبان کے قریب لاکر واضح کردیا کہ شاعری کی بولی دنیا والوں کی بولی سے الگ نہیں ہوتی اور نہ وہ قدیم بحروں کی قید میں اسیر ہوتی ہے۔(۱۴) بقول پروفیسر مجتبیٰ حسین ” ان کی شاعری کی دنیا میں الفاظ نے جو عمارتیں تعمیر کی ہیں وہ بڑی پائیدار اور خوبصورت ہیں۔ ہم ان الفاظ کی ایک اینٹ بھی کہیں سے کھسکا نہیں سکتے۔(۱۵)

یہاں اس حقیقت کی وضاحت ضروری ہے کہ آرزو لکھنوی کی شاعری دو مختلف اور متضاد دنیاؤں کے بیچ کھڑی تھیں، ایک دنیا جو زوال پذیر تھی اور دوسری جو فروغ پارہی تھی۔ امیر مینائی اور داغ دہلوی کا دور اختتام پذیر تھا۔ اب اردو شاعری ایک نئی ڈگر پر چل کھڑی ہوئی تھی۔ ایک ایسے معاشرتی نظام میں جس کا شیرازہ منتشر ہوچکا تھا، شعرائے اردو نے زندگی اور ادب کے مابین ربط قائم کرنے کی کوشش شروع کردی تھی۔ ان میں دبستان لکھنؤ کے حسرت

Marfat.com

موہانی، صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی اور ثاقب لکھنوی جیسے باکمال شعراء تو تھے ہی، آرزو لکھنوی بھی اسی قافلۂ سخنوراں کے ایک باکمال فرد تھے۔ ان کے انفرادی رنگ اور مؤثر طرزِ سخن نے سخن فہموں ہی کو نہیں چونکایا، سخن سنجوں کو بھی نئی نئی راہیں دکھائیں۔ وہ بقول پروفیسر مجتبیٰ حسین، نئے شاعروں اور نئے ادیبوں کے لیے ایک رہ نما کی حیثیت رکھتے تھے۔(۱۶) ان سبھوں کو انہوں نے زبان و بیان، فن و موضوع اور طرز و ادا کے ہزاروں نکات سے آگاہ کیا۔

سید آل رضا انہیں آرزو لکھنوی کے شاگرد رشید تھے۔ آرزو کی عرق ریزی اور دیدہ وری نے اردو شاعری کو سید آل رضا کی صورت میں ایسا عظیم شاعر عطا کیا جو دبستانِ لکھنؤ کا آخری نمائندہ سخن قرار دیا جاتا ہے جس نے صنفِ غزل کو رعنائی عطا کی، جس نے رثائی ادب کو اپنے زورِ قلم سے قد آور بنایا، جس نے سلام اس پائے کے لکھے کہ آج بھی سننے والوں کی آنکھیں اشکِ غم سے لب ریز ہوجاتی ہیں۔ اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ سید آل رضا اپنے عہد کی ایک قد آور ادبی شخصیت تھے۔ نیوتنی سے لکھنؤ تک کے سفر میں انہوں نے دبستان لکھنؤ کی ادبی قدریں کچھ اس طرح اپنی رگ و پے میں پیوست کیں کہ وہ ان کی تمام زندگی کا مظہر بن گئیں۔ اس میں ذرا بھی مبالغہ آرائی نہیں کہ دبستان لکھنؤ کی آخری بہار انہیں کے دم سے قائم تھی۔

یہاں سب سے پہلے سید آل رضا کی غزلیات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کی ابتداء غزل گوئی سے کی اور ۱۹۲۳ء سے مشاعروں میں غزلیں پڑھنا شروع کیں۔(۱۷) ایک تو استاد آرزو لکھنوی کی حوصلہ افزائی، دوسرے ان کا اپنا فطری ذوقِ سخن سنجی، پھر سخن شناسوں کی مخلصانہ داد و تحسین اور ہمت افزائی سے ان کا کلیجا ہاتھ بھر کا ہوگیا۔(۱۸) وہ بہت جلد اپنی انفرادی غزل گوئی اور جذبات دروں کے مؤثر اظہار کی بدولت مقبول ہوگئے۔ نہ صرف پرتاب گڑھ کے مشاعروں میں انہیں بے طرح داد و تحسین ملنے لگی، بلکہ دیارِ لکھنؤ میں بھی ان کی شہرت پھیل گئی۔ چنانچہ سید آل رضا خاص شہرِ لکھنؤ کے مشاعرے میں نہایت اہتمام کے ساتھ مدعو کیے جانے لگے۔

اسی زمانے میں ایک مشاعرہ ناصری صاحب کی زیر صدارت لکھنؤ میں ہوا تھا۔ بڑا ازدحام تھا۔ چوٹی کے شعراء وہاں مدعو تھے۔ اس موقع پر سید آل رضا نے جو غزل پیش کی، اس کے مطلع ہی نے سامعین کو بے خود کردیا۔ بڑی فراخ دلی سے انہیں داد ملی، حتیٰ کہ آخر میں صدرِ مشاعرہ نے آل رضا کی غزل کی مقبولیت کے پیش نظر اپنی غزل نہیں پڑھی اور اسے شمع کی لو کی نذر کردیا۔(۱۹) مذکورہ غزل کا مطلع تھا:

Marfat.com

وفا خطا تھی، خطا میں نے زندگی بھر کی
اب اس کے بعد جو مرضی ہو بندہ پرور کی

یہ دور ان کی ابتدائی غزل گوئی کا تھا۔ ابھی فنی پختگی بھی نہیں آئی تھی اور نہ تجرباتی شعور اجاگر ہوا تھا۔ اس کے باوجود مذکورہ بالا مطلع میں عاشق صادق کے سچے اور پرخلوص جذبے کی عکاسی کی جارہی ہے اور جو مرضی ہو بندہ پرور کی، کے برملا اظہار سے روبروئے دوست جس طرح سرِ تسلیم خم کیا جارہا ہے، اس کی مثال مشکل ہی سے مل سکے گی۔

جب غزل گوئی کی ابتدا اس انداز سے ہو تو پھر یہ فیصلہ کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوگا کہ سید آل رضا نے صنفِ غزل میں جو مقام پیدا کیا اور جو شہرت حاصل کی وہ ان کی خداداد صلاحیت ہی کا نتیجہ تھی۔ سید آل رضا نے جہاں دبستان لکھنؤ کے اساتذہ کے بے مثل ورثے کی پاسداری کی وہاں دوسری جانب جدید افکار و نظریات کو بھی لکھنؤ کی شعری فضا میں پروان چڑھایا۔(۴۰) زبان کے لوچ، بیان کی دلکشی اور موضوعات میں خارجیت کے رنگ سے انہوں نے جہاں دبستانِ لکھنؤ میں اپنی منفرد حیثیت تسلیم کروائی وہاں انہوں نے عصری تحریکات اور سماجی تقاضوں کو بھی اپنی شاعری کا اہم عنصر بنادیا۔ ان ہی وجوہ سے ان کی غزلوں میں قدامت کی جھلکی بھی پائی جاتی ہے اور نئے عمرانی شعور کی ترجمانی بھی نظر آتی ہے۔ بقول شبیہ الحسن، جدید شعری رویوں سے کماحقہ آگاہی کی وجہ سے ان کے کلام میں ایک تازگی اور نیا پن محسوس ہوتا ہے۔(۴۱)

سب سے پہلے سید آل رضا کے پہلے مجموعۂ کلام نوائے رضا (۱۹۲۹ء) سے چند منتخب غزلیہ اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے یہ حقیقت پوری طرح آشکار ہوجائے گی کہ بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائیوں کے دوران سید آل رضا کی غزلیں کس لب و لہجے، کس طمطراق اور کس شان کی تھیں۔ ان کی زبان و بیان میں کیسی دلکشی اور گھلاوٹ تھی۔ ان کے کلام میں کس درجے کی ہمواری، روانی اور سلامت تھی۔ انہوں نے کس خوبصورتی سے عاشقانہ جذبات کو سادہ مگر نکھرے ہوئے پیرایہ میں ادا کیا تھا۔ انہوں نے محبت کی کیفیت کو کس فنکارانہ طور پر ایسے الفاظ میں بیان کیا تھا جو نہ صرف مذکورہ کیفیت سے بلکہ آپس میں بھی ہم آہنگ تھے۔ ان کے پیش کردہ موضوعات میں تنوع بھی تھا اور اسلوبِ بیان میں خاص رنگ و آہنگ بھی۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سید آل رضا غزل کو غزل کے نہایت نازک و لطیف حدود میں رکھ کر ہی جذباتِ دل کی مصوری کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا رنگِ سخن کسی فلسفی کے

Marfat.com

خشک انداز اور عامیانہ لہجے کی پستی سے بالکل معرا تھا۔ ان ہی شاعرانہ خصوصیات کی بنا پر علامہ اقبال نے نوائے رضا کے متعلق یہ فرمایا تھا کہ "کاغذی پیرہن اور پیکر تصویر دونوں بڑے دلکش ہیں"(۲۲) اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے بابائے اردو مولوی عبدالحق نے لکھا تھا کہ ان کے کلام میں زور اور کیف ہے۔ وہ اپنے لیے لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں"(۲۳)

اپنے لیے لکھنے اور خوب لکھنے والے لکھنوی دبستانِ سخن کے بے مثل و منفرد غزل گو شاعر کے یہ اشعار بہ بانگ دہل یہ اعلان کر رہے ہیں کہ وہ اس دیارِ سخن کے نمائندہ شاعر کے فنی و فکری شہ پارے ہیں جو کئی دہائیاں گذر جانے کے باوجود اعلیٰ درجے کی شعری کیفیت سے پڑھنے والوں کے دلوں میں ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں:

رضا وہ آچکے، اٹھو خدا کو یاد کرو
کہ وقت آگیا تاروں کے جھلملانے کا
اے رضا پڑھ لو محبت کی نمازِ آخر
عصر کا وقت ہے، خورشید لب بام آیا
کیوں ہنس کے کہہ دیا ترے در کا فقیر ہے
میرا مزاج اور بھی شاہانہ ہوگیا
ایک دیوانے کو دیکھا، پیچھے پیچھے آپ کے
ہنس کے بیٹھا، نقش پا چوما، چلا روتا ہوا
ڈرتا ہوں، یہ بھی ہو نہ کوئی پردۂ ستم
یوں آج مل رہے ہیں کہ جیسے گلہ نہیں
جو سن سکو تو مری داستان ختم نہ ہو
نہ سن سکو تو کوئی حد اختصار نہیں
کچھ میری نظر نے اٹھ کے کہا، کچھ ان کی نظر نے جھک کے کہا
جھگڑا جو نہ برسوں میں چکتا، طے ہوگیا باتوں باتوں میں
وفا خطا تھی، خطا میں نے زندگی بھر کی
اب اس کے آگے جو مرضی ہو بندہ پرور کی

یہ تھا سید آل رضا کے پہلے مجموعۂ کلام نوائے رضا سے انتخاب۔ اب بطور مشتے نمونہ از خروارے غزل معلیٰ کے بھی کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔ واضح رہے کہ یہ مجموعہ ۱۹۵۹ء میں کراچی سے شائع ہوا تھا۔ آل رضا نے ۱۹۲۹ء اور ۱۹۵۹ء کے دوران جو غزلیں کہی تھیں

Marfat.com

انہیں اس مجموعے میں یکجا کردیا گیا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو **غـزل معلیٰ** میں آل رضا غزل گوئی کے ارفع و اعلیٰ مقام پر جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اس صنفِ سخن کو ایسے وقت میں رنگ و آہنگ سے مزین کیا جب اس کے خدوخال کی رعنائی ختم ہوتی جارہی تھی۔ غزل کا خصوصی اسلوب، اس کا بانک پن، اس کا حسن اور اس کی تاثیر مٹتی نظر آرہی تھی۔ ایسے میں **غـزل معلیٰ** نے غزل کو سنبھالا دیا اور اس کے وقار و عظمت کو برقرار رکھنے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ بقول پروفیسر مجتبیٰ حسین ''**غـزل معلیٰ** کی اشاعت ہماری شاعری کے اس دور میں جب اعتبارِ غزل اٹھتا جارہا ہے، ایک اہمیت رکھتی ہے۔''(۲۴)

بیٹھتے تھے گھنی چھاؤں میں اس کی خبر نہ تھی
بڑھ جائے گی دھوپ اور یہ سایہ نہ رہے گا

سید آل رضا نے اپنے مجموعۂ کلام **غزل معلیٰ** میں اس شعر کے لیے پاروتی میں لکھا ہے: ''والد مرحوم کی اچانک وفات کے موقع پر''(۲۵) اور مذکورۂ بالا شعر کے فوراً بعد اسی زمین اور اسی قافیہ و ردیف میں ہمیں ان کا مندرجہ ذیل شعر بھی ملتا ہے:

جب دیکھ کے خوش ہوتے تھے کیا جانتے تھے ہم
رہ جائیں گی آنکھیں، یہ تماشا نہ رہے گا

پاورقی میں اس شعر کے متعلق بھی وہی بات بیان کی گئی جو پہلے شعر کے متعلق ہے۔(۲۶) ذرا غور فرمایئے کہ والد جیسی چھتنار ہستی کی رحلت پر سید آل رضا نے مذکورہ بالا دونوں اشعار میں جو غزل کی صنف سے تعلق رکھتے ہیں، کتنے سوز و گداز کے ساتھ دلی کیفیت کا اظہار کیا ہے۔ یہی ان کا شاعرانہ کمال ہے۔

جیسے پہلے کبھی ملی ہی نہ تھیں
ان نگاہوں نے یوں سلام لیا
یہ لطف، ان کے تغافل میں پھر کہاں ہوتا
جو ایک لطیف تبسم نہ درمیاں ہوتا
رضا نے دل کو سجا کر ترے تصور سے
جہانِ حسن میں اک حسن دو جہاں دیکھا
کچی کلیاں توڑ کے رکھ دیں پانی میں کھل اٹھنے کو
یوں جو تمناؤں سے کھیلے، کھیل کے ہم پچھتائے بہت
انسانوں کا عجائب خانہ ہے تو رضا دلچسپ مقام

Marfat.com

جس سے بولو، جس کو دیکھو، سمجھے کم سمجھائے بہت
رکے تو پاؤں پکڑ لے یہی زمیں نہ کہیں
چلے چلو کہ وہ ٹل جائیں گے کہیں نہ کہیں
زندگی چھوڑ گئی عالمِ مجبوری میں
اپنی بگڑی ہوئی تصویر بنا بیٹھا ہوں
چراغ کتنے نڈر تھے شب جوانی کے
ہوا کے رخ پہ جلے اور رات بھر ٹھہرے

دنیائے غزل میں ایک امتیازی مقام حاصل ہونے کے باوجود سید آل رضا کو اپنی غزلوں پر نہیں بلکہ اپنے سلام اور مرثیے پر ناز تھے۔ وہ اپنے مرثیوں کو توشۂ آخرت کہتے تھے۔(۲۷) اس تاثر کے پس پردہ جو عوامل کارفرما ہیں ان کا جان لینا ضروری ہے۔

سید آل رضا نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی تھی جو مذہبی رجحان کا حامل تھا۔ ان کے والدین صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ وہ ہر سال عشرۂ محرم اپنے گاؤں نیوتنی میں گذارتے تھے۔ عزاداری کے لیے انہوں نے اپنے گھر کو امام باڑے اور اپنی جائیداد کو وقفِ فاطمی میں تبدیل کردیا تھا۔(۲۸) محرم کی مجلسیں نہایت باقاعدگی سے منعقد ہوتی تھیں۔ لکھنؤ سے ذاکر اور مرثیہ گو حضرات نیوتنی بلائے جاتے۔ سید آل رضا نے اپنے بچپنے ہی سے یہ سارا ماحول دیکھا تھا۔ لازماً ان کے دل میں اہلبیت کی محبت راسخ ہوچکی تھی۔ پھر ان کی والدہ مرحومہ کو میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیوں کے بے شمار بند یاد تھے اور وہ وقتاً فوقتاً انہیں پڑھا کرتیں تھیں۔ اس طرح شعوری اور غیر شعوری طور پر مرثیہ نگاری کے اثرات کم سن سید آل رضا کے ذہن و دل پر مرتسم ہوتے چلے گئے۔

یہاں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ قادرِ مطلق ان کو مرثیہ گوئی کا اہم فریضہ تفویض کرنا چاہتا تھا۔ اس پیش منظر کے لیے پس منظر پہلے ہی سے تیار کرلیا گیا تھا۔ گھر کا مذہبی ماحول، ماہ محرم میں مجلسوں کا انعقاد، ذکر حسین عالی مقام کا چرچا، والدہ کا ذاکرہ ہونا، یہ سب زمینی حقائق تھے ہی، اس پر دو جوان بہنوں کی ناگہانی وفات۔ اس پس منظر نے شاعرِ غزل سید آل رضا کی رگ و پے میں مرثیہ گوئی کی صلاحیت پیدا کردی۔

سید آل رضا کی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے ہوا تھا اور مرثیہ گوئی کی طرف وہ بعد میں آئے جس کا ذکر آگے چل کر ہوگا۔ یہاں البتہ اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ موصوف کی ابتدائی غزلوں میں مرثیے کے عناصر پوری طرح جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ گو یہ اشعار غزلیہ ہیں، لیکن معنی و مطلب اور موضوع وفکر کے لحاظ سے جزوی طور پر یہ مرثیے کی حیثیت

Marfat.com

اختیار کر گئے ہیں۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار سید آل رضا کی ابتدائی غزل گوئی کے:

اے رضا پڑھ لو محبت کی نمازِ آخر
عصر کا وقت ہے، خورشید لب بام آیا
شہید ناز تیری بے گناہی کی شہادت ہے
ہمیشہ کو، زمانے بھر کا ماتم دار ہو جانا
عبادت میں رضا رنگِ شہادت بھر دیے ہم نے
شہیدانِ وفا کی خاک پر سجدے کیے ہم نے

واضح رہے کہ مذکورہ بالا اشعار سید آل رضا کے پہلے مجموعۂ کلام نوائے رضا سے اخذ کیے گئے ہیں جو ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۹ء کے اوائل تک کہی جانے کی غزلیں شامل ہیں۔ چھ سات سال پر مشتمل یہی زمانہ ان کی ابتدائی غزل گوئی کا ہے اور اس میں شامل عزائیہ اشعار اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ شاعر آگے چل کر عزاداری کو اپنی شاعری کا محور و مرکز بنانے والا ہے۔

لکھنؤ کے قیام نے بھی سید آل رضا کے ذوقِ مرثیہ گوئی کو مہمیز کیا تھا۔ وہاں انہیں خانوادۂ میر انیس کے چشم و چراغ دولھا صاحب اور مرزا اوج لکھنوی کے فرزند طاہر رفیع کے مرثیے سننے کے مواقع ملے۔(۲۹)

قیام لکھنؤ کے دوران ایک ایسا ادبی واقعہ رونما ہوا جس سے یہ باور کرنا ممکن ہوگیا کہ سید آل رضا میں مرثیہ گوئی کے جوہر پوشیدہ ہیں۔ کسی محفل میں میر تقی میر کی آہ اور مرزا محمد رفیع سودا کی واہ کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ سید آل رضا نے 'آہ' اور 'واہ' کو مندرجہ ذیل شعر میں اس طرح سمو لیا کہ یہ مرثیے کا ایک جان دار جزو بن گیا۔(۳۰)

ظلم پہ ظلم سہے آہ نہ کی، آہ حسینؑ
پھر سے اسلام کو اسلام کیا، واہ حسینؑ

یہی عناصر پس منظر میں کارفرما تھے کہ غزل گو رضا ایک دم سے مرثیہ گو رضا بن گئے۔ اس ضمن میں خود سید آل رضا نے اپنے پہلے مجموعۂ مراثی بہ عنوان شہادت سے پہلے، شہادت کے بعد، میں اپنی مرثیہ گوئی کی ابتدا کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے:

میں یہ عرض کردوں کہ اس مرثیہ نگاری کی ابتدا کیوں کر ہوئی اور میری یہ ہمت کیوں کر پڑی کہ منبر پر جا کر ایک خالص جدید رنگ کا مرثیہ پڑھ دوں۔ ابتدا تو یوں ہوئی کہ فروری ۱۹۳۹ء کے محرم میں چاند رات سے بے فصل کی برسات شروع ہوگئی اور میں نے بے ساختہ کہا کہ:

Marfat.com

کتنا پانی ہے جو بے وقت برس جاتا ہے
اور کبھی قافلہ پیاسوں کا ترس جاتا ہے

اس شعر کی کیفیت میں کچھ اس طرح ڈوبا کہ شعوری اور غیر شعوری طریقوں سے بے مقصد مرثیہ کہنے لگا اور یہ محسوس کرنے لگا کہ کوئی کہہ کہہ کر مجھے بند کے بند دیتا چلا جارہا ہے۔ جن مضامین کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا وہ بالکل پیش پا افتادہ معلوم ہونے لگے۔ اب غزل گو رضا نہ تھا بلکہ مرثیہ گو رضا بن گیا۔(۳۱)

یہاں اس تاریخی حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ فنِ مرثیہ گوئی کے آغاز سے سید آل رضا کے دور تک مرثیے میں ایک ہی روح کارفرما رہی، اس کی ایک جیسی ہیئت تھی اور اس کے یکساں خدوخال تھے، یعنی رونا اور رلانا عزائے امام حسین قائم کرنا۔ بہت آگے بڑھے تو فضائل اہل بیت کی اشاعت اور اس کے بعد کردار شہدائے کربلا کا بیان،(۳۲) لیکن سید آل رضا نے اپنی فکری جودت اور انفرادی رنگِ سخن سے اس صنفِ شاعری میں انقلاب برپا کردیا۔ اپنے جدید طرز کے مرثیے سے انہوں نے مقصد شہادت کو اجاگر کیا، انسانی عظمت کو ہویدا کیا، اسلام کی ارفع و اعلیٰ تعلیمات کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا اور جدید تقاضوں کو بطریق احسن پورا کرنے کی جانب رہنمائی کی۔ انہوں نے جہاں مرثیے کی روایت کو آگے بڑھایا وہاں صنفِ سخن میں نئے نئے موضوعات اور اسالیب بھی پیدا کیے، نئے رجحانات اور میلانات بھی شامل کیے۔ انہوں نے عام ڈگر سے ہٹ کر عزائی شاعری کی طرح ڈالی۔

پروفیسر کرار حسین صاحب نے سید آل رضا کے مرثیوں کا جائزہ لیتے ہوئے نہایت اہم اور وقیع خیال کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:(۳۳)

یہ زمانہ اسباب و علل کا زمانہ ہے، مقصدیت کا زمانہ ہے، علم و تعقل کا زمانہ ہے، منطقیانہ تحلیل کا زمانہ ہے، بحث و تمحیص کا زمانہ ہے، تعبیر و تفسیر کا زمانہ ہے، نظریات کا زمانہ ہے، انقلاب اور حریت کا زمانہ ہے، انسان پرستی کا زمانہ ہے، جہد و ارتقا کا زمانہ ہے، جدل و انتشار کا زمانہ ہے، اور جناب سید آل رضا کے مرثیوں میں زمانۂ حال کے یہ تقاضے بدرجہ اتم پورے ہوتے ہوئے نظر آئیں گے۔

رثائی ادب سے ذاتی اور خاندانی لگاؤ کے پیش نظر ہم بلا تامل یہ کہیں گے کہ سید آل رضا نے واقعۂ کربلا کو صحیح تناظر میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے تاریخی صحت کا مکمل اہتمام کیا ہے۔ دینِ اسلام کو انسانی عظمت کا مظہر بنا کر پیش کرنے کی سعی بلیغ کی۔ سید آل رضا نے مرثیے کے توسط سے ایثار، استقلال، عزم، ثبات، صبر، صداقت اور جاں نثاری کی

Marfat.com

تلقین کی ہے۔ مقصدِ اولیٰ اور ارفع و اعلیٰ نصب العین کی خاطر زندگی کی پروا نہ کرنے اور راہِ صداقت میں جام شہادت نوش کرنے کا سبق دیا۔ بااین ہمہ، عمل کی ترغیب بھی ان کے رثائی ادب میں ملے گی اور اصلاح معاشرہ کا جذبہ بھی کارفرما نظر آئے گا۔ پھر یہ بھی دیکھیے کہ مرثیے کی ہیئت اور زبان پر فنکارانہ قدرت نے ان کی فنی شہپاروں کو چار چاند لگا دیے ہیں اور اس پر مستزاد سید آل رضا کا خلوص ہے، جذبے کی صداقت ہے اور ایمان و ایقان کا سرمایۂ عظیم۔ اللہ اللہ، اتنی ساری صفات جدید دور کے اس مرثیہ نگار میں سما گئی تھیں۔

سید آل رضا نے پہلا مرثیہ ''شہادت سے پہلے'' فروری ۱۹۳۹ء میں کہا تھا۔ یہ مرثیہ، بقول سید ہاشم رضا، موصوف نے ۳ راپریل ۱۹۳۹ء کو لکھنؤ میں ناظم صاحب کے امام باڑے میں پڑھا۔(۳۴) جیسا کہ لکھنؤ میں دستور تھا،اس مجلس میں شہر کے متعدد علماء، ادباء، شعراء اور اصحاب ذوق موجود تھے۔ ان سبھوں نے سید آل رضا کی اس پہلی کاوش کو بنظر استحسان دیکھا۔ اس وقت کے معتبر ناقدین ادب نے اس مرثیے کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ قرار دیتے ہوئے مرثیہ نگاری کی تاریخ میں سید آل رضا کی اس پیش کش کو سنگِ میل کا درجہ دیا۔ لکھنؤ سے نکلنے والے اخبار 'سرفراز' نے اس مرثیے پر 'شعبۂ مرثیہ نگاری میں ایک نئے باب کا اضافہ' کے عنوان سے یہ تبصرہ شائع کیا۔(۳۵)

> سرزمینِ لکھنؤ سے سید آل رضا اٹھے اور انھوں نے ایک مسدّس کہہ کر جدید انداز میں تذکرۂ حسینؑ کا ایک ایسا اچھا نمونہ پیش کیا کہ جسے دیکھ کر صاحبانِ ذوق پر وہ کیفیت طاری ہوئی جو حیرت، مسرت و امتنان کے جذبات کی آمیزش کا ماحصل ہے۔ موصوف نے ایک کمی پوری کردی اور ادبِ اردو اور مذاہب اسلام، بلکہ انسانیت کا کام کردیا۔

سید آل رضا نے دوسرا مرثیہ بہ عنوان ''شہادت کے بعد'' ۱۹۴۳ء میں تخلیق کیا۔ یہ دونوں مرثیے لکھنؤ سے ۱۹۴۴ء میں کتابی صورت میں یکجا شائع ہوئے تو پورے لکھنؤ میں تہلکہ مچ گیا۔(۳۶) ناقدینِ ادب کو اس امر کا احساس ہوا کہ سید آل رضا نے مرثیے کے پرانے قالب میں بعض نئی کڑیاں لگا کر اپنا مرثیہ پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اول الذکر مرثیے کی یہ بیت زباں زدِ عام ہوگئی:

کتنا پانی ہے جو بے وقت برس جاتا ہے
اور کبھی قافلہ پیاسوں کا ترس جاتا ہے

یہاں سید آل رضا کے پہلے مرثیے ''شہادت سے پہلے'' کا ایک بند پیش کیا جاتا ہے:

Marfat.com

منتظر وقت کو تھا ایسے ہی ایثار سے کام
ارتقا دو نظریوں کا ہوا طشت از بام
ایک اسلام سے منسوب حکومت کا نظام
دوسرا موردِ آلام، حقیقی اسلام
ایک سر چڑھ کے یزیدِ اموی میں ابھرا
دوسرا پس کے حسین ابن علی میں ابھرا

یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ مذکورۂ بالا دونوں بندوں میں سید آل رضا کی فکر کا نیا اسلوب اور نیا موضوع نمایاں ہے۔ یہ فی الواقع جدید مرثیہ ہے۔ اس کے ابتدائی مصرع:

کلمۂ حق کی ہے تحریر دلِ فطرت میں

کی اپیل براہ راست دل سے ہے۔ سید آل رضا کے اس اولین مرثیے کا آغاز روایتی نہیں، بلکہ ندرت کا حامل ہے اور اس کا محرک شاعرانہ تخیل اور جذبے کا خلوص ہے۔

سید آل رضا حضرت امام حسینؑ کا ایک ایسا مرقع پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے اور سننے والے کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور اشکِ غم آنکھوں سے جاری ہوجاتے ہیں:

تن صد پاش پہ وہ اپنے بزرگوں کا لباس
کہیں اکبر کا لہو اور کہیں خونِ عباس
خون میں دودھ ملا، تیر کے اک زخم کے پاس
زیبِ آغوش، خزاں دیدہ گلوں کی بُو باس
زخم بازو میں، گلوے علی اصغر کی طرح
گھاؤ سینے میں لیے سینۂ اکبر کی طرح

میدانِ کربلا میں جس طرح گلشنِ رسالت کے خیمے جلائے گئے، جس طرح پانی کی بوند بوند قافلۂ حسینی پر حرام کردی گئی، اس کا منظرنامہ جس دردناک انداز میں سید آل رضا پیش کرتے ہیں، وہ انہیں کا حصہ ہے۔

سید آل رضا نے یوں تو اعلیٰ پائے کے بیس مرثیے تصنیف کیے، لیکن ''عظمتِ انسان'' ان کی رثائی تخلیقات کا شاہکار قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس مرثیے میں زندگی کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لیے غم سے رابطہ رکھنے اور وضعِ آدمیت برقرار رکھنے کے لیے دردمندی کے حصول کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ (۳۷)

سید آل رضا نے ۱۵۶ بندوں پر مشتمل اس مرثیے میں اپنے تاریخی شعور کا بھرپور

Marfat.com

مظاہرہ کیا ہے اور فکری عنصر اور نفسیاتی تأثر کو ابھارنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس طویل مرثیے میں اسلام کی سماجی اور روحانی تشریح کی گئی ہے، واقعۂ کربلا کو درسِ حیات اور تابندگی کردار کا نمونہ قرار دیا ہے اور اسلام اور حضرت امام حسینؑ کے باہمی تعلق کو اجاگر کیا گیا ہے۔ گویا سید آلِ رضا نے اپنے مرثیے ''عظمت انساں'' کے ذریعے اس صنفِ سخن کو آفاقی رنگ عطا کرنے کی مستحسن کوشش کی ہے۔ بقول پروفیسر ڈاکٹر محمد رضا کاظمی: آل رضا بیسویں صدی کے فکری دھاروں سے الگ نہیں رہے اور انہوں نے اس مرثیے میں جدید حوالوں کے ساتھ ساتھ اپنا انفرادی نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔(۳۸)

سید آل رضا کو اپنے مرثیوں اور سلاموں پر بڑا ناز تھا اور وہ ان تخلیقات کو اپنے لیے توشۂ آخرت تصور کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری دور میں غزل گوئی ترک کردی تھی اور صرف رُباعیاں، سلام اور مرثیے کہتے تھے۔(۳۹) سید آل رضا نے مجموعی طور پر ۸۰ رُباعیاں، ۴۵ سلام اور بیس مرثیے کہے۔ اس نوع کی تمام تخلیقات سے سید آلِ رضا کی اہل بیت اور شہدائے کربلا سے بے پناہ عقیدت کا پتا چلتا ہے۔ رُباعی ایک مشکل صنفِ سخن ہے اور بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری، پختہ مشق شاعروں نے ساٹھ برس کی عمر کے بعد اس صنف میں طبع آزمائی کا مشورہ دیا ہے(۴۰) لیکن سید آلِ رضا نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور ہی میں رُباعیاں کہنی شروع کردی تھیں اور یہ سلسلہ تادمِ حیات جاری رہا۔ یہ تمام رباعیاں سرکار ختمی مرتبتؐ اور آلِ محمدؐ کی مدح میں ہیں۔ انہوں نے اس صنف کی فنی ہیئت کو برقرار رکھتے ہوئے نہایت مؤثر انداز میں اپنے موضوعات کو پیش کیا ہے۔ یہاں بھی انہوں نے اپنا انفرادی رنگ برقرار رکھا ہے اور جو مضمون بھی پیش کیا ہے، اس میں ندرت بھی ہے اور محبتِ اہل بیت بھی۔

جہاں تک سلام لکھنے کا تعلق ہے۔ سید آلِ رضا اس صنفِ سخن میں بھی منفرد ممتاز نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ اہل علم و ادب جانتے ہیں، حضرت امام حسینؑ اور میدان کربلا میں آپ کے ساتھ جامِ شہادت نوش کرنے والے رفقاء کی شان میں جو شعری نذرانہ پیش کیا جاتا ہے، اسے سلام سے موسوم کیا جاتا ہے۔(۴۱) یہ ایک حقیقت ہے کہ سید آلِ رضا مرثیے اور رُباعی کے ساتھ ساتھ سلام بھی تسلسل سے لکھتے رہے۔ عزائی شاعری میں ان کی افادیت مسلم ہے۔ اس صنفِ سخن میں بھی سید آلِ رضا کی قادر الکلامی جھلکتی ہے۔ یہاں بھی ان کا انفرادی رنگ نمایاں ہے۔ بقول ڈاکٹر سید شبیہ الحسن، آل رضا کے یہ سلام عزائی شاعری کے حوالے سے نہایت گراں قدر ہیں۔(۴۲) پاکستان میں دسویں محرم کو 'شام غریباں' کے بعد مدتوں یہ سلام ناصر جہاں مرحوم کی آواز میں ٹیلی ویژن اور ریڈیو سے نشر ہوتا رہا اور اب ان کے صاحبزادے

Marfat.com

اسد جہاں سید آل رضا کا یہ سلام نہایت سوز و گداز کے ساتھ سید الشہداء امام عالی مقام کے حضور نذرانہ عقیدت کے طور پر پیش کررہے ہیں:

سلام خاک نشینوں کو سوگواروں کا
غریب دیتے ہیں پُرسہ تمہارے پیاروں کا
سلام اس پہ جو زحمت کشِ سلاسل ہے
مصیبتوں میں امامت کی پہلی منزل ہے
مسافرت نے جسے بے بسی یہ دکھلائی
نثار کردیے بچے، نہ بچ سکا بھائی
سکینہ بی بی، تمہارے غلام حاضر ہیں
بجھے جو پیاس تو آنکھوں کے جام حاضر ہیں
یہ سن، یہ حشر، یہ صدمے نئے نئے بی بی
کہاں یہ بیٹھی ہو، خیمے تو جل گئے بی بی
پہاڑ رات، بڑی دیر ہے سویرے میں
کہاں ہو شامِ غریباں کے گھپ اندھیرے میں
زمین گرم، یتیمی کی سختیاں بی بی
وہ سینہ جس پہ تھیں سوتی، وہ اب کہاں بی بی
جناب مادرِ بے شیر کو بھی سب کا سلام
عجیب وقت ہے کیا دیں تسلیوں کا پیام
شریکِ حق درود و سلامِ پیغمبر
سلام سید لولاک کے لٹے گھر پر(۴۳)

حوالہ جات

۱۔ یوسف جمال انصاری، جدت اور روایت کا سنگم، مشمولہ، عظمت انسان، مکتبہ تعمیر ادب، لاہور، ۱۹۲۰ء
۲۔ سحر انصاری، مقالات جوش، اردو محل پبلیشرز کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۳۶۸
۳۔ وحید الحسن ہاشمی (مرتب)، سید آل رضا، عظمتِ انساں، محولہ بالا، ص ۴
۴۔ جمیل انجم، اردو ادب، علمی کتب خانہ، لاہور، س ن، ص ۲۸۲

Marfat.com

۵۔مولانا عبدالسلام ندوی، شعر الھند، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۴۲ء، ص ۲۰۴
۶۔جدید شعرائے اردو، (دوسرا حصہ)، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۳۵۔۴۳۴
۷۔محمد جمیل احمد، اردو شاعری پر ایک نظر، غضنفر اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۲۸۲
۸۔جدید شعرائے اردو، (دوسرا حصہ)، محولہ بالا، ص ۲۲۴
۹۔جدید شعرائے اردو، محولہ بالا، ص ۲۷۷
۱۰۔جدید شعرائے اردو، محولہ بالا، ص ۲۵۷
۱۱۔ڈاکٹر محمود الرحمٰن، یگانہ چنگیزی۔ایک مطالعہ، دوست پبلیکیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۷ء، ص ۱۴
۱۲۔ڈاکٹر سید اعجاز حسین، مختصر تاریخ ادب اردو، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۶ء، ص ۲۰۹
۱۳۔ڈاکٹر محمود الرحمٰن، سبدِ گل، دوست پبلیکیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص ۳۱۳
۱۴۔آل احمد سرور، نئے اور پرانے چراغ، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۱ء، ص ۱۹۸
۱۵۔پروفیسر مجتبیٰ حسین، تہذیب و تحریر، مکتبۂ افکار، کراچی، ۱۹۵۹ء، ص ۲۵۰
۱۶۔تہذیب و تحریر، محولہ بالا، ص ۲۵۲
۱۷۔سید ہاشم رضا، مردِ مومن سید آل رضا، مشمولہ مجلّہ بہ یاد شاعرِ اہل بیت سید آل رضا، مرتبہ ضمیر اختر نقوی، ابن حسن پریس، کراچی ۱۹۷۸ء، ص ۴۴
۱۸۔نعمان تاثیر، مظہر صدیقی (مرتبین)، شعرستان، تذکرہ شعرائے پاکستان، کراچی، ۱۹۵۰ء، ص ۱۵۸
۱۹۔''سید آل رضا کی غزل گوئی کے محرکات و مآخذ'' مشمولہ آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی، مرتبہ شبیہ الحسن، لاہور، ۱۹۸۹ء، دیباچہ ص ۲۵
۲۰۔ڈاکٹر سید شبیہ الحسن، باقیاتِ آلِ رضا، الحسن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۵۰
۲۱۔''آل رضا کا فنِ غزل گوئی''، محولہ بالا، ص ۱۰۱
۲۲۔سید آل رضا، غزل معلیٰ، مکتبۂ افکار، کراچی، ۱۹۵۹ء، ص ۱۶
۲۳۔مولوی عبدالحق، ''نوائے رضا'' پر تبصرہ، مشمولہ سہ ماہی اردو، حیدر آباد (دکن)، جنوری ۱۹۳۰ء، ص ۱۷۱
۲۴۔پروفیسر مجتبیٰ حسین، ادب و آگہی، مکتبۂ افکار، کراچی، س ن، ص ۳۲۵
۲۵۔سید آلِ رضا، غزل معلیٰ، محولہ بالا، ص ۵۸
۲۶۔ایضاً، ص ۵۸
۲۷۔مردِ مومن سید آل رضا، محولۂ بالا، ص ۴۹
۲۸۔ہاشم رضا، ''جائزہ''، مشمولہ آل رضا کا فن غزل گوئی، محولۂ بالا ص ۲۱
۲۹۔سید ہاشم رضا، ''تمہیدی جملے''، مشمولہ مراثی رضا، مرتبہ کرار حسین، خراسان اسلامک ریسرچ سنٹر، کراچی، ۱۹۸۱ء، ص ق
۳۰۔''تمہیدی جملے'' محولۂ بالا، ص ق
۳۱۔سید آلِ رضا، شہادت سے پہلے، شہادت کے بعد، سرفراز پریس، لکھنؤ، ۱۹۴۴ء، ص ۳
۳۲۔سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، مرثیے کا ارتقاء، مشمولہ عظمتِ انساں، محولہ بالا، ص ۵۴
۳۳۔پروفیسر کرار حسین، ''پیش لفظ'' مراثی رضا، خراسان اسلامک ریسرچ سنٹر، کراچی، ۱۹۸۱ء

Marfat.com

۳۴۔''تمہیدی جملے''، ص ص

۳۵۔سرفراز، لکھنؤ، ۱۶ اپریل ۱۹۳۹ء، مشمولۂ مراثی رضا، محولۂ بالا، ص ر

۳۶۔ڈاکٹر سید شبیہ الحسن، باقیاتِ آلِ رضا، الحسن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۵۱

۳۷۔ڈاکٹر اسد اریب، اردو مرثیے کی سرگذشت، کاروانِ ادب، ملتان، ۱۹۸۹ء، ص ۹۵۔۹۴

۳۸۔ڈاکٹر محمد رضا کاظمی، جدید اردو مرثیہ، مکتبۂ ادب کراچی، ۱۹۹۱ء، ص ۲۰۴

۳۹۔''تمہیدی جملے''، محولۂ بالا، ص ش

۴۰۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری، اردو رُباعی، مکتبۂ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۲۲

۴۱۔''تمہیدی جملے''، محولۂ بالا، ص ش

۴۲۔وحید الحسن ہاشمی، تشنہ لب ہے حسینؑ، الحسن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۲۲

۴۳۔باقیات آل رضا، ص ۷۲

☆☆☆

Marfat.com

افتخار عارف کا مدینے سے کربلا تک کا شعری سفر

علی کمیل قزلباش☆

افتخار عارف کی شاعری پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے بلکہ اب تو ان پر ڈاکٹریٹ بھی کیا جانے لگا ہے، لیکن میری نظر میں ان کی شاعری کا نیا پہلو یا ان کا مابہ الامتیاز ان کے کلام کا حضرت اقبالؒ کی فکر کا پرتو ہونا ہے۔ ان کی شاعری در اصل اسلامی ثقافت، تاریخ، روایات، اقدار اور پیغام پر مبنی ہے، جبکہ اس مشکل موضوع کو نبھاتے ہوئے وہ کسی پروپیگنڈا یا تبلیغی رنگ کا شکار نہیں ہوئے بلکہ احساسات سے احساسات تک بات پہنچائی گئی ہے۔

افتخار عارف اپنے ہم عصر شعراء میں منفرد اس لئے ہیں کہ ان کا انداز بیان، موضوع، لب و لہجہ اور نظریۂ فن سب سے الگ ہے۔ آج کل یہ سوال بھی زیادہ اٹھایا جا رہا ہے کہ بڑا شاعر کیوں پیدا نہیں ہو رہا۔ مجھے اس سے قطعی اختلاف ہے کیونکہ ہر دور میں ایک آدھ ہی بڑا شاعر پیدا ہوتا ہے اور وہ بڑا اس لیے ہوتا ہے کہ بڑی بات کہہ جاتا ہے، نئی راہ نکال کر بات کو نئے رنگ میں پیش کرتا ہے، شیرینی بیان اور قاری کو مسحور کرنے کا سلیقہ جانتا ہے۔ یہ تمام خوبیاں افتخار عارف کی شاعری میں موجود ہیں۔

انہوں نے اسلام کی روح کو سمجھتے ہوئے اپنے فن کو حرف حق اور کلمۂ خیر کے لیے وقف کیا اور زندگی کے اس پہلو کو اپنایا جس کا ہر لمحہ بندگی سے عبارت ہے۔ اس کے مقابلے میں آپ نے دنیا کو جو حضرت علیؑ کی نظر میں بکری کی چھینک جیسی حقیر ہے، نظرانداز کر دیا۔

جس احساس سے افتخار عارف کی شاعری الہام پاتی ہے اس کی بلندیوں کو مادی فکر کے اسیر کب چھو سکتے ہیں؟ قرآن پاک میں جن شعراء کو با ایمان ہونے کے سبب محترم قرار دیا گیا ہے افتخار عارف کی شاعری ان کو قبیلے کے انہی افراد میں کھڑا کرتی ہے۔

ان کی شاعری کا سفر مدینے سے شروع ہو کر کربلا تک پہنچتا ہے جبکہ اسلام کے عروج اور عظمت کا معنوی سفر بھی انہی دونوں مقامات سے متعلق ہے۔ ان کی شاعری کے کردار رسولؐ خدا، حضرت علیؑ جیسی ہستیاں ہیں اور پھر ان کے وہ اصحاب بھی جن کی قربانیوں اور وفا

☆استاد فارسی، دانشگاہ بلوچستان، کوئٹہ

Marfat.com

داریوں ہی کے طفیل اسلام کا اصلی چہرہ آج تک محفوظ ہے، بلکہ بات آگے بڑھتے ہوئے کربلا کے عظیم شہیدوں اور اسیروں تک پہنچ کر اسلام کی اصل روح کو پاجاتی ہے۔

افتخار عارف کو اپنے انتخاب کردہ راستے کا شعوری احساس ہے اور انہوں نے مروّجہ طرزِ فکر سے اختلاف کرتے ہوئے اس پر طنز بھی کیا ہے کہ،

وہی فراق کی باتیں وہی حکایتِ وصل
نئی کتاب کا اک اک ورق پرانا ہے

آج کل کچھ شعراء معیار کے بجائے مجموعوں کی تعداد بڑھانے پر زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔ افتخار عارف اس پہلو کو بھی نظر میں رکھے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں:

جیسے سب لکھتے رہتے ہیں نظمیں، غزلیں ، گیت
ویسے لکھ لکھ کر انبار لگا سکتا ہوں میں

جبکہ اپنی منزل کا تعین یوں کرتے ہیں:

نتیجہ کربلا سے مختلف ہو یا وہی ہو
مدینہ چھوڑنے کا فیصلہ کرنا پڑے گا

یہ ان تاریخ ساز لمحات کی جانب اشارہ ہے جب اسلام کے لیے قربانی کا عمل عروج کو پہنچ رہا تھا۔ آپ ہجرت کے مفہوم اور عظمت کو واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ایک تاریخ ساز عمل ہے نہ کہ روزمرہ کی بات:

ہر نئی نسل کو اک تازہ مدینے کی تلاش
صاحبو! اب کوئی ہجرت نہیں ہوگی ہم سے

اور

شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگِ زمانہ ہیں، ہم کیا ہماری ہجرت کیا

اسی طرح سرورِ کائناتؐ کی عظمت و محبت کو موضوع بناتے ہوئے ان کی شاعری اپنی منزل کی طرف سفر کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ رسولِ خداؐ کا دور، آپؐ کی عظمتیں ، معجزات اور آپؐ کے مخلص احباب کا کردار بھی افتخار عارف کی شاعری کا ایک توانا پہلو ہے۔ وہ دینِ اسلام کے کلیدی نکات، خود داری اور خداداری پر پوری طرح یقین رکھتے ہوئے کہتے ہیں ؛

ترا رزق ہی سبب مرض ہے تو اب کے بار
ذرا جم کے رد بال و درہم و دانہ کر

Marfat.com

یہاں اقبال کا شعر بھی ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے کہ:

اے طائر لاہوتی، اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی!

آپ کے استغنا کا یہ پہلو بھی ملاحظہ ہو:

چھلک رہا ہے جو کشکولِ آرزو اس میں
کسی فقیر کے قدموں کی خاک ڈال کے رکھ

آب و خرما اور نان و نمک اسلام کی عظیم ہستیوں کے اسوہ کے اہم پہلو ہیں۔ حضرت علیؑ جو کی خشک روٹی کو پانی میں بھگو کر تناول فرماتے اور اہل بیتؑ ، رسولؐ خدا کی رحلت کے بعد آب و خرما پر زندگی بسر کرتے تھے۔ افتخار عارف قناعت کی اس بلندی کو محسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں:

مالک! یہ آب و خرما و نان و نمک نہ دے
تیری رضا نہ ہو تو مجھے خاک تک نہ دے

ادھر معجزوں کے طالب، بے یقین بندوں پر بھی دھیمے لہجے کا یہ شاعر غضبناک ہوتا ہے، کیونکہ ایسے بے یقین معجزہ طلب آج بھی موجود ہیں:

کوئی تو شہرِ تذبذب کے ساکنوں سے کہے
نہ ہو یقین تو پھر معجزہ نہ مانگے کوئی

دعا، خدا اور بندوں کے درمیان قریبی اور براہ راست رابطے کا ایک ایسا موثر ذریعہ ہے جس کی عظمت و حقیقت کو صرف ایمان کامل رکھنے والے انسان ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ آئمہ طاہرین نے دعا کا سلیقہ سکھاتے ہوئے ہمارے لیے دعاؤں کا ایک خزینہ بھی چھوڑا ہے۔ افتخار عارف کی نظر میں بھی دعا مفتاح الفتوح ہے:

کوئی تو پھول کھلائے دعا کے لہجے میں
عجب طرح کی گھٹن ہے ہوا کے لہجے میں

جبکہ اس عظیم رابطے پر قدغن کا کنایہ بھی قابل تعریف ہے:

بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں
سو اب یہ رسم چلی ہے دعا نہ مانگے کوئی

صرف یہی نہیں بلکہ انہیں دعا کی قبولیت کا راز بھی معلوم ہے۔ وہ دعا مانگتے ہیں تو رسولؐ خدا کی حدیث کے حوالے سے کہ ''میں شہر علم ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے۔''

Marfat.com

مرا شرف کہ تو مجھے جوازِ افتخار دے
فقیرِ شہرِ علم ہوں زکوٰۃِ اعتبار دے

اور پھر اس عظیم ہستی کے ساتھ نسبت پر فخر کرتے ہوئے اپنے آپ پر ہی پابندیاں عائد کرتے ہیں کیونکہ یہی شرط ادب ہے:

ذرّہ ہوں منسوب ہوا ہوں مہر کے ساتھ
روشن رہنا مجھ پر واجب آتا ہے

اور یہ شعر بھی امتیوں کے کردار کی تاریخ پر کاری ضرب ہے:

رحمتِ سیدِ لولاکؐ پہ کامل ایمان
امتِ سیدِ لولاکؐ سے خوف آتا ہے

لیکن دربار و اہلِ دربار سے بغاوت کا اعلان بھی برملا کرجاتے ہیں:

روز اک تازہ قصیدہ نئی تشبیب کے ساتھ
رزق برحق ہے یہ خدمت نہیں ہوگی ہم سے

جبکہ عبادت کی عظمت اور بلندی کا اظہار یوں کرتے ہیں:

دل کے معبود جبینوں کے خداؤں سے الگ
ایسے عالم میں عبادت نہیں ہوگی ہم سے

لیکن وہ کسی ایسے ویسے زعم میں بھی مبتلا نظر نہیں آتے بلکہ عجز کو شیوہ بنا کر اسے ورثہ گردانتے ہیں اور مسلکِ حق کے لیے ہر مشکل سے عہدہ برآ ہونے کو پیشروؤں کی روایت جانتے ہوئے فخریہ کہتے ہیں:

پیمبروں سے زمینیں وفا نہیں کرتیں
ہم ایسے کون خدا تھے کہ اپنے گھر رہتے

افتخار عارف ان اصحابِ رسول سے بھی بے خبر نہیں ہیں جن کا اسلام پر احسان رہا ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کا کردار اسلام میں جس قدر نمایاں اور توانا ہے اس کی مثال ملنا ممکن نہیں۔ آپ وہ ہستی ہیں جن کے لیے سند میں رسول خداؐ کے احادیث سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں، جیسے ''آسمان نے سایہ نہیں کیا اور گہری زمین نے گود میں نہیں لیا ابوذر سے زیادہ کسی سچے کو'' اور یہ کہ ''ابوذرؓ کی حیا اور پارسائی عیسیٰ ابن مریم کی طرح ہے'' نیز یہ بھی فرمایا کہ ''ابوذر آسمانوں میں زمین سے زیادہ محبوب ہے'' یا یہ کہ ''ابوذر تنہا جیے گا، تنہا مرے گا اور تنہا اٹھایا جائے گا۔''

Marfat.com

ابوذر غفاری کیلئے ایک نظم

سلام انؑ پر، درود انؑ پر
وہؑ کہہ رہے تھے
زمیں نے بوجھ ایسے آدمی کا نہیں اٹھایا جو تم سے سچا ہو، اے ابوذرؓ
وہؑ کہہ رہے تھے
فلک نے سایہ نہیں کیا ایسے آدمی پر جو تم سے سچا ہو، اے ابوذرؓ
سبھی یسار و یمین تصدیق کر رہے تھے
تمام اہل یقین تصدیق کر رہے تھے
سلام انؑ پر، درود انؑ پر
مگر زمانے نے یہ بھی دیکھا
وہی مدینہ ہے اور ابوذرؓ ہیں اور منبر ہے اور منبر کا فیصلہ ہے
اور اب جو منبر کا فیصلہ ہے وہ قول صادقؐ سے مختلف ہے
جو قول صادقؐ سے مختلف ہے وہ فیصلہ میرے اور منبر کے درمیان
اک سوال بن کر ٹھہر گیا ہے
بہت زمانہ گزر گیا ہے مگر ابوذرؓ نگاہ میں ہیں
پسِ کمیں گاہ جبر زور آوروں کی سازش کے سارے منظر
نگاہ میں ہیں
دمشق و بغداد و قرطبہ کے سلاسل مصلحت کی بخشش
پہ پلنے والے تمام منبر نگاہ میں ہیں
جہاں مظلوم خواب دیگر کا منتظر ہے
نیا زمانہ نئے ابوذرؓ کا منتظر ہے
لیکن یہی ابوذرؓ ہیں جنہیں شہر بدر کر دیا جاتا ہے اور ربذہ کے صحرا میں بیٹی، بیٹا

اور اس کے بعد خود بھوک و پیاس کی شدت سے دم توڑ دیتے ہیں۔ افتخار عارف کی نظم ''ابوذر غفاریؓ کیلئے ایک نظم'' میں یہ تمام تاریخ موجود ہے۔ ایک طرف رسول کا منبر اور پھر اسی منبر پر بیٹھ کر رسول خداؐ کے حدیثوں کی نفی کا سوال، یہ نظم نہ صرف اسی حد تک ہے بلکہ آج بھی شاعر ابوذرؓ کے طلب کی بات کرتا ہے۔ شاید وہ زر پرستوں کے ایمان اور حقیقت کو پرکھنے کے لیے ابوذر ہی کی شخصیت کی جرأت اور زبان کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے۔

Marfat.com

اسی طرح کی نظم حضرت اسامہؓ کے بارے میں بھی ہے اور یہ نظم بھی موجودہ دور کی عکاس ہے۔

اک طرف سارے نجیب ابن نجیب ابن نجیب
اک طرف ایک غلام بن غلام ابن غلام

جبکہ نظم ''ابو طالب کے بیٹے'' بھی ملاحظہ ہو:

جبین وقت پر لکھی ہوئی سچائیاں روشن رہی ہیں
تا ابد روشن رہیں گی
خدا شاہد ہے اور وہ ذات شاہد ہے کہ جو وجہ اساس انفس و آفاق ہے
اور خیر کی تاریخ کا وہ باب اول ہے
ابد تک جس کا فیضان کرم جاری رہے گا
یقیں کے، آگہی کے، روشنی کے قافلے ہر دور میں آتے رہے ہیں
تا ابد آتے رہیں گے
ابوطالب کے بیٹے حفظ ناموس رسالت کی روایت کے امیں تھے
جان دینا جانتے تھے
وہ مسلمؑ ہوں کہ وہ عباسؑ ہوں، عونؑ ومحمدؑ، علی اکبرؑ ہوں، قاسم ہوں، علی اصغرؑ ہوں
حق پہچانتے تھے
لشکر باطل کو کب گردانتے تھے
ابوطالبؑ کے بیٹے سر بریدہ ہو کے بھی اعلان حق کرتے رہیں گے
ابو طالبؑ کے بیٹے پابجولاں ہو کے بھی اعلان حق کرتے رہیں گے
ابو طالبؑ کے بیٹے صرف زنداں ہو کے بھی اعلان حق کرتے رہیں گے
مدینہ ہو، نجف ہو، کربلا ہو، کاظمین و سامرہ ہو، مشہد و بغداد ہو
آل ابوطالبؑ کے قدموں کے نشاں
انسانیت کو اس کی منزل کا پتہ دیتے رہے ہیں، تا ابد دیتے رہیں گے
ابو طالبؑ کے بیٹوں اور غلامان علیؑ ابن ابی طالبؑ میں اک نسبت رہی ہے
محبت کی یہ نسبت عمر بھر قائم رہے گی
تا ابد قائم رہے گی

اس نظم میں افتخار عارف نے حضرت علیؑ سے حضرت امام حسینؑ اور دیگر آئمہ طاہرین کے تمام اعزازات کا منبع حضرت ابو طالبؑ کو قرار دیا ہے۔ ان کو یہ معلوم ہے

Marfat.com

کہ بارہ سال تک رسول خداؐ کی پرورش اپنی شفقت و محبت کے سائے میں کرنے والی اس عظیم شخصیت کی، جس نے علیؑ جیسا وصی بھی انہیں دیا، مسلمانی پر کیسے شک کیا جا سکتا ہے، بلکہ وہ تو محسن اسلام بھی ہیں۔ اسی طرح حضرت علیؑ بھی ایک ایسی ہی ہستی ہیں جن کے بغیر نہ تو تاریخ مکمل ہے اور نہ خود اسلام، بلکہ رسول خداؐ کی نبوت کی کامیابی میں بھی ان کا بھرپور حصہ ہے۔ افتخار عارف کی شاعری میں آپؑ کا ذکر کثرت سے ملتا ہے، بلکہ ان کی دونوں کتابوں کے آغاز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد دوسرا جملہ حضرت علیؑ ہی کے قول پر مشتمل ہے **مہر دو نیم** میں ''کلام کرو تا کہ پہچانے جاؤ!'' اور **حرف باریاب** میں '' انسان اپنی زبان کے نیچے چھپا ہوا ہے۔''

افتخار عارف نے حضرت علیؑ کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کو موضوع بنایا ہے اور ان سے نسبت کے اظہار پر فخر بھی کیا ہے۔ نظم ''شہر علم کے دروازے پر'' میں بھی اسی طرح کا اظہار ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

کبھی کبھی دل یہ سوچتا ہے
نجانے ہم بے یقین لوگوں کو نام حیدرؑ سے ربط کیوں ہے
حکیم جانے وہ کیسی حکمت سے آشنا تھا
شجیع جانے کہ بدر و خیبر کی فتح مندی کا راز کیا تھا
علیم جانے وہ علم کے کون سے سفینوں کا ناخدا تھا

جبکہ آپ اس شعر میں حضرت علیؑ ہی سے اپنی حسینی نسبت کی تصدیق کا اظہار یوں کرتے ہیں:

حضور شافع محشر علیؑ کہیں کہ یہ شخص
گنہگار بہت ہے، مگر حسینؑ کا ہے

اسی طرح نظم ''فتکلموا تعرفوا'' میں بھی حضرت علیؑ کی عظمتوں کے ذکر کے ساتھ ان سے اپنی نسبت کا اظہار کرتے ہیں۔ حضرت علیؑ کی زندگی کا ہر ہر لمحہ بندگی و تسلیم و رضا سے عبارت تھا، چاہے حالت نماز میں ہوتے یا میدان کارزار میں، حکم پروردگار ہی کی تعمیل فرماتے:

حکم ہوتا ہے تو سجدے میں جھکا دیتے ہیں سر
اذن ملتا ہے تو شمشیر و دم کھینچتے ہیں

حضرت علیؑ کو اسلام سے حقیقی محبت اور عدالت پسندی کی راہ میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان واقعات سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ آپ کے دور خلافت میں ملوکیت کے علمبرداروں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ شعر ملاحظہ ہو:

Marfat.com

دمشقِ مصلحت و کوفۂ نفاق کے بیچ
فغانِ قافلہ بے نوا کی قیمت کیا ؟

افتخار عارف کی شاعری کا سب سے توانا حصہ کربلا ہے۔ کربلا کے استعارے کو انہوں نے بہت ہی نئے اور مختلف زاویوں سے بیان کیا ہے اور اس کی عظمت کی تصدیق کے ساتھ آج کا فیصلہ بھی اسی روشنی میں کیا ہے :

خلق نے اک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
نوکِ سناں پر سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

☆☆☆

خیمۂ عافیت کی طنابوں سے جکڑی ہوئی خلقتِ شہر
جاننا چاہتی ہے کہ منزل سے کیوں راستہ مختلف ہے

کربلا کے استعاروں کو افتخار عارف نے جس طرح برتا ہے وہ بڑے بارآور ثابت ہوئے ہیں۔ آپ نے مرثیہ کے علاوہ غزل کے دامن میں بھی ان ستاروں کو ٹانکا ہے:

نظر میں رکھتے ہیں عصرِ بلند بامِ مہر
فراتِ جبر کے ہر تشنہ لب سے واقف ہیں

☆☆☆

کبھی چھپے ہوئے خنجر، کبھی کھنچی ہوئی تیغ
ہم اہلِ ظلم کے اک ایک ڈھب سے واقف ہیں

وہ کربلا کے استعاروں کو جاودانی جانتے ہوئے ہر دور کے لیے موزوں قرار دیتے ہیں، لیکن نئے انداز میں:

وہی پیاس ہے ، وہی دشت ہے، وہی گھرانا ہے
مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے

بیعتِ باطل کو رد کرنے کی حسینی روایت کا اظہار کس جانداری سے کرتے ہیں، اور خصوصاً ''اب بھی'' کا استعمال قابلِ توجہ ہے:

اب بھی توہینِ اطاعت نہیں ہوگی ہم سے
دل نہیں ہوگا تو بیعت نہیں ہوگی ہم سے

اس کے مقابلے میں اس شعر کی خود سپردگی بھی قابلِ توجہ ہے:

اندھیری رات میں گریۂ بے سبب کی توفیق
میسر ہو تو غم کی دولت سنبھال رکھنا

Marfat.com

جبکہ یہاں وہی جذبہ ایک اور رخ اختیار کرتا ہے:

ویرانۂ مقتل پہ حجاب آیا تو اس بار
خود چیخ پڑا میں کہ یہ عنوان بھی میرا ہے

وہ حسینیت کو دلیل حق گردانتے ہیں اور اس سے وابستگی کو شفاعت جانتے ہوئے کیا خوب فرماتے ہیں:

وہ خاکِ پاک ہم اہلِ محبت کو ہے اکسیر
سرِ مقتل جہاں نیزوں پہ سر تولے گئے تھے

اور ظلم کے خلاف احتجاج، بلکہ جذبہ جہاد، جس سے اسلام کی روح زندہ ہے، کی جھلک اس شعر میں ملاحظہ ہو:

سینۂ ظلم میں ہوتا ہے ترازو اک تیر
کاش ایسا ہو کہ اس بار کماں میری ہو

حضرت امام حسینؑ کے فکرِ رسا کی ایک مثال کربلا میں شب کو چراغ بجھا کر اصحاب کو جانے کے لیے کہنے کی بھی ہے۔ اس شعر میں یہ اظہار کتنا زندہ اور بھاری ہے:

صبح سویرے رن پڑنا ہے اور گھمسان کا رن
راتوں رات چلا جائے جس جس کو جانا ہے

''ھل من ناصر ینصرنا'' جو کربلا کی تاریخ کا پردرد ترین اور معنویت سے بھرا جملہ ہے، افتخار عارف نے اس استغاثہ کو بھی اسی عنوان کے تحت اپنے انداز میں نظمایا ہے۔ اسی طرح '' بحضور سید الشہداءؑ'' اور ''کربلا گواہی دے'' بھی آپ کی مضبوط نظمیں ہیں۔ موخر الذکر نظم کے مصرعوں میں ایک تاریخی تسلسل ملتا ہے اور آخر میں آکر یہ کربلا کی روایت پر ختم ہوتی ہے۔ آخری مصرعے ملاحظہ ہوں:

یہ جو دردِ محکم ہے
یہ بھی اک گواہی ہے
یہ جو آنکھ پرنم ہے
یہ بھی اک گواہی ہے
یہ جو فرشِ ماتم ہے
یہ بھی اک گواہی ہے

جبکہ شاعر کربلا سے حاصل ہونے والے ثمر کی جانب سے بھی بے بہرہ نہیں اور اعتراف کرتا

Marfat.com

ہے:

محبتوں کے حوالوں میں ذکر آنے لگا
یہ فضل بھی تو میرے حال پر حسینؑ کا ہے

حسینؑ تم نہیں رہے، تمہارا گھر نہیں رہا
مگر تمہارے بعد ظالموں کا ڈر نہیں رہا

ایک اور خاص بات جو افتخار عارف کے اشعار میں بار بار ملتی ہے وہ شاعر کا کربلا اور مدینہ کی مذکورہ ہستیوں کا محبت کے امین ہونے کا ادراک ہے، جو اپنی جگہ بڑا با معنی اور با اثر ہے۔

افتخار عارف جس فکر کے پابند ہیں اس کا اظہار بھی بڑے واشگاف الفاظ میں کرتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں انسان تذبذب کی حالت سے نکل کر ایقان کی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔

کچھ نام جانتا ہوں یہ کافی ہیں اور بس
یہ ساتھ ہوں تو کچھ ابد آباد تک نہ دے

اس شعر میں سورۂ بقرہ میں مذکور حضرت آدمؑ کے علم اسماء کے حوالے کو دلیل بناتے ہوئے شاعر اپنے علم اسماء پر قناعت اور فخر کرتا ہے۔ یہی علم اسماء تھا جس نے فرشتوں کو آدمؑ کے آگے سجدے پر مجبور کیا تھا، یہ اسماء اہل بیتؑ رسول خداؐ کے ہیں جن کو اگلے شعر میں زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

وردِ زبان رہیں انہی نورانیوں کے نام
جب تک یہ خاک چادرِ امکان ڈھک نہ دے

☆☆☆

Marfat.com

دنیا کی عظیم ترین ثقافتوں میں سے ایک، ایرانی ثقافت

لوریس چکنا واریان☆

لوریس ۱۳۱۶ شمسی (۱۹۳۸ء) کو بروجرد (ایران) میں متولد ہوئے۔ انہوں نے ہنرستان موسیقی ایران اور میوزک اکیڈمی ویانا اور امریکا سے تعلیم حاصل کی اور انگلینڈ میں ایرانی سازو آواز ارکسٹرا کی رہنمائی کا اعزاز حاصل کیا۔ علاوہ ازایں کئی ممالک میں موسیقی کے پروگرام منعقد کیے۔ ذیل میں ان سے انٹرویو کا متن پیش کیا جاتا ہے۔

o استاد محترم، موسیقی کا قوموں کی آپس میں قربت اور ہمبستگی کے سلسلے میں کیا کردار ہوسکتا ہے؟

☆ موسیقی ایک الٰہی زبان ہے۔ موسیقی کی چونکہ ظاہراً کوئی زبان نہیں اس لیے اس کی زبان احساسات کو لمس کرنے کی زبان ہے، یعنی سب لوگ اس کے بارے میں ایک جیسا محسوس کرتے ہیں اور سب کے سب موسیقی کے ذریعے متحد ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ موسیقی اپنے احساسات کو خود بیان کرسکتی ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کا تعلق کس ملک اور قوم سے ہے۔ موسیقی بنی نوع انسان میں ہم آہنگی اور ہمبستگی کے جذبات کو عملی صورت دیتی ہے۔

o شاید یہ وہ الٰہی زبان ہے جو تمدنوں کے درمیان گفتگو کا وسیلہ بھی رہی ہے۔

☆ تمدنوں کے درمیان گفتگو صرف انسانی کلام کے ذریعے ہی نہیں بلکہ احساسات کے ذریعے بھی ہونا چاہیے۔ ممکن ہے کلام اور گفتگو ہزاروں الفاظ پر مشتمل ہو مگر موسیقی کے لاکھوں اشارے ہوتے ہیں جن کے ذریعے دو شخص ایک دوسرے کو بہتر طور سے سمجھ لیتے ہیں۔

▪ موسیقی کے ذریعے آپ نے اہل عالم کے ساتھ کس طرح رابطہ قائم کرلیا؟

☆ رودکی ہال میں ارکسٹرا کی قیادت نہایت کامیاب رہی۔ پیرس اور لندن میں بھی ہم نے متاثرین زلزلہ کی مدد کے لیے کنسرٹ کیے جن میں ان ممالک کی اہم شخصیات نے شرکت کی۔ ان میں ایک نہایت اہم ثقافتی رابطہ تھا۔ یہ نہ صرف انسانی ہمدردی کے حوالے سے ایک اہم رابطے کی نشاندہی تھی بلکہ اس امر کا بھی اظہار تھا کہ ہم ایک بین الاقوامی زبان یعنی موسیقی کی زبان میں بھی ایک دوسرے سے گفتگو کرسکتے ہیں۔

☆ بشکریہ گزارش گفتگو، شمارہ ۱۲، مہرماہ ۱۳۸۳ شمسی

Marfat.com

o آپ کو موسیقی سے لگاؤ کیوں کر پیدا ہوا؟

☆ میں نہیں جانتا۔ یہ وہ امور ہیں جو اوپر سے نازل ہوا کرتے ہیں۔ کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ لکھاری کیوں بن گیا، ڈاکٹر یا مصور کیوں بنا؟ یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ یہ اس شخص کا مقدر تھا۔ جس طرح سے کہ آپ دنیا میں آتے ہیں اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ایسا کیوں ہوا۔

■ استاد محترم، آپ کے کام کی خصوصیات میں سے ایک فارسی زبان کے ایسے ادبی اور ثقافتی آثار اور ادبیات سے استفادہ کرنا ہے جن پر پہلے کام نہیں ہوا۔ آپ کے پرستار جب رستم وسہراب کا شو دیکھتے تو ان کے لیے یہ بڑا شوق افزا ہوتا تھا۔ آپ یہ فرمایئے کہ یہ ابتکار اور جدت خود آپ کی طرف سے تھی یا اس کی کوئی مثال پہلے بھی ملتی ہے اور یہ کہ آپ نے یہ سوچ کیونکر اختیار کی؟

☆ اوپرا (Opera) کا یہ اسٹائل اور اسلوب چند صدیوں سے یورپ میں جاری ہے اور میں نے رستم وسہراب کے اسطورا اور کہانی کو اوپرا کی صورت میں لکھا اور ارکسترا اور ایکو ساؤنڈ کے ساتھ پیش کیا۔ بیشک رستم وسہراب، خسرو و شیرین، شیریں و فرہاد، لیلیٰ و مجنون ایسی عشقیہ داستانیں ہیں جن کا دنیا کے اہم ترین ادبی کاموں میں شمار ہوتا ہے اور میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ داستانیں موسیقی میں آکر اپنا احساس اور کلام کھو دیں، یعنی داستانی روایت کو ایک درجہ اہمیت حاصل رہے اور مختلف مقامات پر ان داستانوں کو مختلف انداز کے تجربوں کے ساتھ پرفارم کریں۔ میں نے انہیں ایسے انداز میں لکھا کہ کلمات سے حاصلہ احساسات زیادہ تر موسیقی کے کے ذریعے ادا ہوں۔ خسرو و شیرین اس سلسلے میں میرا پہلا تجربہ تھا۔ اس کے بعد میں نے یہی کام شیریں و فرہاد اور لیلیٰ و مجنون کے ساتھ بھی انجام دیا اور مجھے خوشی ہے کہ اس کا بڑا اچھا استقبال ہوا۔

o جناب استاد، آپ کا ایک اور یادگار کام مقامی موسیقی کو عالمی سائنسی موسیقی سے جدا کر دینا تھا جسے آپ نے آقائے شہرام ناظری کی معیت میں انجام دیا۔ اس پرفارمنس کا خیال آپ کے ذہن میں کیونکر پیدا ہوا مزید یہ کہ اس کو کس حد تک سراہا گیا؟ کیا آپ اسے جاری رکھیں گے؟

☆ بیشک مقامی موسیقیاں دنیا کی خوبصورت ترین موسیقیاں ہیں کیوں کہ لوگ خود انہیں تخلیق کرتے ہیں اور ان کا ہدف اور مقصد مختلف تقریبات اور تہوار ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ مختلف وجوہات کی بنا پر یہ سُرتال وجود میں آئیں۔ ایک اس کو گاتا اور دوسرا سنتا ہے اور اسے نسبتاً زیادہ یا کم کردیتا ہے اور سرتال کے حقیقی خالق تو خود لوگ ہی ہوتے ہیں۔ لوک نغمے خوبصورت ترین نغمات ہوتے ہیں اور دنیا کے عظیم ترین موسیقاروں نے ہمیشہ مقامی لوک نغموں اور گیتوں

Marfat.com

ہی سے استفادہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنی سمفونی پر کام کر کے اسے مکمل کیا ہے اور اسے عالمی زبان میں تبدیل کردیا، اسے ہم آہنگی بخشی اور اس میں رنگ آمیزی کی۔ ہم نے بھی یہی کام آقائے شہرام ناظری کے ساتھ مل کر کیا۔ موسیقی مقامی اور لوک تھی ہم نے اسے ارکسٹرا کے لیے منظم کیا جبکہ خود وہ (ناظری) بھی موسیقی کے ایک بہت بڑے استاد ہیں۔ نتیجے میں نہایت عمدہ اور خوبصورت پروگرام منعقد ہوگیا۔ دس پیس ایسے ہیں جو ہم تیار کرچکے ہیں لیکن ابھی تک وہ ریلیز نہیں ہوئے۔ امید ہے مستقبل میں ریلیز ہوجائیں گے۔

■ دوسرے گلوکاروں اور صدا کاروں کے ساتھ؟

☆ جی ہاں، مختلف گلوکاروں کے ساتھ کام کریں گے۔

○ سنا ہے آپ استاد شجریان کے ساتھ بھی مل کر کام کریں گے؟

☆ ان سے بات چیت ہوئی ہے، لیکن ابھی تک ہم مذاکرات کے مرحلے میں ہیں۔

○ استاد، جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے ایرانی ارمینوں اور دوسری ایرانی اقوام کے مابین جو ایک جذباتی لگاؤ اور وابستگی موجود ہے اُسے زیادہ محسوس کیا اور میں یہ سوچتا ہوں کہ آپ اس احساس کا ایک عملی نمونہ ہیں۔ یہ فرمائیے کہ موسیقی کا اس احساس وابستگی میں کتنا کردار ہے؟

☆ بیشک اہل پارس کی تاریخ واضح ہے۔ کوروش شاہوں کا شاہ تھا۔ارمینوں کا ایران سے (جو ملک کا نام ہے اور ایک علاقہ ہے) ایک رشتہ و رابطہ رہا ہے۔ پارس لوگ جس دن سے یہاں آئے وہ ان لوگوں کے ساتھ رہتے سہتے رہے اور آج بھی ان کے درمیان نہایت قریبی تعلق اور وابستگی موجود ہے جبکہ ان کے درمیان فرق صرف مذہب کا ہے یعنی وہ مذہبی لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ روحانی، اخلاقی اور جذباتی لحاظ سے وہ باہم یکجا رہے ہیں یہاں تک کہ ہخامنشی دور میں عظیم ترین جنگجو ارمنی تھے اور جس زمانے میں ڈاکٹر نایاب ہوتے تھے ارمنی لوگ طبابت اور انجنیرنگ کے پیشوں سے وابستہ تھے۔ ان کے اندر فنکار بھی موجود تھے۔

وہ اپنے آپ کو ایرانیوں سے الگ محسوس نہ کرتے تھے۔ اخلاقی طور پر وہ اس ملک کے باشندے ہیں اور دنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی حادثہ پیش آتا رہا اس سے متاثرہ آرمینائی ایران میں پناہ لیتے رہے۔ میں بھی ایک ارمنی ہوں۔ میں ایران خصوصاً بروجرد میں متولد ہونے کو ایک اعزاز سمجھتا ہوں اور فخر کرتا ہوں کہ ایک ایسے ملک میں میں نے آنکھ کھولی اور پلا بڑھا جس کی تہذیب دنیا کی عظیم ترین تہذیب ہے اور حقیقت یہ ہے کہ میں کسی بھی اور جگہ میں نہیں رہنا چاہتا۔

Marfat.com

o استاد، آپ نے فلمی موسیقی بھی کمپوز کی اور مجھے یاد آتا ہے کہ آپ نے ''چشمہ آرِ بی آوانسیان'' نامی فلم کے لیے بھی موسیقی دی تھی۔

☆ میں نے زیادہ تر دستاویزی فلموں کا کام کیا ہے۔ میں نے تقریباً ۴۰، ۴۵ دستاویزی فلمیں اور ۵۔۶ سینمائی فلمیں لکھیں۔ میری پہلی سینمائی فلم ۱۹۶۱ء میں ''جدال در مہتاب'' تھی جو ایران اور اٹلی کے باہمی تعاون سے بنی تھی۔ یہ پہلی فلم تھی جس کے لیے حقیقی طور پر موسیقی ترتیب دی گئی تھی، ٹوٹل پورا نہیں کیا تھا۔

o استاد، کیا فلموں میں آپ کی موسیقی کا کام ابھی جاری ہے؟

☆ اس وقت میں ایک ٹیلی ویژن فلم کے لیے کام کر رہا ہوں جو حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے بارے میں ہے۔

o استاد ایک اور سوال یہ ہے کہ آپ کے کام میں مذہبی اور مسیحی موسیقی کا ظہور کس حد تک ہوا ہے؟

☆ مسیحی مسائل اور اسلام کے مسائل! میں عیسائی ہوں اور چرچ میں پروان چڑھا ہوں۔ خاص طور پر ارمنی مسیحیوں کی تمام تقریبات اور تہوار موسیقی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ مزید یہ کہ دین اسلام سے بھی میں نے تعزیہ، ماتم و سوگواری اور نوحہ خوانی کے مراسم اور تقریبات کو یکجا کیا اور ''رستم و سہراب'' میں ان سے استفادہ کیا ہے۔ چونکہ مذہبی موسیقی میں دلچسپ بات یہ ہے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مذہب کونسا ہے۔ موسیقی کسی قسم کی بھی ہو نہایت خوبصورت ہوتی ہے۔ مذہب جو کوئی بھی ہو، بدھ مت ہو یا زرتشتی پاکیزگی اور حسن اس کے لازمی اجزا ہوتے ہیں، یہاں تک کہ ہندوستان کی بدھ یا مسیحی موسیقی میں بھی آپ لاہوتی احساسات موجزن پائیں گے۔

o استاد، ایرانی موسیقی کے متعلق بعض حضرات اس بات کے معتقد ہیں کہ یہ موسیقی ایک جامد اور ٹھہری ہوئی حالت اختیار کر چکی ہے یہاں تک کہ جب کبھی کسی بڑے آرکسٹرا کے ساتھ بھی پرفارم ہوتی ہے تب بھی اس میں تھوڑی ہی پیشرفت نظر آتی ہے۔ شاید یہ حالت ایرانیوں کی باطن پرستی اور زیادہ ارتکاز فردی کی طرف پلٹتی ہے۔ آپ کے خیال میں ایرانی موسیقی کی صلاحیت اور استعداد کس حد تک ہے؟ ہماری یہ موسیقی جو روایتی ایرانی موسیقی کہلاتی ہے اس کے آلات عالمی موسیقی میں کس مقام پر ہیں؟

☆ ایرانی موسیقی بڑی خوبصورت ہے اور اس پر صدیوں تک کام ہوتا رہا ہے۔ دنیا میں فنون کے ہر شعبے میں ایک وقت آتا ہے جب وہ فن رک جاتا ہے، ٹھہر جاتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم

Marfat.com

ایرانی موسیقی کو بڑا نہ سمجھیں۔ ممکن ہے کہ یہ ٹھہراؤ یا توقف دس سے پندرہ برس تک پر محیط ہو لیکن سٹائل اور اسلوب کسی وقت بھی ختم نہیں ہوتا۔ یہ تو ممکن ہے کہ رک جائے لیکن ایران کی روایتی موسیقی اتنی قوی اور خوبصورت ہے کہ اس کے ختم ہوجانے کا کوئی امکان نہیں ہے بلکہ میں تو معتقد ہوں کہ یہ موسیقی حتمی طور پر جاری رہے گی شاید آئندہ پانچ سال کے عرصے میں خالقی، بنان، وزیری، صبا اور تہرانی وغیرہ جیسے استاد اور موسیقار دوبارہ پیدا ہوں۔ مدتوں دنیا میں نابغہ شخصیات پیدا ہوتی رہیں۔ جب اتنی تعداد میں دنیا میں نوابغ آجائیں تو اگر غور کریں تو اس سلسلے میں کبھی ایک وقفہ بھی آجاتا ہے۔ میرے عقیدے کے مطابق چند سال کے وقفے کے بعد ایسے عظیم لوگ جن کا نام لیا گیا دوبارہ متولد ہوجاتے ہیں اور اس کے بعد یہ فن پھر آگے بھی بڑھنے لگتا ہے۔

○ پس ایرانی موسیقی سے امید رکھی جانی چاہیے؟

☆ جی ہاں، یہ ایک عمارت کی طرح ہے جسکی بنیادیں اتنی مضبوط ہیں کہ اس کے منہدم ہوجانے کا کوئی امکان نہیں۔ اب اس عمارت کو بنا لیا گیا ہے اور اسے پچاسویں منزل تک اٹھا بھی لیا گیا ہے۔اس کی بنیادیں اتنی مضبوط اور محکم ہیں کہ ڈیڑھ سو منزل تک بھی اس کی تعمیر کی جاسکتی ہے!

■ ایران کی ثقافت کس نوع کے تبادلوں کا نتیجہ ہے؟

☆ قدیم ایران بہت ہی عظیم رہا ہے۔ قدیم امریکہ کی طرح جس نے مختلف اقوام کو اپنے اندر سمویا، ایران میں مختلف ثقافتیں یکجا ہوگئیں، سب لوگ فارس نہ تھے۔اس ملک میں بھی مختلف اقوام موجود تھیں جو سبھی جگہوں سے آئیں تھیں اور مختلف ثقافتوں کے ہوتے ہوئے بھی یہ ایک محکم اور قوی ملک تھا جسکی مضبوط ثقافتی جڑیں تھیں جن کے گرد بہت ساری قومیں جمع ہوگئیں۔ ایران کی عظمت بھی اسی سے ہے کہ اس میں بہت سی قومیں جمع ہوئیں ہیں جس سے یقیناً مختلف رنگ وجود میں آئے، ایک رنگ نہیں۔ ایران کی ثقافت متنوع اور رنگارنگ ہے۔ ہر قوم جو یہاں آباد ہے اور ہر گاؤں دوسرے گاؤں سے احساسات اور طرز عمل کے لحاظ سے متفاوت ہے۔ چنانچہ اسی لیے اس کی موسیقی بھی گوناگوں اور رنگا رنگ ہے۔

یہ تفاوت ایرانی شاعری میں بھی موجود ہے اور انسانی رویوں کی شناخت میں بھی۔

یہی وجہ ہے کہ اس ثقافتی منظرنامے میں ارمنی موسیقی کا بھی ایک مقام ہے اور وہ احساس اور جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے۔ اسی طرح ترک موسیقی بھی اپنا ایک خاص احساس رکھتی ہے اور اسی علاقے سے وابستہ ہے جہاں یہ پھلی پھولی۔ لروں کی موسیقی بھی اپنے مخصوص علاقے سے

Marfat.com

متناسب ہے۔ ہر موسیقی اپنے اپنے علاقے کی خصوصیات کی بنیاد پر ترقی اور نمو حاصل کرتی ہے۔ اس کی تعمیر میں پہاڑ، دریا، جھیلیں، فطرت، آفتاب، گرمی اور سردی اور اقتصادی حالات وغیرہ سبھی اپنا کردار ادا کرتے ہیں اور اسی نقطۂ نظر سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اگر خوش قسمتی سے ایرانی قوم قومیت کا احساس پیدا نہ کرے اور پرانے زمانے ہی کی طرح رہے اور مختلف اقوام کو یہاں زندگی گذارنے دے اور وہ خود کو بھی آشکار کریں تو اس ثقافت کا بھی اپنا ایک مقام ہوگا اور یہ ملک مضبوط ترین اور اہم ترین ملک ہوگا۔ ایران کی موجودہ ثقافت ایسی ثقافت نہیں جسے صرف فارس لوگوں نے تشکیل دیا ہو۔ یہ ایسی ثقافت ہے جسے علاقے کی بہت ساری قوموں نے مل کر تشکیل دیا ہے۔

○ آپ نے رستم وسہراب کے بارے میں اس سے پہلے گفتگو کی۔ یہ ایران میں ایک فنی قضیہ ہے جس کی اجارہ دارانہ صورت ہے۔ وہی فارسی شاعری اور شعر کے اوزان ہیں اور ایک خاص انداز میں ان کے وسط میں موسیقی ہوتی ہے اور یہ تمام ادبیات جو دنیا کے اس خطے میں موجود ہیں مختلف اقوام کی حاصلات اور فارسی زبان میں ہیں۔ یہ آپ کے فارس سے لگاؤ کا سبب ہیں۔ اس کلام اور اس حالت نے ہماری موسیقی میں کیا رول ادا کیا ہے؟

☆ بنان جو کچھ گاتا ہے وہ حافظ اور ایران کے دوسرے عظیم شعراء کے کلام میں سے ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایران کی ادبیات دنیا کی اہم ترین چیز ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ کوئی ملک ایسا ہوگا جو ادبیات اور شاعری کے حوالے سے ایران کی سطح پر ہو لیکن ایرانی شعراء کی عظمت اس میں ہے کہ وہ قوم پرست نہ تھے۔ وہ آفاقی حیثیت رکھتے تھے اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ اسی وجہ سے دنیا بھر سے گفتگو کرتے تھے اور انہوں نے جو باتیں کہیں وہ اہل افریقہ، چینیوں اور ایرانیوں کے دل کی باتیں تھیں۔ یعنی یہ عالمی شعراء تھے، بیتھوون اور باخ کی طرح جنہوں نے عالمی سطح پر سرتال پیش کی اور ان سب کی عظمت اسی سے ہے اور موسیقی میں بھی یہی فکر کارفرما ہونی چاہیے۔ ہر ثقافتی شے کو عالمی ہونا چاہیے نہ کہ قومی۔ چونکہ وہ پہلی چیز جو کام کی سست روی اور عقب روی کا سبب بنتی ہے وہ ثقافتی کام کے قومی ہونے کا احساس ہے۔ اس نیشنل ثقافت کو وجود میں نہیں آنا چاہیے۔ جیسا کہ روس اور جرمنی میں ہوا اور جس نے ان کے لیے دشواریاں پیدا کیں۔ اسے وجود میں نہیں آنا چاہیے۔ ایرانی ادبیات واقعی بہت زیادہ اہم ہیں۔

ایرانی شعراء ایران سے ضرور تعلق رکھتے تھے لیکن وہ ایران کی ملکیت نہ تھے۔ ان کا تعلق ساری دنیا سے تھا۔

○ استاد، ماڈرن کنسرٹ اور اپنے اس جدید پروگرام کی جس میں آپ نے امن کے مفہوم کو

Marfat.com

واضح کیا ہے، اور اس کے عالمی چہرے کی بات کریں!

☆ ڈاکٹر کہن زادہ خود بھی ڈاکٹر ہیں، ہسپتال کے سرجن ہیں، لیکن ان کے فنکارانہ جذبات بہت بلند و بالا ہیں۔ وہ خود بھی جنگِ ایران عراق میں شامل رہے۔ وہ ہمیشہ صلح کی توقع لگائے رہتے ہیں۔اسی جنگ میں ان کے تمام دوست شہید ہوگئے اور انہیں یہ احساس ہے اور انہی جذبات و احساسات سے الہام لیتے ہوئے انہوں نے امن کے نغمات لکھے ہیں جو کہ ایک نہایت خوبصورت کام ہے۔ مجھے وہ واقعی پسند آیا اور میں نے فوری طور پر چاہا کہ ان کے ہمراہ رہوں اور جن دس راتوں میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہے ایک بھی رات ایسی نہیں آئی کہ میں نے تھکن کا احساس کیا ہو۔ درحقیقت میں کام سے لطف اندوز ہوا اور ڈاکٹر کہن زادہ کا کام سُر اور نغمہ سازی نہ تھا بلکہ وہ دنیا میں ایک منفرد اور استثنائی شخص تھے۔دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کا موسیقی سے سو فیصد سروکار نہیں لیکن موسیقی سے ان کی محبت عظیم ہے۔ کام نہایت خوبصورت اور پرفارمنس بھی نہایت عمدہ تھی اور اس کا استقبال بھی نہایت گرمجوشی سے ہوا۔ دنیا میں بہت ساری ایسی نابغہ شخصیات گزری ہیں جنہوں نے موسیقی ہی کی راہ سے عشق کا مفہوم پایا۔

○ استاد، اپنے آئندہ پروگراموں کی تفصیل بتائیں۔

☆ فی الحال میں ''رستم و اسفندیار'' کا اوپرا لکھ رہا ہوں اور امید ہے اسے جلد مکمل کرلوں گا۔ تمدنوں کی گفتگو کے مرکز کے لیے ایک سمفونی بھی لکھ چکا ہوں۔ جو حال ہی میں ختم ہوئی ہے۔

○ کیا یہ سمفونی ''رستم و اسفند'' یا ''رستم و سہراب'' کے اسلوب پر ہے یا کسی اور شکل میں؟

☆ جی نہیں، اس کا انداز جدا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ پتلی کے تماشے کی صورت میں پرفارم ہوگا۔ وحدت ہال میں ہم اس کا اسٹیج بنا رہے ہیں اور پتلیاں بھی آسٹریا میں بن رہی ہیں اور آسٹریا میں بھی اس کی نمائش ہوگی۔

○ استاد، ہمارے ہالوں میں بھی؟

☆ ہمارے پاس تو ہال ہی بہت کم ہیں۔

○ موجودہ ہال اس پرفارمنس کے لیے کیسے ہیں؟

☆ ان میں سے کوئی ایک بھی اس کام کے لیے مناسب نہیں۔ ایک زمانے میں جب تہران کی آبادی دس یا بیس لاکھ تھی وحدت ہال اچھا تھا، لیکن اب ہزار سے ڈیڑھ دو ہزار تماشائیوں کے لیے ہال بنانے چاہئیں، شاید ایک شخص ترجیح دے کر وہ آکر کنسرٹ سن لے۔ مختلف قسم کے ہال ضرور بننے چاہئیں یہ ہمارے پاس بہت کم ہیں یا بالفاظ دیگر بالکل ہی موجود نہیں۔

Marfat.com

■ بچوں کو موسیقی کیونکر سکھائی جاسکتی ہے اس کی ابتدا کیسے کی جائے؟

☆ بچوں کی مائیں ان کے لیے موسیقی کی سب سے بڑی معلم ہوتی ہیں۔

■ مختلف سازوں سے واقفیت کے لیے؟

☆ یہ واقفیت تو ٹیلی ویژن کو پیدا کرنا چاہیے۔ یا انہیں ریڈیو سے یا ممکنہ طور پر فلم سے حاصل کرنی چاہیے لیکن موسیقی کی پہلی معلم ادبیات اور زبان کی پہلی معلم تو ماں ہی ہوتی ہے۔

(ترجمہ: جاوید اقبال قزلباش)

☆☆☆

Marfat.com

انقلاب اسلامی ایران

ڈاکٹر رشیدہ نثار☆

انقلاب نظریاتی تصادم کے بغیر برپا نہیں ہوسکتا۔ اس لیے انسانی اجتماعی جذبات کی نمائندگی وہی انقلاب کرتا ہے جس کے پس پشت ایک نظریہ اور ایک نظام موجود ہو۔ چنانچہ دنیا میں جتنے بھی انقلاب آئے ہیں انہیں نظریاتی شعور سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

انقلاب ایران بھی اجتماعی شعور کے بغیر برپا نہیں ہوا، مگر یہ انقلاب پیچیدہ جدلیاتی تخلیقی عمل کا نتیجہ تھا جس کا اشتراکی جدلیاتی نظریے سے کوئی تعلق نہ تھا، کیونکہ اشتراکی نظام فکر مادی تخیلی پیکر کے سوا کچھ بھی نہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ تمام انقلابات مادی اور میکانکی اضطرار پر مبنی تھے، جبکہ انقلاب ایران مادہ پرستی سے الگ اسلامی فکر پر استوار تھا۔

چونکہ اسلامی فکر اضطراری نہیں تھا اور نہ ہی اسے کسی ذہنی منصوبے کے تحت تشکیل دیا گیا تھا بلکہ قرآنی نظام کے مطابق اس کی تشکیل ہوئی تھی۔ اسی لیے وہ نئے ایرانی احساس کے جنم کا باعث بنا، مثلاً:

○ زندگی کو عذاب سمجھنے والوں کے سامنے ایک زندہ حقیقت رکھی گئی تھی کہ انسان مبارک مستقبل کا احساس رکھتا ہے۔

■ شکست خوردگی انسان کا مقدر نہیں ہے بلکہ فرار اور سطحی واقعیت قبائلی جبری نظام کا شاخسانہ ہے۔

■ پسپائی میکانکی اضطراب کی حامل ہے اور انسان کی ہیئت اجتماعی کو سبوتاژ کرتی ہے۔

○ انسانی کردار مستقل اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا صالح کردار شخصیت کی انفرادیت نکھارتا ہے اور زمانے اور ماحول کو تبدیل کرتا ہے۔

■ قرآن کی روشنی مملکت ایران میں ۱۴۰۰ برسوں سے پھیلی ہوئی تھی۔ لہٰذا ایران نے فکر و عمل میں جتنی خصوصیات پیدا کی ہیں انہیں بھی تاریخ کے آئینے میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے،

☆۶۰۹۔ ڈھیری حسن آباد، راولپنڈی

Marfat.com

مگر سلسلہ ہائے دراز سے ایران میں شخصی بادشاہت نے انسانی کھری شخصیت اور اس کی حیات کلّی کو مسخ کردیا تھا۔ حق پرستی، توحید اور انسانی وحدت کی بجائے ایران میں تصادم و نفاق اور سامراجی میلانات کو جنم دیا گیا، لہٰذا شہنشاہی عہد (اسلامی فکری مطالبات کے برعکس) سامراجی معاشرت کو قبول کرتے ہوئے ایک مرے ہوئے نظام کی عمارت کو انہدام سے بچانے اور زبردستی اُسے قائم رکھنے کے لیے اپنی عمر اور میعاد آگے بڑھاتا رہا مگر یہ زبردستی کی کوشش سامراج کی قوت کے باوجود اس عمارت کو نہ بچاسکی، کیونکہ ایران کی بادشاہت اور اس کا بخشا ہوا غلط معاشرتی نظام عرصہ ہوا اپنی غایت کی تکمیل کر چکا تھا اور اس کے مقدر میں صرف ایک ہی جہت رہ گئی تھی کہ کوئی مردِ خدا آئے اور اس کے تمام تخریبی اور رجعتی عناصر کو پاؤں کی ایک ٹھوکر سے ریزہ ریزہ کردے۔

زمانہ، وقت اور معاشرت خود کو ان اثرات سے بچانے کی سکت رکھتے ہیں۔ ان تین عناصر نے امام خمینیؒ جیسا انسان پیدا کردیا جس نے تخریبی قوتوں کو ہیئت اجتماعی کی شکل میں تبدیل کیا اور امام موصوف کی کھری شخصیت کی روشنی نے حیات ملی کو اس طرح مرتب کیا کہ نوعِ انسانی فلاح کے سفر پر روانہ ہوگئی۔ چنانچہ آج ایران نے انقلاب اسلامی کی بنا پر چودہ سو سالہ بلند و بالا مقصد کو عظمت و شکوہ کا ایسا مینار بنادیا کہ پوری دنیا مارکس اور ماؤزے تنگ اور چچا سام کی طرف دیکھتے دیکھتے ایران کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوگئی ہے۔ اب دنیا میں ایران کا اسلامی انقلاب ایک واحد حقیقت ہے کہ جس میں آدمیت کا رنگ ایک اجتماعی آہنگ کے ساتھ وابستہ ہے۔

عہد موجود میں ایران دوسرے نظاموں کے مقابلے پر زیادہ مستحکم اور زیادہ مہذب ہے۔ اس کے مستحکم شعور میں اجتماعی غایت، مکمل میلان، اور نمایاں حرکت موجود ہے۔ لہٰذا پورے عصر میں جتنے نظام ہائے فکر پائے جاتے ہیں ان میں جبلی، اضطراری، مفاد پرستی اور استحصال کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، جبکہ ایرانی اسلامی انقلاب نسل کی بقاء، انسانی مسرت و راحت، اجتماعی ترقی اور تہذیبی استحکام کی ضمانت دیتا ہے۔ اس سے پیشتر پورا ایرانی معاشرہ سامراجی سرغنوں کی قوت کو مجتمع کرکے بادشاہ کی ذات کو شخصی حیثیت دیتا تھا۔ مگر امام خمینیؒ نے متوازی نظام کو ایک خاندان، ایک سماج اور انسانیت کے وجود اور ماورائیت کو زمین اور آسمان کے اشتراک میں ایک کل کی حیثیت دے دی اور بکھراؤ کی صورت جس نے شخصی جائیداد اور انسان کو مطیع کرنے کے خواب کو مجسم کیا تھا، اس نظام کے ذریعے اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ یہیں سے بادشاہت کا زوال اور اسلامی اجتماعی اشتراک کا دور شروع ہوتا ہے۔

Marfat.com

ماضی میں مارکس، ہیگل، ماؤزے تنگ، ٹوائن بی، ہنٹنگٹن، چی گیویرا اور پابلرزودا عالم عناصر میں نامیاتی قوت کے انکشاف میں جدلیات کو نئی زندگی کی تخلیق میں لازمی عنصر سمجھتے رہے ہیں، مگر اس جدلیاتی تخلیق میں انسان ذی ارادہ ہو کر حیوانی مخلوق سے الگ نہیں ہو سکتا کہ اس طرح انسان مشین کا پرزہ بن کر اپنی ضرورتوں کے غلام کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے، جبکہ انقلاب اسلامی ایران انسان کی نامیاتی تشکیل میں نئی زندگی کی ہیئت میں شرف بلکہ اس کا نقش دنیا کی پیشانی پر منور کرنے کی ہمت رکھتا ہے۔ علی ہذا القیاس انقلاب اسلامی ایران ہیئت اجتماعی کی ترقی اور اسے لازوال بنانے کا محرک بھی ہے اور انسانی انتشار کو تنظیم میں تبدیل کرنے کا تفکر بھی! چنانچہ انقلاب اسلامی بے ہیئتی اور انتشار کی حدبندیوں کو توڑتا اور نئی حدبندیوں کی تشکیل کی جانب پہلا قدم ہے۔

حضرت امام خمینیؒ نے پیغمبر نہ ہو کر بھی پیغمبرانہ وصف کے ذریعے عالم اسلام کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا ہے۔ انہوں نے نہ صرف فکر و عمل کو متاثر کیا ہے بلکہ یادگار اور ناقابل فراموش کردار کے تناظر میں زندہ عصر میں ان جیسا کوئی رہنما موجود نہیں ہے۔ ان کی شمع ہدایت کی روشنی میں اس امر کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت امام خمینیؒ پوری دنیا میں رہنمائی کا فریضہ انجام دینے والے منفرد فرد تھے۔ انہوں نے ایک کارکن کی حیثیت سے جماعت کی تشکیل کی اور جماعت کو انسانی ہیئت اجتماعی میں ڈھال دیا کہ موجودہ ایران ایک خاص تمدن کا شاہکار دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ موجودہ ایران کو شہنشاہی عہد کے ایران کے تقابلی مطالعے میں آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے کہ آج ایران ایک مخصوص ذہن، کردار اور شخصیت کی تشکیل میں بہت سے اثرات اور میلانات کو تخلیق کرنے میں کامیاب ہے۔ تاہم کامیاب انقلاب وہی ہوتا ہے جو انسان کو مجرد خیال کی تحویل میں نہ رہنے دے بلکہ فردیت کے مقام اور کردار کی ترتیب کو منقلب کردے۔ انقلاب ایران انسان کے جمہوری حقوق تسلیم کرتا ہے اور مطلق العنان قوت کو مسترد کرتے ہوئے اخلاقیات کی عمارت کی بنیاد کو بناتا ہے۔ انقلاب اسلامی کی تخلیقی کڑیاں سلامت ہیں۔ ایران کا اسلامی انقلاب جب مکمل ہوگیا تو اس کی نئی ترتیب و تحسین کی ضرورت وقت کا اہم تقاضا تھا۔ چنانچہ اس فریضے کو حضرت علی خامنہ ای نے اسی صراط مستقیم پر استوار کیا جسے حضرت امام خمینیؒ اپنی زندگی میں ترتیب دے گئے تھے۔ لہٰذا عہد حاضر کا ایران مکمل طور پر اسلامی فکر کے بازوؤں میں خوشگوار حیرت کے ساتھ اپنی زندگی کو طے کر رہا ہے، مثلاً امام خمینیؒ نے قطرہ اور قلزم کے فلسفے میں ایران کی شخصیت اور اس کے چہرے کو بے وقعت نہیں ہونے دیا، بلکہ ایران اسلامی عقائد کے احیاء میں اپنی جسمانی

Marfat.com

ضرورتوں کے مطابق فطری مطالبات اور صلاحیت کا پیمانہ بناتا ہے۔ اس طرح انسان، اضطرار و اضطراب کے موضوع سے الگ ہو کر اجتماعی آزادی کے قریب ہوجاتا ہے اور مہذب طور پر قوت اور حرکت کو از خود بیدار کرنے کی ہمت حاصل کرلیتا ہے۔

ایرانی اسلامی انقلاب کو انقلابات کے تناظر میں ایک نئی تخلیقی قوت سے منسوب کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ یہ انقلاب شعوری ہے اور کسی انسانی مفروضے پر قائم نہیں ہے۔ اس کی ترکیب میں اندرونی ناموس اور اپنے ارادے کی آرزو بدرجہ اتم موجود ہے۔ لہٰذا انسانی معاشرت میں یہی انقلاب کامیاب تصور کیا جاتا ہے جو بقائے انسانی کو نئے پیمانے مہیا کرے۔

انقلاب کے وجود اور اس کے اثرات سے کسی کو انکار نہیں۔ مگر یہ سوال بہت اہم ہے کہ انقلاب کیوں اور آخر کس کے لیے! ہمارے سامنے انقلابات کی تاریخ اور ان کی تفصیل موجود ہے۔ تاہم موجودہ عصر کے انقلاب میں ڈاروِن نے جہدللبقاء کی روشنی میں ایک فکر مہیا کیا تھا۔ مگر یہ فکر حیاتیاتی تھا۔ جس کا تعلق، آہنگِ تاویل کے ساتھ تھا۔ ایسا فکر افزائش اور بقا کی تصدیق کرتا ہے۔ مگر اس آہنگ کی ضمانت نہیں دیتا جس سے زندگی زیادہ مہذب بنتی ہے اور بقا کی سند ملتی ہے۔

مارکسی انقلاب سراسر ارضی ہے اور انسانی پیداوار سے تعلق رکھتا ہے۔ صنعتی انقلاب اسی سلسلے کی متوازی کڑی ہے۔ انقلاب فرانس جمہوریت کو محیط ہے۔ جس میں انسان موجود لیکن خدا غائب اسی طرح مارکسزم اور جمہوریت دونوں سیکولرازم ہو کر عالم مثال اور عالمِ تصور سے باہر نہیں نکلتے۔ اس کے علی الرغم اسلام ایک ازلی تصور رکھتا ہے۔ جس میں حیاتیاتی نظام فکر سے لے کر پیداواری ذرائع اور جمہوریت بہت کچھ موجود ہے۔ اسلام چونکہ حقیقت اولیٰ کا تصور پیش کرتا ہے۔ لہٰذا عالم موجودات کا ہر تصور اس کے سامنے اپنے آپ کو دستبردار کرتا ہے اور انسانی اذہان کے تناقضات کے علاج کو منکشف کرتا ہے۔ لہٰذا اسلام ایک افادی مذہب ہے تصوراتی یا مفاداتی نہیں۔ حضرت امام خمینیؒ نے کائناتی مادی اور تصوراتی ماہیت کی موجودگی میں اسلام کی طرف مراجعت کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام ترقی یافتہ مذہب ہے۔ جس کی تواریخی قدر، حسن نیت، حسن عمل اور حسن حقیقت بنتے ہیں۔ اسلامی فکر نے اس تناظر میں دو مزید نزاکتیں پیدا کی ہیں کہ حسن عمل سے حسن معنی پیدا ہوتا ہے اور حسن نیت سے حسن حقیقت۔ چنانچہ روح، جسم اور معنی کو جس طرح اسلام نے پیش کیا ہے کوئی دوسرا مذہب اس طرح پیش نہیں کرسکا۔ لہٰذا جس طرح روح کی دوئی کے انکشاف اور فکر و نظر میں ماورائیت کو افادیت

Marfat.com

میں تبدیل کرنے اور غیر مادی اشیاء کو احیا اور ابدیت کی طرف کھینچ کر لے جانے میں جس تحرک کا مظاہرہ اسلام نے کیا ہے اس سے مجذوبیت، مادیت، نسلی تفاخر اور منطقی مغالطوں کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ یہ ایک نئی تصوریت تھی جسے حضرت امام خمینیؒ نے اپنے کردار اور بصیرت کی روشنی میں ازلی مثال بنا دیا ہے۔ چنانچہ کسی جامع تصور کی تلاش میں ہم جتنا نکھار اور وسعت امام خمینیؒ کے افکار میں دیکھتے ہیں اس نے اب ایک مرکزیت اختیار کرلی ہے۔

انقلاب اور اسلاف کی پاسداری میں امام خمینیؒ نے جس قوت فکر کو مشہود کیا ہے وہ بھی ہماری رہنمائی کے لیے ایک ورثے اور ذخیرہ کا کام دے سکتا ہے کیونکہ امام خمینیؒ نے اسلامی فکر کی تشکیل میں نظریات، ابد کے اکتسابات اور مشرق و مغرب کے درمیان رہ کر نئی ضرورتوں کا احساس دلایا ہے۔ انہوں نے عصری میلانات میں اپنے پیش روؤں کی ندرت و بصیرت سے استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ مسرت و راحت، حیات و موت، تواہم اور مغالطوں کی تشریحات میں انہوں نے ہیئت محاکمہ کا تصور تخلیق کیا ہے۔ ان کی حکیمانہ بصیرت اور بے مثال جدوجہد نے انقلاب اسلامی کو لافانی بنانے میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ چنانچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ انفرادی طور پر ایران کو دائمی سوچ مہیا نہ کرتے تو کسی نئی دھن کا پیدا ہونا مشکل تھا۔ لہٰذا حضرت امام خمینیؒ کی آواز اپنے عہد کی آواز ہے جس میں کوئی ابہام یا مغالطہ نہیں ہے۔ انہو ں نے قرآنی نکات کا اعادہ اپنے کردار سے کیا ہے۔ یاد رہے یہ وہی کردار ہے جس میں پیغمبرانہ شعور، پاکیزگی اور شرافت موجود ہے۔ وہ مادہ پرست لوگ جن کے پاس پیغمبرانہ وثوق اور شعور نہیں ہے تمد ن انسانی کے شرف کا احاطہ نہیں کرسکتے۔ ہمیں نئے شعور اور نئی بصیرت کے لیے اسلامی انقلاب کے جدید تصور کی طرف مراجعت کرنی ہوگی کہ یہ انقلاب انسانی سعادتوں کا ماخذ ہے۔

اسلامی ممالک کے انسان ایک عرصہ سے اسلامی انقلاب کی راہ دیکھ رہے تھے۔ انہیں زندگی کا رومانی تصور، دور از خیال زندگی، اساطیر، تصوف، عالم مثال، انفرادی وجود اور مطلق حقیقت کی تمثال تو مل جاتیں مگر اسلامی سند کہیں دستیاب نہیں ہوتی تھی۔ آج ہم ایرانی اسلامی انقلاب کی روشنی میں یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ آؤ امام خمینیؒ کی طرف رجوع کرو کہ اس شخصیت میں بیک وقت ''مطلق تصور'' منفرد اور عمومی زندگی، جدلیاتی حرکت، اساسی حقیقت سب کچھ موجود ہے۔ یہ بے مثال شخصیت شہنشاہی، ماورائی، مابعدالطبعیاتی سے الگ تھلگ اپنا وجود بناتی ہے۔ جس میں زندگی کی ماہیت محرک ہے اور یہ تحریک انقلاب کی جامعیت کی تشکیل کرتی ہے۔

Marfat.com

ہم اگر روحانی تصور کی آنکھ سے دیکھیں تو امام خمینیؒ کی صورت میں حقیقت اولیٰ ہیولیٰ حسن کا زندہ وجود، مسرت و انبساط کا سرچشمہ، کھرا اور منفرد اظہار، مادی اور جسمانی خوبصورت پیکر، سب کچھ ہمیں مل جاتا ہے۔ اس کے باوصف امام خمینیؒ زندگی کی نمو کا دوسرا نام، اور یہ نمو اتنی حسین شے ہے کہ یہ عینِ زندگی ہے جس سے نت نئی توانائیوں کا احساس جنم لیتا ہے۔ جس کے بارے میں حافظ شیرازی نے کہا تھا:

شاهد آن نیست که موئی میانی دارد
بندۂ طلعت آن باش که آنی دارد

لہٰذا مادیت کی شدت، شعور اور تواریخ کے میلان میں جس بشر نما کی اس دہر کو تلاش ہے، اس کا نام امام خمینیؒ ہے جو خداوند قدوس کی مبارک تخلیق اور نوعِ انسانی کے لیے برکت کا سرچشمہ ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

اسلامی جمہوریہ ایران حقوق انسانی کے آئینے میں

تلخیص و ترجمہ: جاوید اقبال قزلباش☆

آج کے انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ترقی یافتہ دور میں چہار دانگ عالم میں حقوق انسانی کا چرچا ہے۔ مغربی اقوام جو بزعم خود انسانی ارتقاء کی انتہائی منازل پر ہیں انسانی حقوق کی بظاہر چمپئین اور علمبردار بنی ہوئی ہیں۔وہ ہر ملک اور معاشرے کو اپنے بنائے ہوئے اسی پیمانے سے ماپتے ہیں۔ ان کے فلسفی اور دانشور ایک طرف سے تہذیبوں کے ٹکراؤ Clash of Civilizations اور اختتام زمانہ End of times کی تھیوریاں پیش کررہے ہیں تو دوسری طرف انہوں نے حقوق بشر کے نام پر مداخلتوں سے دنیا کے باقی ممالک کا ناطقہ بند کررکھا ہے۔ وہ انہیں پسماندہ، غیر ترقی یافتہ اور جہالت زدہ تصور کرتے ہیں اور اسی تناظر میں ہمہ وقت ان کے خلاف شور وغل اور ھاھاکار مچائے رکھتے ہیں اور ان کی تادیب وتعزیر کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں گنواتے۔ آپ آج سوڈان، ایران، سعودی عرب، بنگلہ دیش، مصر، صومالیہ، انڈونیشیا کے خلاف ہر طرف میڈیا پراپیگنڈا دیکھتے ہیں، جبکہ یہی انسانی حقوق اگر ہندوستان، روس، اسرائیل، اور خود یورپ کے دل فرانس میں پامال ہورہے ہوں تو ان کا کوئی ذکر تک نہیں سنتے اور نہ ہی جن لوگوں کے مذہبی اور انسانی حقوق پامال ہوتے ہیں ان کو انسان سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک تو رہا ان کی انسانی حقوق سے متعلق درد دل کا قصہ، اگر آپ انسانی حقوق کی سربلندی اور سرافرازی کے مناظر دیکھنا چاہیں تو حقوق بشر کے علمبردار ان ممالک میں جا کر دیکھیں جہاں نہ تو خواتین محفوظ ہیں، نہ بچے، نہ چرچ محفوظ ہیں نہ مساجد، یہاں تک کہ اسکولوں اور مدرسوں تک کا کوئی تقدس نہیں۔ بچے گلیوں اور شراب خانوں میں تباہ حال پھرتے ہیں جہاں ان کا بدترین استحصال کیا جاتا ہے۔

خواتین سے گھروں، فیکٹریوں اور دفتروں میں سخت کام بھی لیا جاتا ہے اور ان کا جنسی استحصال بھی کیا جاتا ہے۔بوڑھوں کے حقوق کا یہ حال ہے کہ انہیں اٹھا کر کوڑ کباڑ کی طرح اولڈ ایج ہومز میں پھینک دیا جاتا ہے جہاں ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا اور وہ اپنی تنہائیاں اور وحشتیں دور کرنے کے لیے کتوں اور بلیوں سے انس کا سہارا لینے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ رہے مزدور تو وہ بھی بُری طرح سرمایہ داری نظام کے استحصال کا شکار بنتے ہیں۔ ان

☆ بشکریہ گزارش گفتگو، شمارہ ۱۲، مہرماہ ۱۳۸۳ شمسی

Marfat.com

سے سخت ترین مشقت لی جاتی ہے اور معاوضہ اتنا دیا جاتا ہے کہ زندہ رہ سکیں۔ جو کچھ وہ بچاتے ہیں وہ اپنے اوپر شدید جبر کر کے بچا لیتے ہیں۔ سودی نظام کا استحصال اس کے علاوہ ہے۔ ان لوگوں کو قرضے لے کر سہولتیں حاصل کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے اور ایک طرف سے سرمایہ دار اپنی پراڈکٹس بیچتے ہیں تو دوسری طرف سود سے عوام کی کمر توڑ دیتے ہیں۔ ایسا کون ہے جو یورپ اور امریکہ میں Mark up، Interest، اور نام نہاد Profit کے شیطانی چکروں میں الجھا ہوا نہ ہو۔ گاڑی لیں یا مکان، فرنیچر لیں یا روزمرہ استعمال کی اشیاء آپ کو سودی چکر سے نجات نہیں۔ یہ انسانیت کے بدترین اقتصادی استحصال اور حقوق انسانی کی پامالی کی شکل ہے۔ سیاسی استحصال اس کے علاوہ ہے۔ جس جمہوریت کا چرچا کرتے نہیں تھکتے اس جمہوریت کا سارا نظام ہی پاپ سنگروں، کرکٹ سٹاروں، گلوکاراؤں، اور مائیکل جیکسنوں کا مرہون منت ہے۔ سیاستدان وہاں ووٹروں پر مذکورہ ذرائع سے اثرانداز ہوکر اقتدار کے سنگھاسن پر جا بیٹھتے ہیں۔ کسی کو آزادانہ، خودمختارانہ اور غیر جانبدارانہ طور پر ووٹ کا استعمال نہیں کرنے دیا جاتا۔ یہی جمہوریت ہے ان کی جس میں بقول اقبال افراد کو گنتے ہیں تولتے نہیں۔ یہ تو ان کے استحصالی نظاموں کا ایک خلاصہ اور ان کے حقوق انسانی کی عملی تصویر تھی۔ انہی نظاموں کے خالق اور کرتا دھرتا حقوق انسانی کے علمبردار بنے بیٹھے ہیں۔ طرفہ تماشا ہے اسے کیا کہیے!

دوسری طرف دین اسلام ہے جو حفظ حقوق انسانی کا داعی اور علمبردار ہے۔ اس نے آج سے پندرہ سو برس پہلے میثاق مدینہ اور خطبۂ حجۃ الوداع کی صورت میں انسانی حقوق کا بین الاقوامی چارٹر پیش کر دیا تھا۔ اگر آپ اقوام متحدہ کے منشور حقوق انسانی کا مطالعہ کر لیں تو اسے اسی الہامی اسلامی چارٹر کے مرکزی نکات کا چربہ یا عکس پائیں گے جو صدیوں پہلے رسول عربیؐ نے پیش کیا تھا یعنی اس میں کوئی جدت، اپج یا نیا پن نہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم ایران اسلامی میں انسانی حقوق کی بحث کی طرف آئیں ہمیں خطبۂ حجۃ الوداع میں پیش کردہ منشور انسانی حقوق کا اقوام متحدہ کے چارٹر سے مقابلہ کر کے ایک مختصر جائزہ لینا ہوگا۔

حضور کریمؐ نے مومن کو مومن کا بھائی قرار دیتے ہوئے ان کی جان، مال، عزت و آبرو کو ایک دوسرے پر حرام قرار دیا، بالکل ویسے ہی جیسے کہ حج اکبر کا وہ دن اور ذی الحجہ کا وہ مہینہ محترم دنوں اور مقدس مہینوں میں سے ہیں۔ آپؐ نے سود کو حرام قرار دیا کہ یہ دوسروں پر تجاوز اور خدا اور رسولؐ سے جنگ ہے۔ آپ نے خون انسانی کی حرمت پر تاکید کی۔ خواتین کے حقوق پر زور دیا۔ ان سے نیک سلوک کا حکم دیا الا یہ کہ وہ فحشاء، منکرات اور برائیوں کی

Marfat.com

مرتکب ہوں۔ آپ نے بیویوں کو امانت خدا قرار دیا جو کلمات خدا کے حوالے سے حلال ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح آپ نے امانتوں کو صاحبان امانت تک پہنچانے کا حکم فرمایا۔ آپ نے رنگ و نسل کی تفریق اور تعصب سے منع فرمایا۔ انسانی مساوات کا حکم دیتے ہوئے فرمایا کہ گورے کو کالے اور عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں۔ خدا کے نزدیک عزت دار وہ ہے جس کا تقویٰ زیادہ ہو۔ اب آیئے اقوام متحدہ کے چارٹر کی طرف جس کے ۳۰ آرٹیکل ہیں اور ان کے مطابق سب انسان بنیادی حقوق میں برابر ہیں اور انہیں بھائی چارے کی بنیاد پر ایک دوسرے سے سلوک روا رکھنا چاہیے، یعنی سب کو نسل، زبان، رنگ، مذہب اور قومیت سے قطع نظر مساوی حقوق حاصل ہیں۔ سب کو زندگی، آزادی اور امن سے رہنے کا حق حاصل ہے۔ غلامی کی اجازت نہیں۔ کسی پر ظلم و تشدد نہ ہوگا اور کسی کی بے عزتی نہ ہوگی۔ سب کو برابر کا قانونی تحفظ حاصل ہوگا۔ سب کو حقوق انسانی کے مخالف اقدام کے خلاف غیر جانبدار عدلیہ کا تحفظ حاصل ہوگا۔ جب تک کوئی جرم ثابت نہ ہو افراد کو بے گناہ تصور کیا جائے گا۔ انسانوں کو نقل و حرکت، رہائش اور دوسرے ممالک میں سیاسی پناہ کی آزادی ہے۔ ہر شخص کو قومیت کا حق حاصل ہے۔ پسند کی ازدواج کی آزادی ہے۔ خاندان کو معاشرتی اور حکومتی تحفظ حاصل ہوگا۔ ہر کسی کو ملکیت رکھنے کا حق حاصل ہے اور اسے اس سے محروم نہ کیا جائے گا۔ لوگوں کو رائے، فکر، ضمیر اور مذہب کی آزادی حاصل ہوگی۔ نیز پرامن اجتماع، ووٹ دینے اور حکومت میں شرکت کا حق بھی حاصل ہے۔ معاشرتی تحفظ، نیز ہنر، تعلیم اور کام کے انتخاب کا حق ہوگا۔ آرام اور فرصت کے ساتھ ساتھ ساعات کار کے تعین اور تنخواہ کے ہمراہ مدتی چھٹیوں کا حق ہے، حفظان صحت کا حق نیز زچہ و بچہ کو دیکھ بھال اور تحفظ حاصل رہے گا۔ مفت بنیادی تعلیم کا حق حاصل ہوگا۔ والدین کو حق حاصل ہوگا کہ اپنی اولاد کو جیسی تعلیم بھی دلوانا چاہیں، دلوائیں۔ آپ نے ملاحظہ کیا کہ حقوق کا جو نقشہ دین اسلام نے اور حجۃ الوداع کے موقع پر پیغمبر اسلامؐ نے پیش کیا تھا بنیادی طور پر اسی کو اقوام متحدہ نے تمام اقوام کی موافقت سے اختیار کیا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ اسلام مکمل بلکہ اکمل اور جامع دین ہے جس نے انسانی ضروریات کا ہر طرح احاطہ کیا ہوا ہے۔ چنانچہ جمہوری اسلامی ایران جس کا نظام اسلام اور قرآن پر مبنی ہے اپنے آئین، سرکاری قوانین، اور حقوق بشر کے حوالے سے ایک ترقی یافتہ ملک ہے، اور انقلاب اسلامی کے بعد وہاں نہایت جامع انداز میں اس ضمن میں کام ہو رہا ہے۔

اسلامی جمہوریہ ایران میں انسانی حقوق کی حفاظت و صیانت سے متعلق امور اور قوانین کو ہم نکتہ وار پیش کرتے ہیں جس سے ایک اسلامی فلاحی ریاست کا نقشہ سامنے آئے گا۔

Marfat.com

اقلیتوں کے حقوق

فقہ جعفری صدیوں سے اجتہاد کی راہ طے کر رہی ہے، اور آج بھی معاصر مسائل میں اجتہاد کر کے زندہ، حی، اعلم مجتہد نظام اسلامی کو رکود اور جمود سے نجات دیتے ہوئے رواں دواں رکھتے ہیں۔ لہٰذا پہلے تو اقلیتوں کی مشکلات کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے اور ساتھ ہی صدر مملکت نے تمام حکومتی اداروں کو ایک سرکلر کے ذریعے حکم دیا کہ وہ ملازمتوں میں انتخاب کے وقت اقلیتوں کے حقوق کا خیال رکھیں۔ اسی طرح پارلیمنٹ (مجلس شورائے اسلامی) اور عدلیہ میں اقلیتوں کے انسانی حقوق کے تحفظ سے متعلق اقدامات کیے جا رہے ہیں۔

چونکہ بعض مجتہدین عظام جن میں آیت اللہ یوسف صانعی، آیت اللہ نوری ہمدانی اور ناصر مکارم شیرازی شامل ہیں کے فتاویٰ کی بنیاد پر ذمی کی دیت مسلمان کے برابر ہے اس بنا پر مجلس نے قانون تعزیرات اسلامی کے آرٹیکل نمبر ۲۹۷ میں اس مسئلے کو قانونی حیثیت دے دی ہے۔

خواتین کی حالت

اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی موضوعات کو جنس کے زاویہ نگاہ سے تیسرے پنجسالہ منصوبے میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اسی طرح مرکز امور شرکت زنان کے وسیلے سے خواتین کے لیے جامع قانونی اور عدالتی نظام کا پلان بھی تیار کیا گیا ہے، جبکہ خواتین کے خلاف تشدد اور مارپیٹ کے قانون کی بھی اصلاح کی گئی ہے نیز خواتین پر تشدد کے خلاف جنگ اور تشدد کی شکار خواتین کی حمایت کے پروگرام ترتیب دیے گئے ہیں۔ مزید برآں خواتین پر تشدد کے خاتمے کے لیے وزارت صحت و تعلیم میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے۔ جبکہ مقامی بجٹوں میں خواتین کی ترقی سے متعلق خاص فنڈ بھی مختص کیے گئے ہیں۔

مجلس میں خواتین کے خلاف ہر قسم کے تعصب کے خاتمے سے متعلق کنونشن میں ایران کی شمولیت سے متعلق ایک بل بھی پیش کر دیا گیا ہے۔ تمام وزارتوں میں خواتین یونٹوں کی تعداد کی افزائش اور صدر کے دفتر برائے امور زنان کی بہ عنوان دفتر شرکت خواتین اپ گریڈنگ اور نیز اسی مرکز میں قومی کمیٹی برائے حلِ مشکلاتِ خواتین بھی عمل میں آچکی ہے۔ ۱۹۹۷ء میں خواتین سے متعلق این جی اوز کی تعداد ۶۷ تھی جبکہ یہ تعداد بڑھ کر ۲۰۰۱ء میں ۲۴۸ ہوگئی۔ اسی طرح اداروں کی سربراہ خواتین کی تعداد میں بھی خصوصاً گذشتہ پانچ سالوں کے دوران ۵،۵ فیصد کا اضافہ ہو چکا ہے اور یہ بڑھوتری زیادہ تر وزرات صحت اور خزانہ میں ہوئی ہے۔ یونیورسٹیوں کے علمی بورڈز کی ۳۴ فیصد ارکان خواتین ہیں جبکہ یونیورسٹیوں میں داخلہ لینے والے طالب علموں کا ۶۴ فیصد حصہ طالبات پر مشتمل ہوتا ہے۔ گذشتہ پانچ

Marfat.com

سالوں میں پرائمری سطح پر تعلیمی اداروں میں طالبات کی شرح داخلہ ۸۰ فیصد سے بڑھ کر ۹۶ فیصد ہوچکی ہے۔ ملک بھر میں تقریباً ۱۷ مجلّے خواتین شائع کرتی ہیں جبکہ ۸۹ مجلوں اور روزناموں کی ایڈیٹرز بھی خواتین ہی ہیں۔موجودہ دور میں خواتین کی غربت و افلاس دور کرنے، ان کو اقتصادی خودمختاری دلانے اور ان میں سیلف ایمپلائمنٹ کی حوصلہ افزائی کے لیے ۲۱ این جی اوز مشغول کار ہیں۔ لڑکیوں کے لیے شادی کی عمر کم سے کم ۹ سال سے بڑھا کر ۱۳ سال کردینے کا قانون نافذ ہوچکا ہے۔ ملک میں خواتین کی بے روزگاری کی شرح ۱۸٫۹ فیصد ہے۔ موجودہ سال میں خواتین کی سرگرمیوں میں اضافے کے لیے بجٹ میں ۲۷۰ ارب ریال امورِ خواتین کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں۔ موجودہ صورت میں ملک میں قابل تعلیم لڑکیوں کو ۶۰ فیصد سے زیادہ کوریج دی گئی ہے اور اعلیٰ تعلیم کے لیے داخلہ لینے والی طالبات طلبا امیدواروں کی کل تعداد کا ۶۲ فیصد ہیں۔ خانہ دار خواتین کا بیمہ پلان جو ملک بھر کے ۵۲ شہروں میں نافذ ہوچکا ہے اس کے تحت اس سال کے آخر تک اکیس ہزار خواتین کا بیمہ کیا جاچکا ہے۔ موجودہ سال کے آخر تک پرائمری اور مڈل سطح تک کی ۶۰ فیصد طالبات کو سن بلوغ اور دورانیہ حمل کے بارے میں تعلیم دی جائے گی۔اس وقت مجلس شورائے اسلامی میں ۱۳ خواتین ارکان موجود ہیں۔ پارلیمنٹ کی رکن خواتین نے آئندہ پانچ سالہ ترقیاتی منصوبے میں خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے ایک پارلمانی پارٹی تشکیل دی ہے۔ پارلیمنٹ کے انتخابات سے متعلق اعداد و شمار کے مطابق اسمبلیوں کے ۲ لاکھ ۴۴ ہزار امیدواروں میں سے ۶٫۲ فیصد خواتین ہیں اور یہ تعداد گزشتہ انتخابات کی نسبت نصف فیصد زیادہ ہوگئی ہے۔ اسی طرح خواتین امیدواروں کی کل تعداد ۵۷۸۳ تک پہنچ گئی ہے۔ مرکز امور شرکتِ خواتین نے وزارت تعلیم کے تعاون سے خواتین سے متعلق معاشرتی نقطۂ نظر کی اصلاح کے لیے ایک منصوبہ نافذ کردیا ہے۔ خواتین کے انسانی حقوق کی تعلیم کے لیے پروگرام جاری کردیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں تہران یونیورسٹی میں حقوق انسانی کے مضمون میں ایم فل کے کورس کا آغاز ہوچکا ہے۔ علاوہ ازیں خواتین کے انسانی حقوق اور ان پر تشدد کے خاتمے نیز تشدد کی شکار خواتین کی مدد کے لیے مختلف ورکشاپیں منعقد کی جارہی ہیں۔ تھانوں اور بڑے شہروں میں خصوصی خواتین سنٹروں کا قیام عمل میں آچکا ہے۔ اکتوبر ۲۰۰۴ء سے ۲۰۰ پولیس ویمن کی خدمات انتظامیہ کے حوالے ہوچکی ہیں۔ اس طرح انقلاب اسلامی کے بعد پہلی بار زنانہ پولیس سے استفادہ ہورہا ہے۔ایک معاہدے کی رو سے UNDP کے ساتھ مشترکہ منصوبے کے تحت معاشرے میں خواتین کے کردار کو تقویت پہنچائی جائے گی۔ خواتین کے قانونی اور عدالتی حقوق کے منصوبے کو

Marfat.com

تسلسل دینے کے علاوہ ملازمت پیشہ خواتین کی مشکلات حل کرنے کے لیے ایک کمیٹی پہلے ہی تشکیل دی جاچکی ہے۔خواتین پر گھریلو تشدد کے مطالعے کے قومی منصوبے کو جاری رکھا گیا ہے۔ طالبات کو ان کے قانونی حقوق کی تعلیم دینے کا منصوبہ نافذ کردیا گیا ہے۔ ورکر خواتین اور گھرانوں کے پنشن سے متعلق قانون کی شق نمبر ۱۲ میں ترمیم کردی گئی ہے۔

اولاد کے لیے ماں کی سرپرستی کے بل کی منظوری

اس بل کی رو سے ۷ سال کی عمر تک ہر جنس کے بچے کو ماں کی پر مہر و محبت گود میں رہنے کا حق حاصل ہوگا۔

خواتین کے خلاف ہر قسم کا تعصب روکنے سے متعلق کنونشن

خواتین کے خلاف ہر قسم کا تعصب ختم کرنے سے متعلق عالمی کنونشن میں شامل ہونے کا نہ صرف بل مجلس شورائے اسلامی میں پیش کیا جاچکا ہے بلکہ اسمبلی کی ثقافتی و معاشرتی امور کی کمیٹی اس پر غور و فکر کا عمل بھی مکمل کر چکی ہے اور اسے مجلس کی کاروائی کا حصہ قرار دے دیا گیا ہے۔

مجلس میں خواتین کے لیے طلاق کے برابر حق کے بل کی منظوری

مجلس شورائے اسلامی نے خواتین کے لیے مردوں کے برابر طلاق کے حقوق کا بل منظور کرلیا ہے۔

بچوں کے حقوق

بچوں کے حقوق کی (بین الاقوامی) کمیٹی نے بچوں کے بقاء اور رشد و ترقی و حمایت کے سلسلے میں ۱۹۹۰ء میں سربراہان ممالک کے جلسے کے اعلامیے کے بڑے اہداف و مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے بارے میں ایران کی تعریف کی ہے۔یونیسیف کے تعاون سے حقوق اطفال کا اجتماع تہران میں منعقد کیا گیا جسے عالمی بینک کے سربراہ نے سراہا۔ اسلامی جمہوریہ ایران میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جس کو ۱۹۹۰ء میں بچوں کے سلسلے میں عالمی سربراہان مملکت کے اجلاس کے نتائج کو نافذ کرنے کا جائزہ لینا تھا۔ اس کمیٹی نے شہریور ۱۳۷۹ شمسی میں اپنی رپورٹ پیش کردی جسے عالمی بینک نے بے حد سراہا۔ ملکی ادارہ برائے تعلیم کے تعاون سے سربراہان مملکت کے اجلاس میں شرکت کے لیے بچوں کے نمائندوں کا انتخاب کیا گیا اس موثر شرکت کی بناء پر ایران کی بڑی سواگت ہوئی۔ بچوں کے حقوق کی کمیٹی نے وزارت خارجہ کے زیر نظر حقوق اطفال پر پہلی رپورٹ پیش کی۔ اسلامی جمہوریہ ایران اقوام متحدہ کے کنونشن ۱۸۲

Marfat.com

اور بچوں کے بدترین استحصال کے خاتمہ سے متعلق قانون کی پہلے ہی توثیق کرچکا تھا۔عدلیہ میں عورتوں اور بچوں کی حمایت اور امداد کے لیے ایک دفتر بنایا گیا اور ایک سرکلر کے ذریعے تمام صوبوں کے اعلیٰ عدالتی حکام کو صوبائی سطح پر ایسے دفاتر بنانے کی ہدایت کی گئی۔ یہ دفاتر مظلوم بچوں، عورتوں اور جوانوں کے مقدمات پر نظر رکھیں گے اور ان کے جلد فیصلے کے لیے سعی کریں گے۔ انقلاب اسلامی کے بعد ایران میں ترقی یافتہ ترین قوانین میں سے ایک بچوں اور نوجوانوں کی عدالتوں کی تشکیل کے بل کا ڈرافٹ کا تیار کیا جانا تھا جو دو سال کی مدت میں سپریم کورٹ، یونیورسٹی پروفیسرز اور دفتر یونیسیف کے باہمی تعاون سے تدوین کیا گیا اور عدلیہ کے اعلیٰ حکام کے اجلاس میں اس پر بحث ہوئی اور اس میں سے بعض شقیں منظور کرلی گئیں۔ عدلیہ کی فائنل منظوری کے بعد اسے اسمبلی میں پیش کردیا جائے گا۔

حقوق انسانی کے سلسلے میں تعاون

ایسی حالت میں جبکہ عالمی کمیشن برائے انسانی حقوق نے ایران کی طرف سے حقوق انسانی کی قرارداد کو منظور نہیں کیا اسلامی جمہوریہ ایران نے اس امر کو ثابت کرنے کے لیے قراردادوں کی منظوری، جو زیادہ تر سیاسی محرکات کی وجہ سے پیش اور منظور کیے جاتے ہیں، اور اپنی ثقافتی اور تمدنی عقائد کی بنیاد پر انسانی حقوق کے ارتقاء میں مدد دینے کے لیے ملک کے اندر اور باہر کے اداروں سے نہ صرف تعاون کا عندیہ دیا ہے بلکہ اس سلسلے میں بعض مثبت اقدامات بھی کیے ہیں جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

حقوق انسانی کے اداروں سے موضوعاتی پالیسیوں کے فریم ورک میں تعاون

ایران نے انسانی حقوق کے اداروں کے مختلف موضوعات پر رپورٹرز اور کارکنوں کو ایران آنے کی کھلی اور عام دعوت دی ہے۔ اس دعوت کے بعد لاک اپ اور جبری طور پر غائب شدگان اور عورتوں پر تشدد کے رپورٹرز نیز حقوق انسانی کے ہائی کمشنر کی فنی اور مشاورتی خدمات کی کمیٹی کی ایران آمد کے لیے مناسب طور پر زمین ہموار کردی گئی جس سے ان کو وزیٹ کا موقع ملا۔

یورپین یونین سے حقوق انسانی کے سلسلے میں تعاون اور مذاکرات

اس سلسلے میں فریقین نے تعمیری مذاکرات انجام دیے اور حقوق انسانی کے آئندہ مذاکرات کے پروگراموں کو منظم کیا۔ یورپ کے ساتھ مذاکرات کے سلسلے میں حقوق انسانی کی پہلی گول میز کانفرنس اس سال تہران میں منعقد ہوئی جسے شریک وفود نے بے حد سراہا۔ امید

Marfat.com

ہے جلد ہی دوسری کانفرنس بھی منعقد ہوگی۔

حقوق انسانی کے سلسلے میں دوطرفہ تعاون

اس سلسلے میں مختلف ممالک منجملہ جاپان اور آسٹریلیا سے تعمیری مذاکرات اور تعاون کی فضا تیار کرلی گئی ہے اور اس موضوع پر چند اور دوطرفہ تعاون نیز اقوام متحدہ کے مختلف اداروں سے مکمل تعاون کیا گیا جبکہ ایران کی طرف سے کوئی قرارداد بھی موجود نہیں تھی۔

مجلس شورائے اسلامی میں حقوق انسانی کی کمیٹی کا قیام

ایک قسم کی مصلحت اندیشی سے کام لیتے ہوئے ایرانی عدلیہ کے سربراہ نے سنگساری کی سزا کے حکم کو متوقف کردیا۔

مجلس میں ایذا رسانی روکنے کے لیے منصوبہ

مذکورہ منصوبے کو جو پہلے مجلس کی منظوری سے آئین کا حصہ بن گیا تھا شورائے نگہبان نے زیادہ مصادیق شامل کرنے کے بعد دوبارہ مجلس کو بھیج دیا تھا۔اس پر دقیق غور وخوض کے بعد مجلس نے اسے دوبارہ شورائے نگہبان میں بھیج دیا جس نے اس پر دوبارہ اعتراضات کر کے اسے مجلس کی طرف پلٹا دیا۔ اسی بنیاد پر ایذا رسانی اور عقوبت کی روک تھام سے متعلق منصوبے پر مصلحت نظام کی تشخیص کا ادارہ ضروری فیصلے کرے گا۔

اسلامی سزاؤں کے قانون کے آرٹیکل نمبر ۵۷۰ میں ترمیم

اس ترمیم میں یہ آیا ہے کہ حکومتی اداروں اور مختلف محکموں میں جو حکام یا قانون کے برخلاف افراد کی شخصی آزادی سلب کریں گے یا انہیں آئین کے تحت دیے گئے حقوق سے محروم کریں گے انہیں برطرف کیے جانے اور ایک سے پانچ سال تک حکومتی کاموں سے روکے جانے کے علاوہ ۲ ماہ سے لے کر ۳ سال تک کی سزائے قید بھی دی جاسکے گی۔

خواتین کے خلاف تعصب کی تمام صورتوں کے کنونشن میں ایران کی شمولیت

مرداد ماہ ۱۳۸۲ شمسی میں مجلس شورائے اسلامی نے ایران کے مذکورہ کنونشن میں شمولیت کی منظوری دی ۔ اس کنونشن میں اس بات کی شرط لگا دی گئی ہے کہ یہ کنونشن اسلامی شرعی احکام کے خلاف نہ ہونے کی صورت میں نافذ ہوگا۔ چنانچہ شورائے نگہبان اس قانون کی اسلامی حیثیت کا جائزہ لے کر اس پر رائے دے گی۔

خانہ دار خواتین کا اجتماعی بیمہ

دفتر امور خواتین کے ڈائریکٹر جنرل نے اعلان کیا ہے کہ موجودہ سال میں تمام

Marfat.com

صوبوں کے ایک یا دو ضلعوں کی خانہ دار خواتین اجتماعی بیمے سے مستفید ہوں گی۔ اس بیمے کا آدھا حصہ حکومت اور آدھا بیمہ شدہ خواتین ادا کریں گی۔ اس کے علاوہ خواتین کی ثقافتی معاشرتی شورئی میں خواتین منشور پر فائنل غور و خوض نیز قرآن، سنت اور قوانین میں خواتین کے بنیادی کردار کے حوالے سے اسلامی جمہوریہ ایران میں خواتین کے حقوق اور ذمہ داریوں کا منشور تیار کرلیا گیا ہے۔ اس منشور میں زمان و مکان کے تقاضوں کے علاوہ خواتین کی ذمہ داریوں اور ان کی انسانی حرمت کو واضح کردیا گیا ہے اور یہ منشور بین الاقوامی برادری کو نظام اسلام میں خواتین کے مقام سے روشناس کراسکتا ہے۔

دفتر حمایت خواتین و بچگان

خواتین کے ادارۂ مشارکت کے قانونی مرکز کے اعلان کے مطابق عدلیہ کے حکم نامہ نمبر ۸۱/۱۰/۱۸ کی رو سے تمام صوبوں میں دفتر حمایت خواتین و بچگان کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔

حاملہ خواتین کی طبّی چھٹی

کابینہ کے حکم نامے نمبر ۸۲/۷/۲۴ کے مطابق حاملہ خواتین اپنے زمانۂ حمل کے دوران معالج کی سفارش پر ۴ ماہ تک کی چھٹی کی حقدار ہوں گی اور یہ چھٹی ان کی عام طبی تعطیلات کے علاوہ ہونگی۔

ہوم ایڈمنسٹریشن کے امتحان میں کنکور (مقابلے کے امتحان) کے بغیر شرکت

سیکریٹری تعلیم و تحقیقات برائے مرکز امور مشاورت قوانین کے اعلان کے مطابق اس مرکز کے اور دانشگاہ جامع علمی کی مسلسل کوششوں سے خواتین کی علمی و ثقافتی ارتقاء کے لیے ہوم ایڈمنسٹریشن کی مہارت کا کورس منظور کرلیا گیا ہے۔

آئندہ سالوں میں خواتین کی بے روزگاری میں کمی

ایک تحقیق کے مطابق ۱۳۸۳ شمسی میں خواتین کے روزگار کی شرح ۱۱٫۹ فیصد اور بے روزگاری ۱۲٫۹ فیصد تک پہنچ جائے گی۔

۶ سال سے کم عمر بچوں کے لیے مفت غذا

امداد امام خمینی کمیٹی نے وزارت صحت کے تعاون سے چھ سال سے کم عمر کے بچوں جو کم خوارگی Malnuitrition کی شکار حاملہ خواتین کو مفت غذا فراہم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

Marfat.com

اہواز میں خواتین اور بچوں کے قانونی دفتر کی تشکیل

اس دفتر کا کام مفت قانونی مشورے اور لیگل سروس فراہم کرنا ہے۔

سڑکوں پر کام کرنے والے بچوں کے لیے مہمان خانہ

تہران میں سڑک پر کام کرنے والے بچوں کے لیے ایک مہمان خانہ بنام ''سلامت'' کھل چکا ہے اس میں ۱۲ سے ۱۸ سال کے بچوں کو (بشرطیکہ وہ کام کاج میں مشغول ہوں) ۵ بجے شام سے صبح ۷ بجے تک رہائش کی سہولت حاصل ہوگی اور اس دوران انہیں دو وقت کا کھانا بھی دیا جائے گا۔

مندرجہ بالا امور سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ انقلاب اسلامی کے بعد ایران ایک مکمل فلاحی ریاست بنتے جارہا ہے جس میں اقلیتوں سے لے کر طلبا، مزدوروں، خواتین، بچوں اور بوڑھوں کو مکمل تحفظ مل رہا ہے اور ملے گا، نیز ملک اور قوم کے وسائل خود انہیں پر صرف کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار رفاہی کام حکومت، بنیاد شہید اور امام خمینی امدادی کمیٹی انجام دے رہی ہے جس میں بچوں کی تعلیم سے لے کر بیواؤں کی مدد اور غریب بچیوں کے لیے جہیز کی فراہمی تک سب کچھ شامل ہے۔ کلی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی جمہوریہ ایران اسلام کے رفاہی، اخلاقی، مجلسی اور تعاونی قدروں کا ایک عملی نمونہ ہے جس میں حکومت، اس کے مختلف آرگن، رفاہی ادارے، نیم سرکاری ادارے سب مل کر عوام کے بہبود کی کاوشوں میں مصروف ہیں اور انسانی حقوق کے نام نہاد علمبرداروں کے پروپیگنڈا کے برعکس یہاں اسلامی قدروں اور شرف کرامت انسانی کا ہر لحاظ سے احترام کیا جاتا ہے جو ثناخوانان تقدیس مشرق کے لیے ایک قابل دید نمونہ جبکہ عالمی استعمار کے لیے مقام اصلاح احوال ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

بابا فغانی شیرازی کا شہرہ پاک و ہند میں

پروفیسر ڈاکٹر انعام الحق کوثر☆

مرغی کہ دارد از چمن آسمان نصیب
گر دانہ نیافت ز کشت زمین چہ باک
(فغانی)

فغانی نویں صدی ہجری کے وسط میں شیراز میں پیدا ہوا۔ اس کے والد معمولی حیثیت کے آدمی تھے اور چاقو وغیرہ بناتے تھے۔ بھائی کی بھی چاقو سازی کی دوکان تھی۔ یہ بھی چاقو بنانے کی طرف مائل ہوا۔ اسی مناسبت سے سکا کی تخلص رکھا جسے بعد میں بدل کر فغانی کیا۔ تذکرہ نویس فغانی کے اپنے باپ اور استاد کے ناموں اور ابتدائی تعلیم کے متعلق بالکل خاموش ہیں۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ فغانی کی طبیعت ابتداء ہی سے شعر گوئی کی طرف مائل تھی۔ ایک مدت تک شیراز میں قیام پذیر رہنے کے بعد اس نے سیر و سیاحت کا ارادہ کیا۔ پہلے خراسان پہنچا اور وہاں سے ہرات کا رخ کیا۔ نویں صدی ہجری کے آخر میں ایران کی سرزمین دو حصوں میں منقسم تھی اور ان دو حصوں پر دو مختلف خاندانوں کے اقبال کے پرچم لہرا رہے تھے۔ ایران کے مشرق میں تیموری سلاطین برسراقتدار تھے اور ان کا پایۂ تخت ہرات تھا۔ مغربی ایران پر پہلے ترکمان قویونلو پھر ترکمان آق قویونلو حکومت کرتے تھے اور ان کا دارالسلطنت تبریز تھا۔

سلطان حسین مرزا (۱۵۰۶-۱۴۶۹ء/۹۱۱-۸۷۲ھ) کا دربار اسلامی علم و فضل اور فنون لطیفہ کا بہت ہی مردم خیز اور علم افروز ادارہ تھا جہاں میر علی شیر نوائی اور مولانا جامی موجود تھے۔ ہرات کے مکتب خیال پر مولانا جامی چھائے ہوئے تھے اور وہ قدیم روایات و اقدار کے حامل تھے۔ چنانچہ جس وقت فغانی ہرات پہنچا تو ہرات کے شعراء کو اس کی نئی طرز اور تازہ روش پسند نہ آئی۔(۲) فغانی کی مولانا جامی سے بھی ملاقات ہوئی لیکن انہوں نے بھی اس کی

☆ ۲۷۲، اے ۔او بلاک III، سیٹلائٹ ٹاؤن، کوئٹہ

Marfat.com

کوئی حوصلہ افزائی نہ کی۔(۳)

ہرات سے ناامید اور مایوس ہو کر فغانی نے تبریز کا رخ کیا۔ وہاں ان ایام میں سلطان یعقوب آق قویونلو(۸۸۳۔۸۰۶ھ/۱۴۹۰۔۱۴۷۷ء) کی حکومت تھی۔ منجم باشی یعقوب کی تعریف میں رقم طراز ہے کہ وہ مے و مستی اور خوش باشی کا دلدادہ اور شعر و شاعری کا بڑا شائق تھا۔ بہت سے شعراء اطراف و جوانب سے اس کے دربار میں جمع ہوتے اور اس کی شان میں دھوم دھام سے قصیدے لکھ کر لاتے۔(۴) کچھ روز تبریز میں رہنے کے بعد فغانی سلطان یعقوب کے دربار میں باریاب ہوا اور الطاف خسروانہ سے نوازا گیا۔(۵) خصوصی مقام حاصل ہوا اور درباری شعراء کی لڑی میں منسلک ہوگیا۔ آہستہ آہستہ زیادہ سے زیادہ قرب حاصل کرتا گیا۔ چنانچہ سلطان نے فغانی کو بابائے شعراء کے خطاب سے نوازا۔ ان دنوں فغانی کو ہر قسم کی سہولتیں میسر آئیں اور وہ فارغ البالی سے زندگی بسر کرنے ▪ اور اُسے اپنے جوہر دکھانے کا موقع خوب ہاتھ لگا۔ مولانا شبلی رقم طراز ہیں:(۶)

ایران کی شاعری میں عشقیہ شاعری تمام اصناف سخن پر غالب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملک حسن سے لبریز ہے۔ ایرانی خود حسین تھے۔ ساسانیوں کے زمانہ میں ترکی خون کی آمیزش ہوئی۔ غلامی کے رواج نے دور دور ممالک کی نسلیں ایران میں لا کر جمع کر دیں۔ ان کے اختلاط سے شراب حسن دو آتشہ سہ آتشہ بن گئی۔

بابا فغانی شیراز کے مہ جبینوں کے رکھ رکھاؤ سے تو واقف تھا ہی، تبریز میں ترک حسیناؤں سے بھی واسطہ پڑا۔ چنانچہ اس کے تخلیقی افکار میں مزید سوز و گداز (روح انسانی کے لطیف جذبات کے اظہار کا نام ہے) کی آمیزش ہوئی۔ تبریز کے ماحول نے اس پر چار چاند ▪ دیے۔ وہ گو ایرانی نژاد تھا تاہم تبریز کے ماحول میں جاگزیں تھا۔ اس کا سرپرست ترک تھا۔ لہٰذا وہ ایرانی شعراء کی بجائے ترک شعراء سے جا ملا۔

۸۹۶ھ میں سلطان یعقوب آق قویونلو نے وفات پائی۔(۷) بابا فغانی اس کی موت سے بے حد افسردہ ہوا اور مرثیہ لکھا جو یوں شروع ہوتا ہے:

چہ شد یا رب کہ خورشید درخشان بر نمی آید　　قیامت شد مگر آن ماہ تابان بر نمی آید

سلطان یعقوب کی وفات کے بعد آذربائیجان (جس کا صدر مقام تبریز تھا) میں شعر و شاعری کا آفتاب نصف النہار پر نہ رہا۔ رفتہ رفتہ سلطنت کے حصے بخرے ہوگئے۔ فغانی واپس شیراز آیا۔ اس کی تازہ گوئی اور رواں خیالی بعد میں بھی جولانیاں دکھاتی رہی لیکن اس کے دل سے تبریز کے دوستوں کی یاد کبھی محو نہ ہوئی۔ وہ خود کہتا ہے:

Marfat.com

فغانی در وطن ہر دم گلی از گلشنی دارد		ولی مرغ دلش در صحبت یاران تبریز است

فغانی شیراز سے پھر خراسان کی جانب چلا لیکن راستہ میں ابیورد ٹھہر گیا۔ اسی اثنا میں شاہ اسماعیل صفوی (۹۰۵ھ/۱۵۰۰-۱۴۹۹ء) تخت پر جلوہ فگن ہوا۔ آخر مستی و رندی کو چھوڑ کر اس نے آخرت کا توشہ جمع کرنے کی ٹھانی اور مشہد کی طرف روانہ ہوا۔ حضرت امام رضاؑ کی درگاہ کے متولی نے استقبال کیا اور فغانی کا یہ مطلع مہر مبارک پر کندہ کرایا:(۸)

گلی کہ یک ورقش آبروے نہ چمن است		نشان خاتم سلطان دین ابوالحسن است

مشہد ہی میں فغانی شیرازی نے ۹۲۵ھ میں وفات پائی(۹) بقول رامی:

ای وای فغانی سخنور مُرد و دل من ملول گردید
رامی بدو نوع گفت سالش در نہصد و بست و پنج بوجید

پروفیسر براؤن کے بقول ''فغانی ان شعراء میں سے ہے جنہوں نے اپنے ملک کے بجائے پاک و ہند کی سرزمین میں شہرت پائی''(۱۰) آج ہم اسی کو اپنا موضوع سخن بناتے ہیں اور ان حالات کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کے طفیل فغانی شیرازی ایران کے بجائے پاکستان اور ہندوستان میں زیادہ مقبول ہوا۔

اسلام کی آمد سے پیشتر ایران اور ہندوستان کے مابین نسلی اتحاد کی وجہ سے تمدنی اور ذہنی رشتہ موجود تھا۔ اسی وجہ سے چھٹی صدی سے لے کر چوتھی صدی قبل مسیح تک جب کیانی موجودہ مغربی پاکستان کے زیادہ حصہ پر حکمران رہے خراسان سے ہزاروں ایرانی خاندان ہجرت کر کے ملتان، لاہور اور دہلی میں سکونت پذیر ہوگئے۔(۱۱)

ساسانی اپنی عظمت کے ایام میں بھی کیانیوں سے شہنشاہی اور انتظامی امور اور تمدنی حلقۂ اثر واختیار میں کم تر تھے۔ کہنے کو وہ ایرانیت کے علمبردار تھے لیکن کیانیوں کے مقابلے میں وہ حقیر سایوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس لیے ایرانی تہذیب ان کے زیر اثر رو بہ انحطاط رہی۔ ان حالات میں ایک ایسی قوت محرکہ کی ضرورت تھی جس کے زیر اثر ایرانی نظام فکر میں گرمجوشی پیدا ہو اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا ملے۔ اس کمی کو اسلام نے پورا کیا جس کے غیر مبدل اور خودکار قوانین ارتقاء نے عرب کے مخصوص جغرافیائی محل وقوع کی بنا پر تین براعظموں یعنی ایشیا، یورپ اور افریقہ کے درمیان اور ازمنۂ قدیم کے تمدنی ورثہ اور ازمنۂ متوسط کی امکانی تخلیقی قوتوں کے مابین ایک سنگھم کا کام کیا۔(۱۲)

ان حقائق کے پیش نظر ایرانی اور پاکستانی رابطہ اسلام کے تحت نہ صرف قائم رہا بلکہ اس کو تقویت بھی ملی، کیونکہ ایرانی اختراعی اور تخلیقی قابلیت اسلام کے زیر اثر از سرنو اجاگر

Marfat.com

ہوئی۔ حتیٰ کہ اس کی رگوں میں نیا خون دوڑنے لگا اور اذیت دہ ساسانی زنجیریں ٹوٹ گئیں۔ اس طریقہ سے ایرانی نشأۃ ثانیہ کے لیے راہ ہموار ہوئی۔ اس نشأۃ ثانیہ کا تار و پود کیانی تہذیب سے مرتب ہوا جو ایرانی عظمت کا حقیقی عروج تھا۔

بسا اوقات تاریخ میں کسی خاص واقعہ کے بالواسطہ نتائج بلا واسطہ نتائج سے زیادہ دور رس ہوتے ہیں۔ تقریباً دو سو سال تک ایرانی اسلام کے تحت ترقی پسند مسلمانوں کے گروہوں سے خلط ملط رہے جن میں عربوں کی غالب اکثریت تھی۔ اس عرصے میں ساسانی تہذیب جاتی رہی اور ایرانیوں نے عربی زبان اور عربی تہذیب کو اختیار کیا۔ وہ عربی افواج میں شامل ہوئے۔ نئے مقبوضہ علاقوں جیسے سندھ اور ماوراء النہر میں عرب آباد کاروں کے دوش بدوش کام کیا۔ غرضیکہ ایرانیوں نے جہانگیری اور جہانداری اسلام میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

دو سو سال کے بعد عرب اثر نے ساسانیوں کی قائم کردہ اقدار کو ختم کیا اور ایرانیوں نے اپنے آپ کو جاننے اور جانچنے کی کوشش کی۔ اس 'جانچ' نے انہیں اپنی زبان اور تہذیب میں دلچسپی لینی سکھائی، حتیٰ کہ ایرانی ادب عالیہ، انتظام سلطنت اور عام تہذیب پر چھا گئے۔ سندھ کی فتح (۷۱۵ء) کے بعد اس سرزمین کے فاتحین اور مسلمان تہذیب کے علمبردار ترک اور افغان تھے جو سب کے سب ایرانی اثر سے بہرہ یاب تھے۔

محمود غزنوی نے اس ملک میں ایرانی تہذیب و تمدن کو ترقی دی اور فارسی شاعری کا مذاق عام ہوا۔ یہ سلسلہ دہلی کے سلاطین اور نامور خاندانوں کے ماتحت جاری رہا۔ اس اثنا میں ابوالفرج رونی، مسعود سعد سلمان اور امیر خسرو وغیرہ نامور شعراء گذرے۔ دہلی کے سلاطین کی سلطنت کے اختتام تک یہاں فارسی شاعری کا ایک معیار قائم ہو چکا تھا۔ جدید ایرانی نقادوں اور مستشرقوں نے یہاں کے فارسی شعراء کی تخلیقات کو بنظر تحقیر دیکھا ہے اور ان کی شاعری کو ''کوہ کندن'' و ''کاہ بر آوردن'' کہا ہے، کیونکہ یہ اسلوب کے اعتبار سے ''ہندوستانی'' ہے لیکن ان کے خیالات اور نظریات غلط تصور کیے گئے ہیں۔ یہ امر ناممکن ہے کہ پاکستان و ہند کے لکھنے والے ایران کے لکھنے والوں کی تقلید کریں۔ حقیقتاً ہمارے لکھنے والوں کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے نئے ماحول سے متاثر ہوئے اور بدیشی نہ رہے بلکہ انہوں نے اپنے آپ کو اپنے ملک کے مطابق ڈھال لیا۔ جیسے مسعود سعد سلمان لاہور سے دوری کی وجہ سے تڑپتا ہے:

دانی تو کہ با بند گرانم یارب دانی کہ ضعیف و ناتوانم یارب
شد در غم لوہور روانم یارب یارب کہ در آرزوی آنم یارب

Marfat.com

ایک اور قصیدہ میں یوں گویا ہے:

ای لاھور وبحک بی من چگونہ ای　　بی آفتاب روشن، روشن چگونہ ای

طالب آملی اپنے خیالات کو اس انداز میں پیش کرتا ہے:

خوشا لاھور و فیض آب لاھور　　بہ طاعت میل شیخ و شاب لاھور

ماحول کی عکاسی ہمیں ان قصائد میں بھی ملتی ہے جو محمود غزنوی کے زمانے میں لکھے گئے۔ محمود جب مہم کو سر کرنے کے لیے نکلتا تو اس کے ہمراہ شعراء کا ایک گروہ ہوتا۔ چنانچہ عنصری، فرخی اور عسجدی وغیرہ نے جو قصائد لکھے وہ پاک و ہند کے ماحول کی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ قصائد معلومات افزا اور تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ مثلاً فرخی کا وہ قصیدہ جو ''در ذکر سفر سومنات و قدح آن و شکستن منات و رجعت سلطان گوید'' کے زیر عنوان اس کے دیوان میں شامل ہے اور عسجدی کا یہ قصیدہ جو یوں شروع ہوتا ہے:

تا شاہ خسروان سفر سومنات کرد　　کردار خویش را علم معجزات کرد

متذکرہ بالا نظریات کے تابع اس ملک کے باشندے بلا امتیاز تمام شعراء کو پسند نہ کر سکتے تھے جو کہ ایران میں معروف تخلیق تھے۔ یہ ضروری نہ تھا کہ ایک فارسی شاعر جو کہ ایرانیوں میں ناپسند ہو وہ یہاں بھی غیر مقبول رہے بلکہ یہ عین ممکن تھا کہ ان کا غیر مقبول شاعر یہاں مقبول ہو جائے اگر وہ ہمارے ملکی اور فطری معیار پر پورا اترے۔

فغانی شیرازی ان شعراء میں سے ایک تھا جو ایرانیوں میں مقبول نہ ہوئے کیونکہ بنیادی طور پر وہ فارسی شاعری کی بعض قائم شدہ روایات اور نظریات سے اختلاف رکھتا تھا۔ اس نے اپنی بیشتر ادبی زندگی ترک سلطان یعقوب آق قویونلو کے ہاں گذاری تھی جس میں ایرانی اثر قبول کرنے کے باوجود اپنی نسل کے خواص اور تصورات موجود تھے۔ اس لیے فغانی بھی یقیناً ترک ادبی روایات سے جزوی طور پر متاثر ہوا۔ اس کی شاعری کی یہی حقیقت اس بات کی ذمہ دار ہے کہ وہ اپنے ملک میں مقبول نہیں ہوا۔ جدید ایران کے نامور نقاد رضا زادہ شفق نے اپنی کتاب *تاریخ ادبیات ایران* میں جو ۴۲۳ صفحات پر مشتمل ہے فغانی کو صرف دو سطور کے ذکر کا اہل سمجھا ہے۔

پاک و ہند کی سرزمین میں زیادہ عرصہ بلکہ اول تا آخر ترک اور افغان حکومت کرتے رہے۔ جنہوں نے ایرانیوں سے اثر قبول کیا تھا۔ انہوں نے اپنے آبائی ورثہ کو کاملاً ترک نہ کیا تھا اور یہاں کے ماحول کے مطابق فارسی شاعری کے چند مخصوص خیالات نے شہرت عام پائی تھی۔ اس لیے فغانی شیرازی کا یہاں قبولیت حاصل کرنا تعجب انگیز نہ تھا کیونکہ وہ ہمارے

Marfat.com

خیالات اور نظریات سے قریباً ہم آہنگ تھا۔

۹۰۵ھ میں ایران میں صفویوں کی حکومت کا آغاز ہوتا ہے۔ صفوی عہد میں صرف مذہبی اور اخلاقی ادبیات کی سرپرستی کی گئی۔ نثر میں اخلاقی کتابوں کا بازار گرم ہوا اور نظم میں مرثیہ گوئی کو فروغ ملا۔ اس کے برعکس پاکستان و ہند میں ہر صنف سخن خصوصاً غزل نے خوب ترقی کی کیونکہ حکومت کی جانب سے بہت زیادہ حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ جبھی تو ۹۰۰ھ کے لگ بھگ سلطان یعقوب کی وفات کے بعد تبریز میں طوائف الملوکی پھیلی اور فارغ البال شعراء بددل ہوگئے تو فغانی شیرازی کا ایک ہم عصر شاعر شہیدی مائل ہندوستان ہوا۔

صفوی عہد میں شعراء کی ناقدری کا حال صفوی دربار کے ایک شاعر کوثری کی زبانی سنیے:

درین کشور خریدار سخن نیست　　کسے سرگرم بازار سخن نیست

در ایران تلخ گشتہ کام جانم　　بباید شد سوی ہندوستانم

سخن را قدر و مقداری نماندہ　　معانی را خریداری نماندہ

ان حالات میں فغانی شیرازی نے جو بنیادی طور پر ایک غزل گو شاعر تھا غزل میں ''نیم مادی اور نیم متصوفانہ'' طریق کار کو خیرباد کہا(۱۳) اور عشق کے عام واقعات کا بیان عام فہم انداز میں کیا۔ جذبات قلبی کے ساتھ ساتھ محبوب کی اداؤں اور ملاقاتوں کا تذکرہ عام کیا جس کی وجہ سے بیان میں پیچیدگی اور تکلف نہ رہے۔ کلام میں ایمائیت پیدا کی اور طرز بیان کو شوق انگیز بنایا۔ ایسا شاعر ایران کی فضا میں(جہاں مرثیہ کا دور دورہ تھا) مقبول ہونے کی بجائے پاکستان و ہند کے ماحول میں زیادہ پنپ سکتا تھا۔ اس کے نزدیک شاعری کی جان غزل تھی اور غزل کی جان حسن وعشق کا ابدی نغمہ تھا جو بوسیدگی سے بے نیاز ہے۔ جو مجنوں و فرہاد پر ختم نہیں ہوتا بلکہ ہر دور کے ہر فرد میں نیا روپ دھارتا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے صفویوں کا خشک زہد شاعری کے لیے سم قاتل تھا اور وہ مغنیۂ فن کو مذہب کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتا تھا۔ بقول فغانی:

عاشق ز کوی دوست نشد مایل حرم　　مرغ از حریم باغ ہوای قفس نکرد

امیر خسرو دہلوی پاکستان و ہندوستان میں فارسی شاعری کے درخشاں آفتاب ہیں۔ دیگر اصناف سخن کے علاوہ ان کی غزل ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ ان کی غزل میں سوز و گداز اور مٹھاس ہے اور وہ بے تکلف گفتگو کے مماثل ہے۔ ان کا انداز لوچدار اور فطری ہے جس سے وہ اپنے معاصرین میں ایک خاص مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ سہیلی خوانساری نے فغانی شیرازی کے بارے میں بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ'' سبک بعضی از غزلیات وی باطرز سخن امیر خسرو دہلوی اندکی مشابہ است و در قرن نہم اغلب شعرای عراق تا اندازۂ بطرز امیر خسرو

Marfat.com

غزل سرودہ و برخی ہم متابعت شیوۂ بابا فغانی را نمودہ اند۔'' اس سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ فغانی پر امیر خسرو کا کچھ نہ کچھ ضرور اثر تھا۔ اس لیے طوطی ہند کے پیدا کردہ ادبی ماحول میں اس کی مقبولیت یقینی تھی۔ یہاں کے شعراء نے بھی فغانی کی پیروی کی۔ سراج الدین خان آرزو اپنے تذکرہ میں رقم طراز ہیں:

بابا فغانی مقتدای متاخران است و خیلی منزہ حرف میزند و در غزل بسیار صاحب قدرت است۔ ہر چند شعرش سادہ است اما از صفای گفت و گو اندازہای لطیف خالی نیست۔ درین ایام تتبع دیوان مذکور اختیار کردہ ام۔ چنانچہ در عرصۂ سہ چہار ماہ شصت غزل بگفتن آمدہ۔ اگر عمر وفا می کند دیگر ہم گفتہ می آید، انشاء اللہ والا خیر:

دنیاست فسانہ پارہ ما گفتیم　　　واں پارہ کہ ماندہ دیگری می گوید(۱۴)

مولانا حسرت موہانی کہتے ہیں:

اردو میں کہاں اور حسرت یہ طرز نظیری و فغانی

بابا فغانی شیرازی کی اس سرزمین میں مقبولیت کی ایک وجہ یہ ہے کہ سبک ہندی کی خصوصیات (اختصار کلام، طرز ادا اور اسلوب بیان میں جدت، نازک خیالات وغیرہ) کا ابتدائی عکس سب سے پہلے فغانی ہی کے ہاں ملتا ہے(۱۵) جس کی تکمیل نظیری، فیضی، وحشی یزدی، شہیدی، حکیم شفائی، صائب، شرف جہاں قزوینی، ظہوری، جلال اسیر، طالب آملی اور کلیم وغیرہ نے کی۔ یہی طرز مقبول ہو کر تمام دنیائے شاعری پر چھا گئی۔ دقیق و عمیق مضامین کی بھرمار نے اس روش میں بے اعتدالی پیدا کی جو سخت نقصان دہ ثابت ہوئی اور ملک سخن ناصر علی، بیدل وغیرہ کے قبضہ میں آگیا اور اس طریق سے یہ عظیم سلسلہ اختتام کو پہنچا۔(۱۶)

فغانی کے اختصار کلام اور طرز ادا کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ اختصار کلام وسیع مضمون کو مختصر الفاظ میں ادا کرنے سے عبارت ہے۔ یہ وصف فغانی کے بعد بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گیا کہ چیستان کا نمونہ پیش کرنے لگا۔ یہ اختصار یوں پیدا ہوتا ہے کہ کلام کے بہت سے ٹکڑے چھوڑ دیے جاتے ہیں اور مضمون کو اس انداز سے بیان کیا جاتا ہے کہ متروک ٹکڑے خود بخود سمجھ میں آجائیں۔ مثلاً فغانی کہتا ہے:

ای کہ می گوئی چرا جامی بہ جانی می خری　　　این سخن با ساقی ما گو کہ ارزان کردہ است

اختصار کے علاوہ اس شعر میں طرز ادا کی جدت بھی قابل داد ہے۔ معترض کا اعتراض ہے کہ شراب ایسی کون سی چیز ہے جس کے عوض میں جان دینے سے بھی دریغ نہیں کیا جاتا لیکن بادہ نوش یہ سمجھا کہ اعتراض اس پر ہے کہ اس قدر ارزاں کیوں خریدی۔ لیکن چونکہ بادہ نوش

Marfat.com

شراب کی قیمت جان سے بہت زیادہ سمجھتا ہے اس لیے اس نے جواباً کہا کہ اس کو میں کیا کروں، یہ تو ساقی سے دریافت فرمایئے جس نے اس کی قیمت اتنی گھٹا رکھی ہے۔

ای کہ بی خود سر نہی پیش صراحی ہوشدار کان بت چینی فراوان خانہ ویران کردہ است

فغانی اثر میں ڈوبے ہوئے الفاظ میں کہتا ہے کہ اے وہ شخص جو بیخود ہو کر اپنے آپ کو صراحی کے پاؤں پر گرا رہا ہے ہوشیار ہوجا اور سمجھ کہ اس چینی کے کھلونے نے بیشمار گھر ویران کردیے ہیں۔ "بت چینی" کی بندش نے شعر کی خوبی میں اضافہ کردیا ہے۔

طویل دور فراق کے نالہائے زار اور اندیشہ ہائے دور و دراز کا فغانی نے نہایت خوبصورتی سے اظہار کردیا جو اختصار کلام کا نمونہ ہے:

کہ فتاد در فراقت کہ نسوختی تمامش اجلست غالباً این کہ فراق گشت نامش

اختصار کلام کے سلسلہ میں ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

ساقی مدام بادہ بہ اندازہ می دھد این بی خودی، گناہ دل زود مست ماست

یعنی ہم نے شراب پی اور مست ہوگئے۔ اس پر لوگوں نے انگشت نمائی کی اور کہا کہ یہ ساقی کی فروگذاشت ہے کہ وہ کیوں اعتدال سے بڑھا۔ لیکن یہ اعتراض درست نہیں۔ اس نے تو اعتدال سے شراب پلائی تھی، یہ تو ہمارے دل ہی کا قصور ہے جو اتنی جلدی مست ہوگیا۔

محبوب سے یہ کہنا ہے کہ تم آج میری نظروں میں زیادہ جچے ہو، ذرا آئینہ تو ملاحظہ کرو۔ اس کو فغانی نے یوں ادا کیا ہے جو رنگینی ادا کی ایک عمدہ مثال ہے:

بچشم من ز دگر روزھا فزوں شدۂ نظر در آئینہ افگن، بہ بین کہ چون شدۂ

اس شعر کی تشبیہات قابل توجہ ہیں:

حسن مہر افروز یار و عشق خرمن سوز من ہمچو گل در غنچۂ سیراب و چون می در سبوست

اس شعر کی نازک خیالی ملاحظہ فرمایئے:

بس نازکست توسنت ای نازنین سوار از رشتہای جان منش تازیانہ ساز

جب فغانی اپنے خلوص کے مقابلے میں محبوبہ (۱۷) کی بے اعتنائی کا مشاہدہ کرتا ہے تو واسوخت (۱۸) کو بروئے کار لاتا ہے:

گرچہ نو نو درد می بینم ز زخم تیغ عشق از علاجش ہر زمان درد مجدد می برم

ان چند اشعار کے تیور ملاحظہ ہوں جن میں وہ اپنی محبوبہ سے بے اعتنائی برتتا ہے:

فغانی جز صاحب دل مخوان درس نظر بازی چنین معنی کجا در طبع ہر کودن فرود آید

بکام دشمنان برخاستم از مجلس خوبان خیال دوستی با مردم ھشیاری می بندم

Marfat.com

از کوی تو چون باد برآشفتم و رفتم　　گردی ز دل مدعیان رفتم و رفتم
چون بستہ دلم، بہ شدہ از درد جدائی　　ای گل ز تماشا بتو نشگفتم و رفتم
این وعدۂ یار است کہ صد بار شکستی　　یکبار دگر از تو پذیرفتم و رفتم

فغانی کے یہاں عشق کی بے پناہ آگ موجود تھی، لیکن اس کا احساس خودی اس عشق کو حسن کا پرتو نہیں سمجھتا تھا، بلکہ اس کا یہی عشق اصل میں اس حسن کا خالق تھا جس کا وہ اتنا متوالا تھا۔ اس کے لیے حسن ایک غیر مرئی، آسمانی، ملکوتی، غیر ارضی اور نا قابل تفہیم شے نہیں تھا، بلکہ وہ مرئی تھا، ارضی تھا اور دیکھنے والے کے دائرۂ نظر میں تھا۔ اُس کا محبوب دیکھا جاسکتا تھا:

فروغ حسن تو از آہ سوز ناک من است　　صفای دامن پاکت زعشق پاک من است
یک چراغست درین خانہ و از پرتو آن　　ہر کجا مینگرم انجمنی ساختہ اند

اس کے علاوہ فن اس کی نظر میں حقیقت پسندی کا نام تھا۔ وہ غزل میں برملا اپنی شراب خوری کا ذکر کرتا تھا اور کبھی اپنی مشکلات کا اظہار کرتا تھا:

آب حیات نیز نماند عزیز من　　می نوش محو ساز خیال سکندری
در دست روزگار گل آرزوی من　　زان گونہ شد خراب کہ بوھم نمی دھد

فغانی کے لیے غزل کا میدان بہت وسیع تھا۔ اگرچہ حسن و عشق اس کا تار و پود تھا لیکن وہ اسی میں زندگی کے بہت گہرے مطالب کا اظہار کرنا بھی جانتا تھا۔ چنانچہ اس کے یہاں خودی، خودداری، خودنگری، عزت نفس اور دوستی وغیرہ پر بہت بلیغ اشارات ملتے ہیں:

تا کی ز ہر چراغ توان کرد کسب نور　　خود را بسوز در نظر شمع و نور باش
آن گوہر یقین کہ ز ہر دیدہ غایب است　　شاید کہ در کنار تو باشد سراغ کن

لیکن خودی کا سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہیں انسان خود پسندی کا شکار نہ ہوجائے اور وہ جداگانہ ہستی کا مطلب خودغرضی، نفس پرستی یا بے کاری نہ لے لے۔ چنانچہ فغانی ان خطرات سے بچانے کے لیے کہتا ہے:

ہنر فضیلت شخصی ست و چابکی آری　　بتاج و بہلۂ زرین چہ فخر شاہین را

وہ خود اتنا خود دار ہے کہ عزت نفس کے مقابلے میں جنت کی بھی پروا نہیں کرتا:

دوزخ نوالہ ساخت فغانی و بست لب　　ناخواندہ سر نزد بہ در جنت کسی

وہ ہنرمند اور خوددار انسان کو سوسائٹی کا بہترین انسان سمجھتا ہے۔ اُسے یہ پتہ ہے کہ حصول مقصد کے لیے زندگی قدم قدم پر مشکلات کے پہاڑ کھڑے کرتی ہے۔ چنانچہ وہ اسے صبر و تحمل، رجائیت اور عزم فتح کی تلقین کرتا ہے:

Marfat.com

غریق بحر امیدم کہ در سفینۂ نوحؑ بیک لطیفہ بلائی ہزار سالہ گذشت

ایسا انسان جس میں صبر وتحمل، امید اور عزم فتح کا امتزاج ہوگا دوسروں سے الگ تھلگ نہیں رہے گا بلکہ ان کے ساتھ ملے جلے گا اور ان میں بھی خیالات پیدا کرے گا تاکہ وہ بھی زندگی کے سمندر میں ان چپوؤں کے ساتھ منزل مقصود پر پہنچ سکیں:

دوری مکن اگر شرفی داری ای ہما از خلق چون فرشتہ رمیدن چہ فایدہ

غرضیکہ فغانی شیرازی اس لیے پاک و ہند میں مقبول ہوا کہ اولاً روایت پرست ایرانی اسکول اس تازہ گوئی، روایت شکنی اور خالص تغزل کا متحمل نہ تھا۔ اس لیے ترکمان دربار نے اس کی قدرشناسی کی اور پاک و ہند پر بھی ترک ہی حکمران تھے۔ثانیاً صفویوں کے لیے شاعری برائے شاعری نہ تھی بلکہ برائے اخلاقیات و مرثیہ تھی اور فغانی محض ایک فنکار تھا۔ثالثاً امیر خسرو کا نقش برصغیر کے ادبی معیار پر بہت گہرا تھا اور فغانی کی غزل ان کی غزل سے ایک حد تک ملتی جلتی تھی۔رابعاً سبک ہندی کی خصوصیات یعنی اختصار کلام اور نازک خیالات وغیرہ اپنی پوری رعنائی کے ساتھ فغانی میں موجود تھیں۔

حوالہ جات

۱۔ ہفت اقلیم، ص ۲۶۴
۲۔ تقی الدین اوحدی، عرفات العاشقین، ورق ۵۵۲
۳۔ شعرالعجم، حصہ سوم، ص ۲۶۰
۴۔ E.G.,Brown, *A History of Persian Literature under the Mongols*, p.415
۵۔ ہفت اقلیم، ص ۲۶۴؛ *Encyclopaedia of Islam*, Vol. II, p. 98
مجالس المؤمنین، ص ۵۳۹؛ تحفۂ سامی، ص ۳۶
۶۔ شعرالعجم، حصہ چہارم، ص ۱۸۹
۷۔ دیوان فغانی (تہران ایڈیشن)، مقدمہ، ص ۸،۷؛ ارمغان، ماہ نومبر ۱۹۳۶ء، ص ۵۷۹
۸۔ والہ داغستانی، ریاض الشعراء، قلمی نسخہ، ورق ص ۱۰۶
۹۔ تحفۂ سامی، ص ۷۳؛ عرفات العاشقین، ورق ۵۵۸
۱۰۔ E.G.,Brown, *A History of Persian Literature in Modern Times*, p.230
۱۱۔ Mohammad Abdul Ghani, *Pre -Mughal Persian in Hindustan*, p xxiv.
۱۲۔ Reuben Levy, *Persian Literature*, p. 14.
Encyclopaedia Britannica (Persian History), Vol 17, pp. 569-575
۱۳۔ انعام الحق کوثر، بابا فغانی شیرازی بحیثیت غزل گو، مقالہ پی ایچ ڈی، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، ص ۷۳

Marfat.com

۱۴۔خان آرزو، *مجمع النفائس*، قلمی نسخہ، ص ۶۸۳

۱۵۔علی اکبر نے ''روابط ادبی ایران و ہند'' میں ص ۹۱ پر بابا فغانی کو سبک ہندی کے بزرگوں اور نامداروں میں شمار کیا ہے۔ حسین فریور نے *تاریخ ادبیات ایران*، ص ۲۰۴ پر لکھا ہے: فغانی از موجدین سبک ہندی بود' مرزا غالب *عود ہندی* (لکھنؤ ایڈیشن،ص ۱۰۸) میں فرماتے ہیں: فغانی ایک اور شیوۂ خاص کا مبدع ہوا۔ خیالہائے نازک و معانی بلند۔ اس شیوہ کی تکمیل کی ظہوری اور نظیری و عرفی نے۔ سبحان اللہ قالب سخن میں جان پڑ گئی اور اس روش کے بعد کے صاحبان طبع نے سلاست کا چرچا دیا۔ صائب وکلیم وسلیم اور اس کے بعد قدسی، کلیم، شفائی اس زمرہ میں ہیں۔''

ریاض الشعراء (والہ داغستانی) قلمی نسخہ (ورق نمبر ۱۰۶) پر مندرج ہے:'' بابائے مغفور (فغانی شیرازی) مجتہد فن تازہ ایست کہ پیش از وی احدی بآن روش شعر نگفتہ و پایۂ سخنوری را بجائے رسانیدہ کہ عنقای اندیشہ بہ پیرامون او نمی تواند پرید۔ اکثر استادان زمان مولانا وحشی یزدی و مولانا نظیری نیشاپوری و مولانا ضمیری اصفہانی و خواجہ حسین ثنائی و مولانا عرفی شیرازی وحکیم شفائی اصفہانی وحکیم مسیحا رکنای کاشی و مولانا محتشم وغیرھم متتبع و مقلد و شاگرد و خوشہ چین خرمن طرز و روش اویند۔''

۱۶۔*شعر العجم*، حصہ پنجم،ص ۵۹

۱۷۔فغانی کے متعدد اشعار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے روایت کے برخلاف ''لڑکے'' کے بجائے عورت سے محبت کرنا چاہی۔ اس کی محبوبہ ''گل محمل نشین'' اور '' نازک تر از برگ گل'' کی تصویر تھی۔ بقول سید عابد علی عابد ''فغانی نے کہا کہ میری محبوبہ ایک جیتی جاگتی عورت ہے میں اس سے عشق کرتا ہوں۔ وہ ان تمام جنسی تمناؤں اور آرزوؤں سے متاثر ہوتی ہے جن سے متاثر ہوئے بغیر چارہ نہیں۔'' ''دہلی اور لکھنو کا شعری دبستان''، *امروز* لاہور، ۲۷ جنوری ۱۹۵۷ء

چند اشعار اس دعوے کے ثبوت میں پیش کیے جاتے ہیں:

دیدہ ام جای پری روی کہ پیش تخت او　　گر سلیمان میرسد خالی نگین می افگند
جای دگر نماند کہ سوزد ز دیدنت　　رخسارہ در نقاب برای چہ می کنی
طبعش گران مساز فغانی ز شرح غم　　باری چنین بخاطر آن نازنین منہ
بکشای پردہ از گل رخسار اندکی　　آبی نما، بہ تشنۂ دیدار اندکی
مگذار در دلم گرہ اے گل چو آمدی　　از چیست شرم کردن و نشگفتن این چنین

۱۸۔رام بابو سکسینہ، *تاریخ ادبیات اردو*، ص ۹۸ پر لکھتے ہیں کہ واسوخت کی ابتدا فغانی نے کی تھی اور یہ نظم کی وہ قسم ہے جس میں معشوق کی بے وفائی، ظلم وستم، رقیب کے ساتھ بیجا محبت کی شکایتیں ہوتی ہیں اور عاشق اسے دھمکاتا ہے کہ اگر اس کا یہی طرز تغافل رہا تو پھر اس کے ہاتھ سے عنان صبر چھوٹ جائے گی اور وہ علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور ہوگا۔

☆☆☆

Marfat.com

سچل سرمست کے فکر و عرفان پر عطار کا اثر

ڈاکٹر گل حسن لغاری☆

حضرت سچل سرمست سندھ کے صوفیۂ کرام شعراء میں خصوصی شہرت رکھتے ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء میں ہوئی۔ آپ کا پیدائشی اسم گرامی عبدالوہاب تھا، لیکن راست گوئی اور راست بازی کی وجہ سے انہیں ''سچو''، ''سچل'' اور ''سچیڈنو'' کہا جانے لگا اور آپ اسی نام سے معروف ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب ۳۹ پشت میں حضرت عمر فاروقؓ سے جاملتا ہے۔ آپ کے اجداد میں سے ایک بزرگ شیخ شہاب الدین فاروقی تھے جو سندھ میں وارد ہوئے اور فتح سندھ کے بعد انہیں سیوستان (سیوہن) کا حاکم مقرر کیا گیا۔ اسی خاندان کے ایک اور کامل ولی خواجہ محمد حافظ تھے جو سائیں صاحڈنو کے نام مشہور ہوئے۔ ضلع خیرپور میں قصبہ رانی پور سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر درازا شریف نامی گاؤں میں انہوں نے سکونت اختیار کی۔ آپ کے دو فرزند ہوئے، ایک کا اسم گرامی خواجہ صلاح الدین تھا اور دوسرے کا خواجہ عبدالحق۔ خواجہ صلاح الدین کے وصال کے بعد، خواجہ عبدالحق مسندِ رُشد و ہدایت پر متمکن ہوئے(۱) جو سچل سرمست کے حقیقی چچا تھے۔

سچل سرمست کے چچا نے اسلامی روایات کے مطابق آپ کو دینی تعلیم و تربیت کے لیے حافظ عبداللہ قریشی صدیقی کے حوالے کیا، جن سے آپ نے فارسی اور سندھی کے علاوہ قرآن مجید کا درس بھی حاصل کیا اور بارہ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کرلیا۔ قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد سچل سائیں نے اپنے چچا خواجہ عبدالحق سے فارسی اور علوم متداولہ کی تحصیل کی۔ اس کے ساتھ خواجہ عبدالحق نے انہیں اپنا مرید بنایا، عرفانِ الٰہی سے مستفیض کیا اور خرقۂ خلافت سے نوازا۔ اس طرح سچل نے گویا علم ظاہری و باطنی تمام علوم اپنے مرشد حضرت خواجہ عبدالحق ہی سے حاصل کیے۔ وہ خود اپنی ایک سرائیکی سی حرفی میں فرماتے ہیں:(۲)

ہادی ہے میڈا عبدالحق سائیں صوفی صاف جو شاہنشاہ، یہاں،

☆ استاد سابق زبان فارسی گورنمنٹ کالج، ٹنڈو جام، حیدر آباد

Marfat.com

سبھو علم تمہیں تُوں معلوم تھیا، اسرار مڑیوئی آگاہ میاں،
تمہیں خاک قدم اتون کراں صدقے، سرسبھو

سچل سرمست کا کلام ان اصناف سخن پر محیط ہے: کافیاں، ابیات، غزل، مولود، مرثیہ، سی حرفی، جھوانہ، گھڑولی، فرد، رباعی، دوہیڑے، مسدس اور مخمس وغیرہ۔ فارسی کلام میں آپ کا تخلص آشکار اور خدائی ہے۔ فارسی میں آپ کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں:
دیوان آشکار، (۳) دیوان خدائی، (۴) مثنوی عشق نامہ، (۵) مثنوی درد نامہ، (۶) مثنوی گداز نامہ، (۷) مثنوی تار نامہ، (۸) مثنوی رہبر نامہ، (۹) مثنوی راز نامہ، مثنوی وحدت نامہ، مثنوی وصلت نامہ، (۱۰) غزل بحر طویل، نکتۂ تصوف۔ (۱۱)

سچل سرمست کے سندھی آثار یہ ہیں۔ **وحدت نامہ، حقیقت، ابیات، سندھی کافیان، دوہیڑے** وغیرہ؛ جبکہ آپ کے سرائیکی آثار میں دعا، نعت، دوہیڑے، سی حرفی، کافیاں اور متفرق کلام شامل ہیں۔(۱۲) جہاںتک آپ کے اردو کلام کا تعلق ہے: قاضی علی اکبر درازی کی کوشش سے اس کا ایک انتخاب روہڑی سے ۱۹۷۸ء میں دوسری دفعہ شائع ہوا۔ حضرت سچل فقیر کا کلام عشقیہ و عارفانہ ہے اور جوش و جنون، سرمستی، بے باکی، بے ریائی، الوہیت، محویت اور مستی کی کیفیات سے سرشار ہے، جس سے آپ کے مسلک وحدت الوجود (ہمہ اوست) پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔

حضرت سچل فقیر کے فارسی کلام میں جا بجا شیخ فرید الدین عطار ۶۲۷۔۵۳۰ھ ۱۲۲۹۔۱۱۳۵ء)(۱۳) کے فکر، عشق و عرفان اور عرفاء کی وحدت الوجودی موج کا تاثر موجود ہے۔ تصوف کی تاریخ میں ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں جو دو اہم ترین مکتب فکر موجود تھے۔ ان میں سے ایک عطار اور رومی سے منسوب تھا، جسے ''تصوف عاشقانہ'' کہتے ہیں اور دوسرا مکتب فکر محی الدین ابن عربی (۶۳۸۔۵۶۰ھ/۱۲۴۰۔۱۱۶۴ء) اور ابن فارض (۶۷۱ھ/۱۲۷۲ء یا ۶۷۳ھ/۱۲۷۴ء) کا تھا جو ''تصوف عابدانہ'' کہلاتا تھا۔ اسی صدی میں تصوف کا کبرویہ سلسلہ بھی موجود تھا۔(۱۴) حضرت سچل سرمست پر جس سلسلۂ تصوف و عرفان کا اثر ہے، وہ شیخ فرید الدین عطار اور مولانا جلال الدین رومی کا سلسلہ ہے، جس میں ''کثرت'' خود ''عین وحدت'' ہے:

کثرت چو نیک در نگری عین وحدت است
ما را شکی نماند در این، گر ترا شکی است(۱۵)

(اگر کثرت کو بغور دیکھو گے تو وہ تمہیں عین وحدت نظر آئے گی۔ ہمیں تو اس میں کوئی شک یا

Marfat.com

تردد نہیں، (خدانخواستہ) اگر تمہیں اس میں شک ہے تو یہ تمہاری نگاہ کی کمزوری ہے۔)

حضرت سچل سرمست کا فارسی کلام دیوان ہو یا مثنویاں، وحدت الوجود کے عرفان و عشق اور معرفت الٰہی کی کیفیات کی تجلیوں سے مملو ہے۔ اسی طرح ان میں مولانا الدین رومیؒ (وفات ۶۷۲ھ/۱۲۷۳ء) کی مثنوی اور کلیات شمس تبریزی کے اثرات بھی جابجا نظر آتے ہیں۔ سچل فقیر پر "عطار" کے عشق و عرفان کا اتنا اثر تھا کہ وہ انہیں مرشد کے رتبے سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ دیوان آشکار (۱۶) میں فرماتے ہیں:

عارفی و عاشقی شد ہر دو شانِ یار ما
بہر جلوۂ حسن می آید بہ بین ولدار ما
گاہ می گردد نبی و گاہ می گردد ولی
پس کجا آید ازین اسرار حق انکار ما
راز وصلتنامہ (۱۷) خواندم و رمز منطق الطیر را
ہم چنین فرمودہ است آن خواجۂ عطار ما

یعنی عارفی و عاشقی دونوں ہمارے محبوب کی شانیں ہیں۔ دیکھ ہمارا محبوب اپنے حسن کے جلوے بکھیرتا ہوا نظر آرہا ہے۔ کبھی نبی بن جاتا ہے، کبھی ولی۔ یہ اسرار حق ہیں اور ان سے ہم کب انکار کرسکتے ہیں۔ میں نے وصلتنامہ کا راز بھی پڑھ لیا اور منطق الطیر کے اسرار بھی پڑھ لیے، کیونکہ ہمارے خواجہ فرید الدین عطار کا یہی ارشاد ہے۔

عطار نے اپنی مثنوی منطق الطیر میں وحدت الوجود کی حقیقت کو نروار کیا ہے اور سچل فقیر کا اشارہ اس میں عطار کی بیان کردہ سات وادیوں کی طرف ہے۔

عطار نے مثنوی منطق الطیر میں عارفانہ اور عاشقانہ فکر کو سات وادیوں میں تقسیم کیا ہے اور ان وادیوں کو حکایات کی صورت میں نہایت دلچسپ، پسندیدہ اور دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔

عطار منطق الطیر کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں کہ ایک دن سارے پرندے ایک جگہ جمع ہوکر کہنے لگے کہ ایسا کوئی بھی شہر نہیں جہاں اس کا بادشاہ موجود نہ ہو۔ ہمیں بھی چاہیے کہ اپنے بادشاہ کو تلاش کریں۔ ہد ہد جو پرندوں کا پیغام رساں (قاصد) ہے اس نے کہا کہ پرندوں کے بادشاہ کا نام سیمرغ ہے اور وعدہ کیا کہ وہ پرندوں کو سیمرغ کی دربار تک ضرور پہنچائے گا، لیکن شرط یہ ہے کہ انہیں دور دراز کے سفر کی صعوبتوں اور مشکلات سے گذرنا پڑے گا۔ یہ سن کر زیادہ تر پرندے مختلف عذر پیش کرکے پیچھے رہ گئے، تاہم تیس پرندے پختہ

Marfat.com

عزم کرکے سیمرغ کے دربار تک جانے کے لیے آمادہ ہوگئے۔

سیمرغ کے ملنے کے لیے ان تیس پرندوں کے سفر کی داستان کو عطار نے سیر و سلوک کی راہ کی کوشش قرار دیا ہے اور اس میں اس ریاضت کا حال بیان کیا ہے جو آدمیت کے عالی ترین درجہ پر پہنچنے لیے ضروری ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کمال کا راستہ سراسر تکلیفوں سے بھرا پڑا ہے، نیز عالم حقیقت تک پہنچنے اور وحدت کے مقام تک رسائی کے لیے عطار نے جن وادیوں کا ذکر کیا ہے ان سے گزرنا لازمی ہے۔

سچل فقیر پر عطار، مولانا رومی اور جامی کے عرفان کا اثر نمایاں ہے اور وہ اپنے چچا اور مرشد پیر عبدالحق کو بھی یاد کرتے ہیں، جنہوں نے عطار، رومی اور جامی کے عشق و عرفان سے انہیں آشنا کیا۔ دیوان آشکار میں فرماتے ہیں۔(۱۸)

ای دلا! خوشبو ز شہ عطار در جانم رسید
آن زبان یکبارگی از کفر و دین ما را کشید

(اے دل! میری روح تک حضرت عطار کی خوشبو پہنچ گئی اور اس نے ایک دم مجھے کفر و دین سے آزاد اور بے نیاز کردیا)

شہر نیشاپور پُر دردست گر پُرسی ز ما
از در و دیوار آید نعرۂ ھل من مزید
چہ جلال الدین چہ جامی غاشیہ بردار او
این چنین تعریف ما از پیر عبدالحق شنید

یعنی اگر ہم سے پوچھو تو شہر نیشاپور درد سے معمور ہے اور اس کے ہر در و دیوار سے ''ھل من مزید'' درد و عشق کی مسلسل طلب کی صدائیں آرہی ہیں۔جلال الدین رومیؒ ہو یا عبدالرحمٰن جامی، وہ ان کے غاشیہ بردار(مطیع و فرمابردار) ہیں۔ ہم نے یہ بات اپنے پیر طریقت حضرت عبدالحق سے سُنی ہے۔

سیر و سلوک کی منزل میں پہلا قدم جستجو اور طلب کا ہے۔ جب تک دل میں سچی طلب نہ ہو، کمال کے راستے پر قدم رکھنا محال ہے۔ یہاں پر کوشش اور فداکاری اولین شرط ہے۔ عطار فرماتے ہیں:(۱۹)

جدوجہد اینجا باید سالھا　ز آنکہ اینجا قلب گردد سالھا
مال اینجا بایدت انداختن　ملک اینجا بایدت در باختن !

یعنی یہاں پر سالہا سال کوشش جاری رکھنی چاہیے، کیونکہ کئی سال تک دل کی توجہ کی ضرورت

Marfat.com

رہتی ہے۔ یہاں پر مال و ملکیت سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے اور مُلک کی حکمرانی (دنیاوی چاہت و لذت) کو ترک کرنا پڑتا ہے۔

دوسرا مقام عشق کا ہے۔ اس مقام پر انسان کو اپنے مقصد سے وابستگی اور لگن ہونی چاہیے کہ وہ بغیر تأخیر و تأمل کے وصال کی راہ پر چل پڑے۔ اس راستے پر چلنے سے نہ ڈرے، شک و یقین اور نیک و بد کے تصورات سے خود کو پریشان نہ کرے اور اپنے مقصود و معبود کے راستے کی جستجو میں تأخیر اور عاقبت اندیشی کو روا نہ رکھے۔ عطار فرماتے ہیں:(۲۰)

بعد ازان وادی عشق آید پدید　　غرق آتش شد کسی کانجا رسید
عاشق آن باشد کہ چون آتش بود　　گرم رو سوزندہ و سرکش بود
عاقبت اندیش نبود یک زمان　　غرق در آتش چون آن برق جہان

یعنی اس کے بعد عشق کی وادی ظہور پذیر ہوتی ہے، اس وادی میں جو بھی پہنچا، وہ آتش میں غرق ہوا۔ عاشق وہ ہے جس میں عشق کی آگاہی ہو اور وہ تیزی اور بہادری سے عشق کی جلتی ہوئی آگ میں غوطہ لگائے۔ گھڑی پل کے لیے بھی عاقبت اندیش نہ ہو، بلکہ آگ میں جہان کی تیز بجلی کی طرح کود پڑے۔

تیسرا مقام معرفت کا ہے۔ یہاں پر سالک، اپنی سوچ اور فکر کے مطابق، اپنی راہ اختیار کرتا ہے۔ کوئی محراب کو اپنی دل کا محور بناتا ہے تو کسی نے بُت کا اپنے لیے انتخاب کرلیا ہے۔ اس لیے اسرار کا کُھلنا بھی اسی کی اپنی ذاتی قدر کے مطابق حاصل ہوتا ہے۔ اس ''معرفت'' کی راہ میں لاکھوں سالک گم ہوجاتے ہیں اور ان میں سے کسی مخصوص سالک پر اسرار الٰہی کا ظہور ہوتا ہے۔ عطار فرماتے ہیں:

معرفت اینجا تفاوت یافتہ　　این یکی محراب و آن بت یافتہ
صد ہزاران مرد گم گردد مدام　　تا یکی اسرار بین گردد تمام

یعنی معرفت کی شناخت میں یہاں پر تفاوت پایا جاتا ہے، کسی نے محراب کو اور کسی نے بت کا اپنے لیے انتخاب کرلیا ہے۔ اس معرفت کے مقام پر جو لاکھوں افراد گم ہوجاتے ہیں، ان میں سے کسی ایک پر اسرار (الٰہی) کھلتے ہیں۔

اس کے بعد عطار فرماتے ہیں کہ ''معرفت'' کی سلطنت ہمیشہ قائم و دائم ہے البتہ سالک کو کوشش کرنی چاہیے تاکہ یہ صفت حاصل کرسکے:

Marfat.com

هست دائم سلطنت در معرفت
جهد کن تا حاصل آید این صفت

چوتھا مقام استغنا کا ہے۔ حقیقت کے متلاشی عارف کو دانا، خردمند اور صاحب دل ہونا چاہیے۔ اسے اپنے مقصود کے راستے میں دنیا اور دنیا والوں سے بے نیاز ہونا چاہیے، کیونکہ حرص و ہوا کے شکنجے میں جکڑا ہوا شخص کمال حاصل نہیں کرسکتا۔ عارف کی بلند نگاہ میں دنیا ایک ایسا نقش ہے جو تختی پر اتارا جاتا ہے، اور اس میں، ستارے، برج، ملک، سعادت، نحوست، موت اور ولادت وغیرہ کندہ کر کے نقش و نگار بنائے جاتے ہیں، لیکن آخرکار اس تختی سے ان سب کو مٹا دیا جاتا ہے۔ بقول عطار: (۲۱)

دیده باشی کان حکیم بی. خرد | تختهٔ خاک آورد در پیش خود
پس کند آن تخته پُر نقش و نگار | ثابت و سیار آرد آشکار
هم نجوم و هم بروج آرد پدید | هم افول و هم عروج آرد پدید
هم نحوست، هم سعادت بر کشد | خانهٔ موت و ولادت بر کشد
چون حساب نحس گردد سعد از آن | گوشهٔ آن تخته گیرد بعد از آن
بر فشاند گوئی آن هرگز نبود | آن همه نقش و نشان هرگز نبود
صورت این عالم پُر پیچ پیچ | هست همچون صورت آن تخته هیچ

پانچواں مقام توحید کا ہے۔ عارف، جب اس مقام کو درک کرلیتا ہے تو پھر کثرت کی اس رنگا رنگی میں وحدت دیکھتا ہے۔ اسے ہر چیز میں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے۔ یعنی خدا کی ہستی کے سوا، وہ ہر چیز کو نابود سمجھتا ہے اور اس کی نظر میں ''من'' و''تو'' کا امتیاز باقی نہیں رہتا۔ عطار فرماتے ہیں: (۲۲)

چون یکی باشد همه، نبود دوی | نه منی بر خیزد اینجا هم توی
آن یار زمان جدا نباشد | لیکن به ما و شما نباشد
بگذر تو ز ما و از شمایی | در ما و منی، لقا نباشد

حضرت سچل فقیر رهبر نامہ میں فرماتے ہیں:

ای پسر! بگذر تو از دوئی | خود را بشناس که او خود توئی
هر دو نماند، بماند یکی | در ره توحید نیاری شکی
کس بدوئی هست تبه میرود | او بمیان شک و شبه میرود

یعنی اے بیٹے! تو دوئی سے باہر نکل خود شناسی پیدا کر کہ وہ، خود تو ہے۔ دوئی یا دو نہیں رہیں

Marfat.com

گے، صرف ایک ہی رہے گا۔ توحید کی راہ میں شک کی گنجائش نہیں۔ جو بھی دوئی میں مبتلا رہتا ہے، وہ برباد ہوجاتا ہے اور شک و شبہ کا شکار ہوکر، حقیقت سے بے خبر رہتا ہے۔

چھٹا مقام حیرت ہے۔ عارف کا اس مقام پر پہنچنا لازمی ہے کیونکہ یہ مقام سرگردانی اور تعجب خیزی کا ہے۔ اس مقام پر انسان کو پتہ چلتا ہے کہ اس کے تمام علوم محدود تھے۔ پس وہ اپنے نہ جاننے کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس قدر حیرت زدہ اور پریشان حال ہوجاتا ہے کہ اپنے وجود کو بھی کھو بیٹھتا ہے:(۲۳)

مرد حیران چون رسد این جایگاه در تحیر مانده و گم کردہ راه
گم شوذ در راه حیرت محو و مات بی خبر از بود و ز کائنات[۲۴]

یعنی جب حیران و پریشان مرد، اس مقام پر پہنچتا ہے تو اسی حیرانی میں اپنی راہ سے بھٹک جاتا ہے۔ سرگردانی اور حیرت میں اپنی راہ سے بھٹکا ہوا انسان نہ صرف اپنے وجود سے بے خبر، بلکہ کائنات سے بھی بے خبر رہتا ہے۔

حضرت سچل فقیر حیرت کے مقام کی نشاندہی مثنوی گداز نامہ میں اس طرح کرتے ہیں:(۲۵)

خویش را دریاب تا تو کیستی! کیستی، کیستی و چیستی
کیستم من، کیستم من، کیستم در تحیّر مانده ام تا چیستم

(اے سالک! تو اپنے کو پہچان کہ تو کون ہے؟ تو کون ہے، تو کون ہے اور تو کیا ہے؟ میں کیا ہوں، میں کیا ہوں، کیا ہوں؟ میں اب تک حیرت میں مبتلا ہوں کہ میں کیا ہوں۔)

ساتواں مقام فنا کا ہے۔ اس مقام پر آدمی کے تمام میلانات حیوانی، نخوتیں اور خودستائی کے جذبات دور ہوجاتے ہیں اور وہ خود کو عالم وحدت میں گم کرکے اس کا ایک جزو بن جاتا ہے۔ وصال حق بھی ذات واحد ہی میں فنا ہونے سے حاصل ہوتا ہے اور یہی فنا، بقا کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ عطار فرماتے ہیں:(۲۶)

هر که در دریای کل گم بوده شد دائما گم بودهٔ آسوده شد
گر تو هستی راه بین و دیده ور موی در مو این چنین بین در نگر
هرکه او رفت از میان اینک فنا چون فنا گشت از فنا اینک بقا

یعنی جو بھی سالک کل میں گم ہوگیا، وہ ہمیشہ (وحدانیت میں) گم ہوا اور آسودہ ہوگیا۔ اگر حقیقت کا راہ بین اور نگہبان ہے تو تو اسے متواتر باریک بینی سے دیکھ۔ ہر وہ سالک جو اپنے

Marfat.com

آپ میں گم ہوگیا، تو یہی فنا ہے۔ جب فنا ہوگیا تو فنا کا حرف شرط، یہی بقا ہے۔

یہ وہ مراحل ہیں جو مردِ عارف کو طے کرکے کمال تک پہنچنا پڑتا ہے۔ لہٰذا ان سات وادیوں کی صعوبتیں برداشت کرکے وادی فنا میں پہنچنے کے بعد، آخر کار پرندے سیمرغ کی بارگاہ میں پہنچے اور وہاں اپنا ہی عکس دیکھا:(۲۷)

هم ز عکس روی سیمرغ جهان چهرهٔ سی مرغ دیدند آن زمان
چون نگه کردند آن سی مرغ زود بی شک این سی مرغ آن سی مرغ بود
هرکه آید خویشتن بیند درو جان و تن هم جان و تن بیند درو

یعنی اس وقت، جہاں کے سیمرغ کے چہرے کا عکس، تیس پرندوں نے دیکھا۔ جب ان تیس پرندوں نے جلدی میں نگاہ ڈالی تو ان کو تیس پرندے سیمرغ ہی نظر آئے۔ ہر وہ شخص (مرد عارف) جو اپنے آپ کو دیکھتا ہے، وہ گویا ذات واحد ہی کو اپنے جان وتن کے اندر پاتا ہے۔

عطار مثنوی منطق الطیر میں سیمرغ سے مراد ذات واجب الوجود لیتے ہیں جبکہ ھُد ھُد سے مراد پیرو مرشد ہے، اور دوسرے پرندے جو ''سیمرغ'' کی تلاش میں نکلے ہیں وہ سالکان راہ طریقت وحقیقت ہیں۔

حضرت سچل فقیر کے افکار پر شیخ عطار کی غزلیات اور مثنویات بالخصوص منطق الطیر جسے فارسی ادب کے شاہکاروں میں شمار کیا جاتا ہے اور جس میں وحدت الوجود کی حقیقت کو آشکار کیا گیا ہے کا گہرا اثر ہے۔ حدیث قدسی ہے: من عرف نفسہ فقد عرف ربہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا، بے شک اس نے اپنے رب کو پہچانا۔ حضرت سچل فقیر خود، عطار کی اسی فکر سے متاثر ہوکر فرماتے ہیں:(۲۸)

''آشکار'' نحن اقرب، گفت یار از رگِ جان شد قریب غم مدار

یعنی ای آشکار! محبوب نے ''نحن اقرب'' فرمایا ہے۔ غم نہ کر، محبوب مجھے شہ رگ سے بھی قریب ہے۔

حضرت سچل فقیر دراصل، عارف و عاشق عطار کو اپنے یار کی نسبت سے یاد کرکے فرماتے ہیں:(۲۹)

یار ما باشد یکی از صد ہزار عارف و عاشق بود نامش عطار
در درونِ سینہ یابم بوی یار شد معطر جان از شہ عطار

یعنی میرا یار لاکھوں میں ایک ہے۔ عارف و عاشق ہے اور اس کا نام عطار ہے۔ میں اپنے سینے کے اندر یار کی خوشبو محسوس کرتا ہوں۔ میری روح شاہ عطار سے معطر ہوئی ہے۔

Marfat.com

سچل فقیر نے جس خوشبو کا ذکر کیا ہے، ''ذات واحد'' کا جلوہ اور حسن ہے جو کہ کائنات کے ذرہ ذرہ میں نمایاں ہے۔ انسان میں بھی وہی ذات اقدس جلوہ گر ہے۔ شیخ عطار فرماتے ہیں:(۳۰)

چشم بکشا کہ جلوۂ دلدار　متجلیست از در و دیوار

نحن اقرب الیہ آمدہ است　دور افتادہ ای تو از پندار

یعنی اپنی آنکھیں کھول اور دیکھ کہ محبوب کا جلوہ در و دیوار سے روشن ہے۔ وہ شہ رگ سے بھی نزدیک ہے۔ تو خود بینی اور گمان کی وجہ سے دور بھٹکا ہوا ہے۔

سچل فقیر اسی فکر کو مزید توضیح کے ساتھ فرماتے ہیں:(۳۱)

خویش را بشناس در گِل گوہر است　ماہ پنہان کی شود زیر غلاف؟

گر یقین دانی دلت کعبۂ خداست　آشکارا خویشتن را کن طواف

یعنی اپنے آپ کو پہچان۔ تیری مٹی (جسمانی صورت) میں گوہر (ذات اقدس) موجود ہے۔ آخر چاند کب تک بادل کے پردہ میں چھپا رہے گا؟ اگر تجھے اعتبار آجائے تو تیرا دل کعبۃ اللہ ہے۔ اے آشکار! تو اپنا طواف کر۔

جب تک انسان اپنے جسمانی وجود کی جادوگری کو پاش پاش نہیں کرے گا تب تک ''واجب الوجود'' کی حقیقت سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ جب یہ جسمانی اور نفسانی طلسم ٹوٹ جائے گا، تب واجب الوجود کی جلوہ گری سے فیض حاصل ہوگا۔ عطار فرماتے ہیں:(۳۲)

گر طلسم نفس بکشایی ز معنی بر خیزی

وآن کس برخورد ازین معنی کہ بی خواب و خور است

یعنی اگر تو اپنے نفس کے (جسمانی) طلسم کو توڑ دے گا تو حق اور حقیقت سے آگاہ ہو جائے گا۔ اس حقیقت تک وہی پہنچا، جس نے نیند اور کھانے پینے کو ترک کر دیا۔

سچل فقیر بھی ہو بہو عطار کے تتبع میں جسمانی جادوگری کو توڑنے کے لیے زور دیتے ہیں تاکہ عارف و عاشق ذاتِ حقیقی کے مشاہدے سے بہرہ ور ہو سکے۔ وہ فرماتے ہیں:(۳۳)

لیس فی الدارین الا ہو شنو　ہست آن موجود بزیر و زبر

با ہمہ او بی ہمہ وصفش ببین　تعبیہ او ہست بصورت بشر

بشکن یک بار طلسم وجود　خواجہ عطار بداد این خبر

چون بعدم میری ای ''آشکار''　معیت حق ست کہ تا پای سر

Marfat.com

یعنی سن لے! دونوں جہان میں اس کے سوائے کوئی نہیں ہے۔ اوپر نیچے وہی موجود ہے۔ اس کی اوصاف دیکھ، سب کے ساتھ بھی ہے اور سب سے الگ بھی ہے۔ اپنے آپ کو انسانی صورت میں ساختہ و آراستہ کر کے چھپا لیا ہے۔ خواجہ فرید الدین ہدایت کرتے ہیں کہ ایک بار اپنے وجود کی جادوگری کو توڑ دے۔ اے آشکار! جب تو دنیائے فانی سے کوچ کرے گا تو مکمل طور پر حق کی ہمراہی میں ہوگا یعنی محبوب حقیقی کے حضور میں ہوگا۔

سچل فقیر نے جس شورش عشق اور مستی کا نعرہ لگایا ہے، اس کی بنیاد فریدالدین عطار کا عاشقانہ *دیوان* اور مثنوی *منطق الطیر* ہی ہیں۔ درحقیقت ذات باری تعالیٰ کے وجود کا مرکز خود انسان ہے، اور یہی اس کا راز ہے، جسے عام مخلوق سمجھنے سے قاصر ہے۔ جو شخص بھی، اس ذات واحد کی تجلی سے محروم ہے، وہ قیامت کے دن بھی ایسے مشاہدے اور دیدار سے محروم ہوگا، کیونکہ ذات یکتا کے سوا اور کچھ بھی موجود نہیں، صرف توجہ اور حقیقی نگاہ کی ضرورت ہے۔ عطار فرماتے ہیں:(۳۴)

اندرون و برون، نشیب و فراز　　از پس و پیش و از یمین و یسار
شاہد "لا الہ الا ھو" پیش تو پردہ گیرد رخسار
کاروان "نفخت من روحی" بسرای تو بر کشاید بار
این تماشا چو بنگری، گویی لیس فی الدار غیرہ دیار

یعنی اندر اور باہر، نیچے اور اوپر، سامنے اور پیچھے، داہنے اور باہنے، یہی موجود ہے کہ: کوئی بھی معبود، سوائے ذات باری تعالیٰ کے نہیں لیکن تمہارے سامنے رخسار کا جسمانی پردہ ہے، اس لیے تو مشاہدے سے محروم ہے۔ میں نے اس میں اپنی روح پھونکی" اور وہی ہم سفر کاروانِ راز ہے جو تیرے کاشانے میں جلوہ افروز ہوتی ہے۔ جب تو یہ تماشا دیکھتا ہے تو تجھے کہنا اور ماننا پڑتا ہے کہ دونوں جہانوں میں ذات باری تعالیٰ کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔

عطار اپنے دیوان میں ذات واحد کے متعلق جس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں، اسی سے سچل فقیر متاثر ہوکر نیشاپور کی راہ اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں:(۳۵)

کل شیء ھو اللہ است مشہور　　او بہر جای کردہ است ظہور
دیدہ را باز کن کہ تا بینی　　ناظر او شدہ است منظور
گر تو واقف نہ ازین اسرار　　تا برو سوی شہر نیشاپور

یعنی کل شیء ھو اللہ (ہر چیز اللہ ہے) مشہور ہے۔ اس (ذات اقدس) نے ہر مقام پر ظہور فرمایا ہے۔ آنکھیں کھول، تاکہ دیکھ سکے ناظر بھی وہی اور منظور بھی وہی ہے۔ تُو اگر اس راز سے

Marfat.com

آگاہ نہیں تو تجھے نیشاپور جانا چاہیے جہاں شیخ عطار کا بسیرا ہے۔
عطار خود ذات واحد کے متعلق فرماتے ہیں: (۳۶)

ناظر خود خودست و خود منظور خود تماشا و خود تماشگار
عاشق خود خودست و خود معشوق خود طبیب خودست و خود بیمار

سچل فقیر نے عطار کے عرفان، عشق و محبت کی تاثیر اور عقیدہ کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے، اور وہ عشق ہی کو ذات حق تک رسائی کا وسیلہ قرار دیتے ہیں۔ مثنوی عشق نامہ میں فرماتے ہیں:(۳۷)

عشق می باشد ھمہ آگاہ راز عشق اندر ھر دو عالم شاھباز
ای پسرا جز عشق دیگر راہ نیست عشق سلطان است دیگر شاہ نیست
عشق شاہ بر ھمہ غالب بود قدر آن داند کہ او طالب بود
عشق جسم و جان را سازد فنا از فنا می آورد سوی بقا

یعنی عشق جملہ راز سے آگاہ ہوتا ہے، عشق دونوں جہانوں میں شہباز ہے۔ اے بیٹے! عشق کے سوا دوسری کوئی راہ نہیں۔ عشق بادشاہ ہے، دوسرا کوئی بادشاہ نہیں۔ عشق بادشاہ ہے جو سب پر غالب ہے، لیکن اس کی اہمیت وہی پہچان سکتا ہے جو طالب ہو۔ عشق جسم و جان کو فنا کرتا ہے اور اسی فنا سے بقا تک پہنچاتا ہے۔

جب انسان کی بشری صفات پر، عشق کی آتش یا حُسن و رعنائی اور نور کی کشش رونما ہوتی ہے تو ربوبیت، اس کا استقبال کرتی ہے اور اس کا نتیجہ حقیقی فنا ہوتا ہے، جس میں دوئی نہیں بلکہ یک رنگی اور یکسوئی ہے۔ آتش عشق کی ایسی کیفیت کے متعلق عطار فرماتے ہیں: (۳۸)

آتش عشق و محبت بر فروز تا بسوزد ھر کہ او یکرنگ نیست

یعنی آتش عشق اور محبت کو تیز کر تا کہ جو یکتائی (ذاتِ واحد) کا قائل نہیں ہے، اسے جلا کر بھسم کردے۔

یکرنگی، یکسوئی اور یکتائی آتش عشق اور سوز درونی کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ سچل فقیر نے اسی لیے آتش عشق میں رہنے کو پسند کیا اور یہی وہ اصل مقام ہے، جسے پرتو عشق یا لقاء ربی کہتے ہیں۔ سچل فقیر فرماتے ہیں: (۳۹)

عشق نار کہ(۴۰) مُحرّق باشد چو سمندر در آن نشستہء ما
پیش محبوب "آشکار" بین قدر عالیست دل شکستہء ما

Marfat.com

یعنی عشق ایسی آگ ہے جو سب کو جلا دیتی ہے لیکن ہم اس کے درمیان میں سمندر کی طرح بیٹھے ہوئے ہیں۔ اے آشکارا دیکھ، محبوب کے حضور میں ہمارے ٹوٹے ہوئے دل کی کتنی اعلیٰ قدر اور شان ہے۔

عشق و عرفان کی یہ منزل اور کیفیت جب سالک کو حاصل ہو جاتی ہے تو وہ اسی حال میں محو و مستغرق رہتا ہے۔ یہاں پر ظاہر بین عقل کی مجال نہیں کہ رسائی پا سکے، کیونکہ عشق و عرفان کی یہ صفت، آتش ہے، اور اس کا راز ''نیستی'' میں ہے۔ یعنی انسانی جسمانی وجود کا فنا ہونا، روحانی اور باطنی حقیقت کا روشن ہونا ہے۔ یہی ''حق'' اور ''حقیقت'' کی علامت ہے جہاں پر ''وحدانیت'' اور ''یکتائی'' ہے۔ عشق مقصد حیات ہے اور کائنات کے وجود میں جاری ہے۔ انسان و جن، نباتات و حیوانات اور تمام مخلوقات کائنات میں عشق کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔

در حقیقت عشق، طریقت کا اہم رکن ہے، اور یہ صرف کامل انسان کو میسر آسکتا ہے۔ عشق کے مقام پر عقل حیران و نادان ہے، لیکن عاشق وہاں قربان ہے اور اس کے سامنے پنہاں بھی عیاں ہے۔ شیخ عطار فرماتے ہیں:

عین و شین و قاف را اندر کتب تفسیر نیست		شاہ و شنگولی و ھند و گدا و میر نیست

عین، شین، قاف (عشق) کی تفسیر کتابوں میں موجود نہیں۔ عشق جہاں بھی جاگزین ہوا، تو شاہ و گدا، غلام و امیر سبھی پنہاں ہو گئے، یعنی ''عشق'' کے سوا کوئی باقی نہ رہا۔)

سچل فقیر بھی عطار کی طرح، عشق کی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (۴۱)

عشق در آدم آمد در کشود سرِّ مولیٰ اندران پیدا نمود
عشق آتش در دو عالم افگند عشق از ''من رآنی'' نعرہ زند

یعنی عشق نے آدم میں آ کر جلوہ نمائی کی، جس کی وجہ سے اللہ کے پوشیدہ راز انسان کے اندر نمودار ہو گئے۔ عشق نے درد کی آگ کو دونوں جہانوں میں بھڑکایا اور عشق ہی کے غلبے سے حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام نے فرمایا کہ ''من رآنی فقد راء الحق'' یعنی جس نے میرا دیدار کیا، اس نے اللہ کا دیدار کیا۔ یہ نعرہ ہی عشق نے لگایا تھا۔

مختصراً یہ ایک حقیقت ہے کہ شیخ عطار اور سچل فقیر دونوں عارف و عاشق اور اسلام کے درویشوں میں سے تھے۔ دونوں نے وحدانیت (ذات حقیقی) کے اسرار کا مستی اور جذب کے عالم میں اظہار کیا۔ دونوں رب تعالیٰ کی رضا کے قائل تھے اور جسمانی جادوگری اور دنیاوی

Marfat.com

کشش سے آزاد اور ذات حق جو کہ حسن و رعنائی کے کمالات کا مجموعہ ہے، کے عشق میں مستغرق تھے، کیونکہ عشق حقیقی خود، حقیقی محبوب کا "لقا" و پرتو ہے:(۴۲)

در بحر توحید خود را غرق کن تا روی در بارگاه ذوالمنن
تو باتش عشق خود را خاک ساز تا تو گردی از تذرو شاه باز

حوالہ جات

۱۔قاضی علی اکبر درازی، دیوان آشکار، مہران پبلشرز، منصورہ، کراچی، 1981ء جلد اول، ص ۷

۲۔مولانا محمد صادق رانی پوری، سچل جو رسالو، (سرائیکی کلام) روشنی پبلیکیشن، کنڈیارو، ۱۹۹۷ء، ص ۳۷۸

۳۔دیوان آشکار، بکوشش قاضی علی اکبر درازی، جلد اول، مہران پبلشرز، منصورہ، کراچی، ۱۹۸۱ء دیوان آشکار، جلد دوم، بکوشش قاضی علی اکبر درازی، مہران پبلشرز، کراچی، ۱۹۸۲ء

۴۔دیوان خدائی، بکوشش قاضی علی اکبر درازی، سچل سرمست کواپریٹو اکیڈمی، خیرپور، ۱۹۶۸ء ؛ ۱۹۷۹ء

۵۔مثنوی عشق نامہ، بکوشش قاضی علی اکبر درازی، سچل سرمست کواپریٹو اکیڈمی، خیرپور، ۱۹۶۲ء

۶۔دردنامہ، بکوشش قاضی علی اکبر درازی، سچل سرمست کواپریٹو اکیڈمی، خیرپور، ۱۹۶۳ء

۷۔مثنوی گداز نامہ، بکوشش قاضی علی اکبر درازی، سچل سرمست کواپریٹو اکیڈمی، خیرپور، ۱۹۶۳ء

۸۔مثنوی تار نامہ، بکوشش قاضی علی اکبر درازی، اتحاد پریس، سکھر

۹۔مثنوی رہبر نامہ، بکوشش قاضی علی اکبر درازی، سچل سرمست کواپریٹو اکیڈمی، خیرپور، ۱۹۶۴ء

۱۰۔مثنوی وصلت نامہ، بکوشش قاضی علی اکبر درازی، سچل سرمست کواپریٹو اکیڈمی، خیرپور، ۱۹۶۵ء ؛ ۱۹۷۸ء

۱۱۔ملاحظہ ہو: عثمان علی انصاری، رسالو سچل سرمست (سندھی کلام) سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد، سندھ، ۱۹۵۸ء

۱۲۔مولانا محمد صادق رانی پوری، رسالو سچل سرمست (سرائیکی کلام)، روشنی پبلیکیشن، کنڈیارو، ۱۹۹۷ء

۱۳۔دیکھیے: سعید نفیسی: جستجو در احوال و آثار فرید الدین عطار نیشاپوری، کتاب فروشی اقبال، تہران، ۱۳۲۰ شمسی

۱۴۔دکتر داریوش صبور، عشق و عرفان و تجلی آن در شعر فارسی، کتاب فروشی زوار، تہران، ۱۳۴۹ شمسی، ص ۱۲۵۔۱۲۹، ۱۸۰

۱۵۔ایضاً، ص ۱۲۵

۱۶۔دیوان آشکار، جلد اول، ص ۱۲۔ سچل فقیر نے دیوان آشکار (جلد اول، ص ۸۹) میں نیشاپور اور عطار کو جا بجا یاد کیا ہے اور اس کے فکرِ عرفان سے بہت زیادہ متاثر ہے:

بین کوچہ و بازار نشاپور پُر از درد مشہور ہمانجا شد عطار بود مرد
فرمود کہ در راہ خدا رنج بہ از گنج ہرگز نبود عاشق آشفتہ و دل سرد

Marfat.com

عطار چنان گفت بخور جام می عشق　　پنہان ''آشکار'' شب و روز صفا ورد

دیوان آشکار (جلد دوم) میں ارشاد ہوتا ہے:

ای صبا با ما حقیقت شہر نیشا پور کن　　می کنم قربان بر آن خاک زمین این جان و تن
عرض کن از حالت بیچارہ عاشق در حضور　　کز خم میخانہ می در جامِ خالی در فگن
در دوئی افتادہ ام بخشی بیکدانی دوا　　رستگاری دہ مرا از قید و بندِ ما و من
خواہ از عطار کہ آن محبّ در پیر مغان است　　از ولی اللہ دعا ای ''آشکار'' را خویشتن (ص ۶۵)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

ای دلا گر درد جوئی سوی نیشاپور برو　　مرد صاحب درد یارم شاہ عطارست درد
کز کلامش مست باشم از جہان بگذشتہ ام　　گر تو ہم عاشق شوی پس وصلت و منطق شنو
کن غلامی در گہش با صدق دل ای ''آشکار''　　از بزرگی، شیخی و پیری، ز ہر سہ دست شو

سچل فقیر اپنی مثنوی رہبر نامہ (ص ۳۸) میں بھی عطار کے عشق وعرفان کے مطالعے کا مشورہ دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ: '' جاؤ اور منطق الطیر کا مطالعہ کرو اور عشق کے سمندر میں غوطہ لگاؤ۔ ایک ورق وصلت نامہ کا پڑھو تاکہ ذاتِ واحد کے اسرار تم پر عیاں ہوجائیں۔ یا رہبر نامہ لے آؤ اسے دیکھو یا خلوت میں بیٹھ کر گوشہ نشینی اختیار کرو، یا عرفاء وعشاق کی صحبت اختیار کرو اور ان کی گفتار سے، عرفاء کے حال کی کیفیت سنو:

رو منطق طیر مطالعہ بکن　　در بحر عشق تو خود را فگن
یک ورق وصلت نامہ بخوان　　تا بتو گردد ہمۂ سر عیان
یا تو بیار رہبر نامہ ببین　　یارو در کنج بگوشہ نشین
یا تو بکن صحبت با عاشقان　　بشنو زان کیفیت عارفان

مثنوی رہبر نامہ، ص ۳۸

۱۷۔وصلتنامہ کے نام سے عطار کے آثار میں کوئی تصنیف نہیں۔ (دیکھیے منطق الطیر بہ تصحیح دکتر محمد جواد مشکور، مقدمہ، تہران، ۱۹۶۸ء)، البتہ سچل فقیر کے آثار میں مثنوی وصلتنامہ شامل ہے۔

۱۸۔دیوان آشکار، ص ۹۰

۱۹۔رضا زادہ شفق، تاریخ ادبیات ایران، دہلی، ۱۹۵۵ء، ص ۱۶۸۔۱۶۰

۲۰۔ایضاً، ص ۱۶۹

۲۱۔ایضاً، ص ۱۷۰

۲۲۔ایضاً، حضرت سلطان باہو فرماتے ہیں:

یکی گویم یکی جویم یکی در دل چو گل رویم　　ہمون یک را بیک پویم نہ پویم الا ہو

۲۳۔رہبر نامہ، ص ۵۲

۲۴۔تاریخ ادبیات ایران، ص ۱۷۱

۲۵۔گداز نامہ، ص ۱۰

۲۶۔شیخ فرید الدین عطار، منطق الطیر، باہتمام دکتر سید صادق گوہرین، بنگاہ ترجمہ ونشر کتاب، تہران ۱۳۴۲ شمسی، ص ۲۲۱، ۲۲۰

Marfat.com

۲۷۔ایضاً، ص ۲۳۵
۲۸۔دیوان آشکار، جلد دوم، ص ۱۹۱
۲۹۔ایضاً، ص ۱۹۲
۳۰۔دیوان عطار، ص ۴۹
۳۱۔دیوان آشکار، جلد اول، ص ۱۶۴
۳۲۔دیوان عطار، ص ۲۴
۳۳۔دیوان آشکار، جلد اول، ص ۱۳۴
۳۴۔دیوان عطار، ص ۵۰
۳۵۔دیوان آشکار، جلد اول، ص ۱۴۵
۳۶۔دیوان عطار، ص ۵۱
۳۷۔عشق نامہ، ص ۱۳
۳۸۔دیوان عطار، ص ۱۵۸
۳۹۔دیوان آشکار، جلد اول، ص ۱۸
۴۰۔اس میں ''العشق نارٌ یُحرق ما سوی اللہ'' کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی عشق ایسی آگ ہے جو اللہ کے سوائے سب کو جلا دیتی ہے۔ ''سمندر'' ایک ایسا کیڑا ہے جو کہ آگ میں پیدا ہوتا ہے اور اسی میں رہتا ہے۔
۴۱۔سچل: مثنوی عشق نامہ، ص ۸، ۱۰
۴۲۔گداز نامہ، ص ۶

☆☆☆

Marfat.com

شاہزادہ اسد عبدالرحمٰن قدسیؒ اور ان کی شاعری

ڈاکٹر محمود الرحمن☆

شاہزادہ اسد الرحمٰن قدسیؒ برصغیر کی مشہور ریاست بھوپال کے رہنے والے تھے۔ آپ کے والد کا اسم گرامی شاہ حبیب الرحمٰن تھا۔ آپ کے جد امجد شیخ الاسلام ابی المکارمؒ جن کا سلسلۂ نسب حضرت امام جعفر صادقؒ سے جا ملتا ہے، سبزوار کے رہنے والے تھے۔ وہیں سے ہجرت کر کے ہندوستان تشریف لائے۔ ان سے جو نسل چلی وہ سادات سبزواری کے نام سے مشہور ہوئی۔ آگے چل کر اس خاندان میں ایک بہت مشہور بزرگ حضرت شاہ نجف علیؒ گذرے جو حضرت قدسیؒ کے دادا تھے۔

حضرت قدسیؒ کے نانا، علامہ محمد اسحٰقؒ کے والد علامہ خیرالدین، والی افغانستان امیر عبدالرحمٰن خان کے اتالیق رہ چکے تھے۔ خود علامہ اسحٰق بھی شاہ افغانستان کے معتمد خاص تھے۔ علامہ محمد اسحٰق کی شادی امیر عبدالرحمٰن خان نے کابل میں سادات سبزواری کے ایک خاندان میں کردی تھی۔ ان ہی کی صاحبزادی جو شاہ حبیب الرحمٰن کے عقد میں آئیں، ہمارے ممدوح حضرت شاہزادہ اسد الرحمٰن قدسی کی والدہ معظمہ تھیں۔ واضح رہے کہ والیٔ بھوپال کی درخواست پر علامہ اسحٰق بھوپال آگئے تھے اور یہاں عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ خصوصاً شعبۂ ترجمان القرآن کی صدارت بھی آپ کے سپرد ہوئی۔ تفسیر ابن جریر طبری کے اردو ترجمہ کا کام آپ ہی کے زیر نگرانی شروع ہوا تھا۔

حضرت قدسی کے والد شاہ حبیب الرحمٰن نے تعلیم و تربیت اپنے حقیقی ماموں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے حاصل کی اور پھر بھوپال میں سکونت اختیار کرلی۔ یہیں مولانا جمال الدین، وزیر اعظم بھوپال کے نواسے علامہ محمد اسحٰق کی صاحبزادی سے ان کا عقد ہوا۔

جیسا کہ قبل ازیں عرض کیا گیا، علامہ محمد اسحٰق کابل میں سادات سبزواری میں متاہل ہوئے تھے۔ ان کی صاحبزادی، یعنی حضرت قدسی کی والدہ بہت پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ موصوفہ نے اپنے والد علامہ محمد اسحٰق سے عربی قواعد سیکھے تھے۔ وہ حافظ کلام اللہ تھیں۔ اس کے

☆نگران، دفتری اردو پراجیکٹ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

Marfat.com

علاوہ انہوں نے قرآن مجید کا ترجمہ اپنی والدہ محترمہ سے پڑھا تھا جو علوم دینیہ پر کافی عبور رکھتی تھیں۔

حضرت قدسی کی والدہ محترمہ کی زبان فارسی تھی۔ اردو اور پشتو بھی نہایت روانی سے بولتی تھیں۔ موصوفہ نے بھوپال میں مستورات کے لیے درس ہدایت کا سلسلہ بھی جاری کیا۔ آپ کا اپنا معمول یہ تھا کہ فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد روزانہ ایک منزل تلاوت فرما کر ہفتہ میں قرآن مجید ختم کرلیتی تھیں۔ اگر گھر میں آئے ہوئے مہمانوں کی کثرت اور کام کی زیادتی کی وجہ سے کسی دن بعد نماز فجر منزل پوری نہ ہوتی تو نماز عشاء کے بعد بقیہ منزل حفظ تلاوت فرماتیں۔ جس روز حضرت قدسی دنیا میں تشریف لائے اسی رات آپ کی والدہ نے سورۂ یوسف تلاوت کرکے آرام کیا تھا۔ عالم خواب میں دیکھا کہ صبح کا روشن ستارہ ٹوٹ کر آپ کی گود میں آگیا ہے۔ بیدار ہونے پر اس مبارک خواب کی تعبیر کا آغاز ہوا یعنی حضرت قدسی صبح صادق کے وقت، ۱۲ رجب ۱۳۰۹ھ کو دوشنبہ کے روز عالم وجود میں آئے۔

جب حضرت قدسی ذرا بڑے ہوئے تو اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ وضو کرتے اور انہی کے ساتھ نماز پڑھتے۔ جب آپ چار سال کے ہوئے تو آپ کی والدہ محترمہ نے آپ کو قرآن پڑھانا شروع کیا۔ ایک دن موصوفہ کو محسوس ہوا کہ آپ سوتے میں کچھ پڑھ رہے ہیں۔ جب موصوفہ نے آپ کے معصوم ہونٹوں سے کان لگایا تو سنا کہ وہ سورۂ رحمٰن کی تلاوت کررہے ہیں۔ حضرت قدسی نے جس دن قرآن ختم کیا اُسی دن آپ کی والدہ ماجدہ نے خواب میں دیکھا کہ نبی کریم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو آپ اول سے آخر تک قرآن شریف سنا رہے ہیں۔ آنحضورؐ نے خوش ہو کر آپ کے سر پر اپنا دست شفقت رکھا اور ایک تھیلا مرحمت فرمایا جس میں اخروٹ کی طرح کے پھل بھرے ہوئے تھے۔

جب حضرت کی عمر سات سال کی ہوئی تو والد بزرگوار کے زیر نگرانی کتابی تعلیم شروع ہوئی جو مسلسل سات برس تک جاری رہی۔ اس دوران حضرت قدسی نے شاہ حبیب الرحمٰن صاحب سے قرآن، تفسیر، حدیث اور فقہ کی مکمل تعلیم حاصل کی۔ دوران تعلیم ایک عجیب واقعہ پیش آیا اور وہ یہ کہ آپ کے والد ماجد کے ایک مرید بیگم صاحبہ بھوپال کے دربار سے وابستہ تھے۔ ایک رات حکمران ریاست بیگم بھوپال کا نولکھا ہار چوری ہوگیا۔ تمام ڈھنڈیا پڑی لیکن ہار نہ ملا۔ والی ریاست بھوپال ہار کی گمشدگی پر بے حد رنجیدہ تھیں۔ ظاہر ہے عورت کے لیے زیور بہت بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ ان کی دل گرفتگی کو دیکھ کر حضرت شاہ حبیب الرحمٰن کے مذکورہ مرید نے عرض کیا کہ ''شاہ حبیب عبدالرحمٰن سے دعا کروایئے۔ بزرگ

Marfat.com

آدمی ہیں۔ ہار مل جائے گا" یہ سن کر بیگم صاحبہ نے کہا کہ" وہ تو مولوی آدمی ہیں۔"

حضرت شاہ حبیب الرحمٰن قلندرؒ کے مذکورہ مرید کو بیگم بھوپال کی بات سے سخت صدمہ پہنچا۔ وہ سیدھے آپ کے پاس آئے اور سارا ماجرا بیان کیا۔ اس وقت گیارہ سالہ حضرت قدسی سبق یاد کر رہے تھے۔ شاہ صاحب نے اپنے بیٹے سے فرمایا: " اسد بیٹے! اپنی کاپی سے ایک ورق کاغذ پھاڑ کر مجھے دو۔ اور اپنا قلم دوات بھی!" چنانچہ حضرت قدسی نے یہ سب چیزیں پیش کر دیں۔ شاہ حبیب الرحمٰن صاحب نے اس کاغذ پر کچھ لکھا، اس کی گولی بنائی اور مرید کو دے کر فرمایا: " بیگم صاحبہ کی خدمت میں میرا سلام کہنا اور یہ عرض کرنا کہ کل بھوپال کی پوری خلقت کو شاہی تالاب پر جمع ہونے کا حکم دے دیں۔ پھر خود وہاں شاہی سواری میں تشریف فرما ہو کر اپنے دست مبارک سے یہ گولی تالاب میں ڈال دیں اور قدرت کا تماشا دیکھیں۔" چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جوں ہی بیگم صاحبہ بھوپال نے اپنے ہاتھ سے کاغذ کی وہ گولی تالاب میں ڈالی، اس کے چند ثانیے کے بعد ایک مچھلی نمودار ہوئی۔ اُس کے منہ میں نولکھا ہار تھا۔ قارئین گرامی فیصلہ فرما دیں کہ کاغذ، قلم اور روشنائی نوجوان اسد الرحمٰن قدسی کی تھی اور تحریر ان کے والد اور روحانی مرشد حضرت شاہ حبیب الرحمٰن قلندرؒ کی، تو یہ معجزہ مشترکہ ہوا کہ نہیں اور وہ بھی بہت قدیم دور میں نہیں، بیسویں صدی کے اوائل میں۔ سچ کہا ہے شاعر مشرق، علامہ اقبال نے:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز

حضرت قدسی کے والد بزرگوار نے مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے آپ کو لاہور بھیج دیا اور اپنے دوست امیر ملت پیر جماعت علی شاہ کو ان کا نگران مقرر کر دیا۔ اسی شہر میں حصول تعلیم کے دوران ہمارے ممدوح نے ایک روز ایک بڑھیا کو دیکھا کہ لکڑیوں کا ایک بھاری گٹھا سر پر اٹھائے جا رہی ہے۔ آپ نے جلدی سے اس کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا اور اس کے گھر تک پہنچا دیا۔ اسی طرح ایک روز ایک بھنگی غلاظت سے بھرا ہوا ٹوکرا اٹھائے جا رہا تھا کہ معاً اسے ٹھوکر لگی۔ وہ گرنے ہی والا تھا کہ نوجوان قدسی نے لپک کر اس کا غلاظت بھرا ٹوکرا سنبھالا اور بھنگی کو گرنے سے بچا لیا۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ" ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد!"

لاہور ہی کے دوران قیام ایک دن آپ مدرسے سے واپس رہائش گاہ جا رہے تھے کہ ایک بڑی سی عمارت کے سامنے بھیڑ دیکھی۔ سبب معلوم کیا تو پتہ چلا کہ ایک انگریز جادوگر اپنی جادوگری کا تماشا دکھائے گا۔ حضرت قدسی بھی ہال کے اندر چلے گئے اور ایک جگہ خاموشی سے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں وہ غیر ملکی ساحر اپنے ترجمان کے ساتھ آیا اور یہ اعلان کروایا کہ

Marfat.com

سارا مجمع اپنے اپنے ہاتھ اوپر اٹھالے اور پوری قوت سے اٹھائے رہے۔ پھر جادوگر اپنے جادو کے زور سے سب کے ہاتھوں کو گرا دے گا۔ چنانچہ لوگوں کے ہاتھ فضا میں بلند ہوئے اور ''جادو'' کے زور سے ایک ایک کر کے گرتے چلے گئے مگر نوجوان قدسی کے دونوں ہاتھ بلند رہے۔ وہ انگریز لاکھ گرانے کی کوشش کرے، مگر شاہزادہ اسد عبدالرحمٰن قدسی کے ہاتھ بلند کے بلند رہے۔ وہ جادوگر پسینے پسینے ہوگیا اور دوڑ کر آپ کے پاس آیا اور پھر کہنے لگا:

''نوجوان! کیا تم جادوگر ہو؟''

''نہیں، قطعاً نہیں!'' جناب قدسی نے جواب دیا۔

''پھر تمہارا ہاتھ کیوں نہیں گرتا؟''

''میں درود شریف پڑھتا ہوں۔ مجھ پر کوئی جادو وادو، اثر نہیں کر سکتا۔''

وہ انگریز جادوگر' جس نے لاہور کے ایک ہال میں بیٹھے ہوئے سینکڑوں افراد کے ہاتھ چشم زدن میں گرا دیے، نوجوان قدسی کے ہاتھوں کو جنبش دینے میں ناکام رہا۔ بقول علامہ اقبالؒ:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تم ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

اٹھارہ برس کی عمر میں درسی تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد حضرت قدسی بھوپال آ گئے۔ پھر والد محترم کی نگرانی میں روحانی مشاغل کا سلسلہ شروع ہوا۔ کچھ عرصے بعد شاہ حبیب الرحمٰن صاحبؒ نے حضرت قدسی کو اپنا جانشین مقرر کیا اور وفات پا گئے۔ رحلت سے قبل یہ ہدایت فرمائی کہ'' میری وفات کے بعد بارہ برس تک مجاہدات میں مشغول رہنا اور کتاب و سنت کے بغیر کوئی عمل اختیار نہ کرنا۔''

چنانچہ ہمارے ممدوحِ گرامی نے اپنے والد ماجد کے حکم پر پوری طرح عمل کیا اور کامل بارہ سال سخت مجاہدے میں مصروف رہے جس کی تکمیل کے بعد آپ نے برصغیر پاک و ہند کے مشہور و معروف اولیاء اللہ کے مزارات پر حاضری دینے اور بعض اہم مقامات پر چلہ کش ہونے کے لیے طوالانی سفر اختیار کیا۔ آخری چلہ بمبئی کے قریب کوہ ملنگ پر حضرت حاجی بابا ملنگؒ کی درگاہ میں پورا کیا۔ یہ پہاڑ حد درجہ نوکیلا اور خطرناک ہے، سمندر میں گھرا ہوا ہے۔ اس پر چڑھنا کارے دارد ہے۔

حضرت قدسی نے ۱۳۵۷ھ میں سفرِ حج اختیار کیا اور مدینہ منورہ میں سرکار دو عالمؐ کے روضۂ اقدس پر حاضری دی۔ وہیں آپ شیخ المدینہ حضرت سید حمزہ رفاعیؒ کی زیارت سے

Marfat.com

بھی فیضیاب ہوئے۔ آں بزرگ نے حضرت قدسی کو اپنا تجدید شدہ طریقہ تفویض فرما کر خلعتِ خلافت سے سرفراز کیا۔

شاعر مشرق علامہ اقبال کو حضرت قدسی سے خاص الفت و عقیدت تھی۔ اس کی نمایاں وجہ یہ تھی کہ اقبالؒ کے مرشد حضرت گل حسن شاہ قلندرؒ کا حضرت اسد الرحمٰن قدسی سے خاص تعلق تھا۔ نیز ان کے صاحبزادے حضرت فضل شاہ قلندر کاشمیری آستانہ قدسی، بھوپال میں اکثر حاضری دیا کرتے تھے۔ میں یہاں یہ واضح کردوں کہ حضرت قدسی کی ہی تحریک پر علامہ اقبال نے جواب شکوہ لکھا تھا۔ بغرض علاج بھوپال میں قیام کے دوران اقبال ایک دفعہ شمس العلماء سید احمد، خطیب جامع مسجد دہلی کے ہمراہ آستانہ قدسی پر حاضر ہوئے اور وہاں کے روح پرور ماحول سے متاثر ہو کر آپ نے یہ قطعہ کہا:

چشمۂ فیض تشنہ لب کے لیے
مرکز رُشد بہر اہلِ صفا
کوئی سمجھے تو ہے مقام قدس
آستانہ جناب قدسی کا

علامہ اقبال نے ہی گل حسن شاہ صاحبؒ کی رحلت کی خبر حضرت قدسی کو بذریعہ خط بہم پہنچائی تھی۔ ویسے دونوں میں مسلسل خط و کتابت رہتی تھی۔

قیام پاکستان کے بعد شاہزادہ اسد عبدالرحمٰن قدسی ہجرت کر کے یہاں آ گئے تھے۔ پھر مختلف مقامات پر فروکش رہ کر ضلع چکوال کے ایک قدیم قصبہ بھون تشریف لے گئے جہاں آپ نے مستقل سکونت اختیار کرلی۔ اس گراں مایہ صوفی باصفا، عالم باعمل، منبع علم و عرفان ہستی نے جو درجنوں کتابوں کی مصنف، فارسی و اردو کی شاعر اور ہزاروں بندگانِ خدا کی روحانی مرشد و رہنما تھی ۸۸ سال کی عمر میں ۱۲ ذی الحجہ ۱۳۹۷ھ مطابق ۲۴ نومبر ۱۹۷۷ء کی شام داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور دوسرے دن، جمعۃ المبارک کو بعد نماز عصر اپنی وصیت کے مطابق ''آستانہ قدسی'' (بھون) میں مدفون ہوئے۔ آپ کا مزار مبارک مرجع خلائق ہے۔

شاہزادہ اسد الرحمٰن قدسیؒ کو نظم و نثر دونوں پر قوتِ تامہ حاصل تھی۔ نثر میں لکھی ہوئی آپ کی کتابیں حسب ذیل ہیں: ۱۔ صراط مستقیم ۲۔ شرعۃ المتین ۳۔ منہاج المبین ۴۔ جہاں نما ۵۔ اطمینان قلب ۶۔ علم و عرفان ۷۔ علم بیان ۸۔ معارف و طریقت ۹۔ کشکول قلندری ۱۰۔ تحفۂ درویش ۱۱۔ الطاف سبحانی ۱۲۔ معمولاتِ رحمانی ۱۳۔ آیات ربانی ۱۴۔ الحبیب ۱۵۔ نامۂ قدسی سلوک و معرفت کے موضوع پر لکھی ہوئی یہ سب کتابیں لکھنؤ، دہلی، لاہور، کراچی

Marfat.com

وغیرہ سے شائع ہوئی تھیں۔ اب تصوف کے گراں قدر موضوع پر لکھی ہوئی ان نایاب کتابوں کو حضرت قدسی کی منہ بولی بیٹی سیدہ زہرہ بتول، جو عرصے سے بیرون ملک مقیم ہیں، شائع کرا رہی ہیں اور ان کا حصول آستانہ قدسی بھون ضلع چکوال سے ممکن ہوگیا ہے۔ یہاں یہ عرض کردوں کہ حضرت شاہزادہ اسد الرحمٰن قدسی نے کبھی شادی نہیں کی تھی۔ آپ ہمیشہ عبادت و ریاضت، تبلیغ دین، رشد و ہدایت اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے تھے۔

حضرت قدسی کے کلام بلاغت نظام کے مندرجہ ذیل تین مجموعے ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۸ء تک مختلف اوقات میں شائع ہوئے جو اب نایاب ہیں اور انہیں بھی بتول زہرہ ہی دوبارہ شائع کرانے کا اہتمام کررہی ہیں:

۱۔ کلام قدسی (منظومات)　　۲۔ نغمات (غزلیات)　　۳۔ رباعیات قدسی

جیسا کہ راقم نے ابتدائے مضمون میں عرض کیا تھا، حضرت اسد الرحمٰن قدسی کی والدہ محترمہ کا تعلق کابل سے تھا اور ان کی زبان فارسی تھی۔ لہٰذا حضرت قبلہ کی مادری زبان بھی فارسی ہی تھی۔ ایسی صورت حال میں اس زبان دلنشیں پر آپ کو عبور حاصل ہونا ناممکن نہ تھا۔ میرے اس قول کی صداقت کا ثبوت صہبا لکھنوی مرحوم کی کتاب اقبال اور بھوپال سے بخوبی مل جاتا ہے۔ مصنف نے علامہ اقبال کے حوالے سے ایک واقعہ لکھا ہے:

علامہ اقبال بھوپال میں شاہی مہمان تھے۔ نواب زادہ فخرالملک محمد سعید اظفر خان بہادر ملاقات کے لیے مہمان خانے پہنچے تو عمائدین ریاست بھی موجود تھے۔ وہاں عمر خیام کی رباعیات کا تذکرہ چل نکلا۔ حاضرین میں سے کسی نے رباعیات سرمد شہید کی تعریف کی۔ حضرت علامہ نے فرمایا، اپنے اپنے مذاق کے مطابق رباعیات عمر خیام اور رباعیات سرمد شہید بہت بلند پایۂ کلام ہے۔ ہر زمانے میں بہ تقاضائے حالات و ماحول مذاق میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے جیسا کہ مثنوی مولانائے روم اور میری مثنوی سے ظاہر ہے۔ مجھے تو حالات حاضرہ اور موجودہ ماحول کے مذاق میں جناب قدسی کی رباعیات میں بڑی معنی آفرینی نظر آتی ہے۔ بعض رباعیاں بے حد دلکش ہیں۔ ایک رباعی تو اکثر زبان پر آتی ہے۔

ہر ذرہ بہ وسعتے بیابانے ہست
ہر گل بہ لطافتی گلستانے ہست

در دیدۂ مردمان اہل بینش
ہر قطرہ بہ جوش گریہ طوفانی ہست

جب بات حضرت قدسی کے فارسی کلام کی چل نکلی ہے تو راقم یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ

Marfat.com

سکتا کہ حضرت کی شاعری آپ کی روحانی زندگی کی آئینہ دار ہے۔ آپ کا کلام ایک عارفانہ کلام ہے جس میں مشاہدہ حق بھی ہے اور مشاہدہ حسن بھی اور مشاہدہ حیات بھی! زبان کی سلاست و روانی، جذبے کی صداقت، فکر کی وحدت، ندرتِ تخیل، تشبیہات و استعارات کی شگفتگی آپ کے کلام کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

میں پہلے حضرت قدسی کے فارسی کلام کے چند نمونے پیش کروں گا، بعد ازاں آپ کی اردو منظومات و غزلیات کے چیدہ چیدہ اشعار نذر قارئین کروں گا۔

فارسی رباعیات

داغ غم عشق، ہمچو ماہے دارم
تاریکی شب چو صبحگاہے دارم
یابم ہمہ آفاق و نیابم چیزے
درویشم و دل چو بادشاہے دارم

☆☆☆

گویم کہ بہ خواب صد تماشا دیدم
رنگ چمن و بہار گلہا دیدم
لیکن بہ دل آئینہ سامان قدسی
ہر آنکہ نہ دیدہ بود پیدا دیدم

☆☆☆

تا کی بہ چمن بہار دیدن بس بس
تا کی گل رنگ رنگ چیدن بس بس
این چیست کہ بر بہار تکیہ کردی
تو آمدۂ برائے رفتن، بس بس

☆☆☆

از دیدہ نہاں جلوۂ جاناں تا کی؟
قلب مغموم و چشم گریاں تا کی؟

چون صبح وطن بہ بین جمالش قدسی
پیش نظرت شامِ غریباں تا کی؟

Marfat.com

غزلیات

میسر گرچہ خلوت بوذ شب جائیکہ من بودم
ز رعبِ حسن حیرت بود شب جائیکہ من بودم
بہر لب نالۂ پیہم، بہر دل شورشِ ماتم
بہرگم طرفہ حسرت بود شب جائیکہ من بودم
بہ آغوش صبا آمد شمیم گیسوے مشکیں
عجب مستانہ نکہت بود شب جائیکہ من بودم
بہ شیشہ بادۂ رنگین بہ بر آرام دل قدسی
بہ گردش جام عشرت بود شب جائیکہ من بودم

☆☆☆

جوش زد بادۂ گل رنگ بہ میخانۂ دل
بحر دارد بہ درون قطرۂ پیمانۂ دل

☆☆☆

اگر مقام رضا یافت پیر در صد سال
رسید رند بہ یک جام بر مقامِ نشاط

☆☆☆

بادشاہی میکنم با عز و جاہ
تاج زر دارم نہ ایوان و سپاہ
حکم بر افلاک و انجم میکنم
اللہ اللہ رفعتِ حال تباہ

اردو کلام

ہر جام میں ہے سرور کس کا قدسی
ہر پھول میں ہے ظہور کس کا قدسی
ہر شے میں کہاں سے آگئی تابانی
ہر ذرہ میں ہے یہ نور کس کا قدسی

Marfat.com

گزرے ہیں بہت حکیم و دانا اب تک
لیکن نہ سمجھ میں راز آیا اب تک
ادراک کی کیا مجال پہنچے سر عرش
اپنا ہی نہ بھید پایا اب تک

☆☆☆

ذوق بیدار اگر رہبر کامل ہوتا
چل کے دو چار قدم، میں سر منزل ہوتا

☆☆☆

کہاں کا جلوۂ حجاب کس کا، ادائیں کیسی، شباب کس کا
خدا ہی جانے کہ دل ہوا ہے مرا تباہ و خراب کس کا

☆☆☆

ہیں یہی طوفان جو امواج تلاطم خیز میں
ایک دن کشتی پہنچ جائے گی ساحل کے قریب

☆☆☆

ہمت ہے تو مشکل کوئی مشکل نہیں قدسی
طے دم میں ہوا جاتا ہے میدان حوادث

☆☆☆

ناکام التجائیں، برباد آرزوئیں
اس ایک دل میں کتنے ویرانے بن گئے ہیں

☆☆☆

دل عرش بریں، دل کعبۂ دیں، اسرار مراحل کوئی نہیں
کیوں منزل منزل کہتے ہیں جب عشق میں منزل کوئی نہیں

☆☆☆

اگر میں کام لوں وحشت میں اپنے جذبۂ دل سے
چمن کی نزہتیں کھچ کھچ کے آجائیں بیاباں میں

Marfat.com

پتہ دیتے ہیں اک گزرے ہوئے طوفان کا قدسی
وہ آنسو منجمد ہیں آج جو آغوش مژگاں میں

مآخذ

اقبال اور بھوپال از صہبا لکھنوی، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۷۳ء
تذکرہ قلندر زماں اسد الرحمن قدسی از حسن عزیز جاوید رحمانی، کراچی، ۱۳۸۶ھ
رباعیات قدسی از اسد عبدالرحمٰن قدسی، کراچی ۱۹۶۸ء
فیضان قدسی، مرتبہ صوفی حبیب اللہ کشمیری، لاہور، ۱۹۵۴ء
کلام قدسی از سید اسد الرحمٰن قدسی، بھوپال، ۱۳۵۷ھ
لطائف قدسیہ از ڈاکٹر اکرام علی، کراچی، ۱۹۸۸ء
نغمات از سید اسد الرحمٰن قدسی، بھوپال، ۱۹۳۸ء

☆☆☆

Marfat.com

عطاء اللہ خان اور امت مسلمہ

عنایت اللہ خان گنڈا پور☆

آقائے عطا اللہ خان وطن عزیز پاکستان کے معمر ترین فارسی شاعر تھے۔ انہوں نے ۹۳ سال کی طویل عمر پائی اور ان کے ساتھ ہی برصغیر ہند و پاکستان میں کلاسیکی فارسی شاعری کا آخری دور اختتام کو پہنچا۔ بیسویں صدی کی آخری دہائی میں ۲۵ مارچ ۱۹۹۱ء کو وہ ایک ایسے وقت فوت ہوئے جب اکیسویں صدی کے شروع ہونے میں نو سال باقی تھے۔ جب پیدا ہوئے تو (۱۸۹۸ء) تو بیسویں صدی کے شروع ہونے میں دو سال باقی تھے۔ اس طرح عطا کی زندگی اور شاعری کا عرصہ تقریباً ایک صدی پر محیط ہے۔ انہوں نے ۷۵ سال سے زائد عرصے تک شاعری کی۔ ۱۹۱۵ء میں باقاعدہ شاعری کا آغاز کیا۔ زندگی کے ۹۳ سال وطن عزیز پاکستان کی سرزمین پر اہلِ علم و ادب کے درمیان بسر کیے لیکن اہلِ ادب ان سے بے خبر ہی رہے۔ فرماتے ہیں:

اہل پاکستان مرا نہ شناختند

آقائے عطا ڈیرہ اسماعیل خان (صوبہ سرحد) کے ریگزار میں پیدا ہوئے۔ جو شخص ڈیرہ اسماعیل خان نہیں گیا وہ اس علاقہ کی کیفیت کا اندازہ نہیں کرسکتا۔ آپ خود اپنے وطن کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

از سواد ڈیرہ اسماعیل خاں خطۂ چوں تابۂ آہن تپان
سرزمین بے گیاہ و سبزۂ ابر گاہش سایبان ناگشتۂ
ریگزارش سوسماران را وطن طائرانش کرگس و زاغ و زغن

اس بے آب وگیاہ سرزمین کو عطا کا زرخیز ذہن گلشن شاداب بنا گیا لیکن وہ خود صحرا کے گل لالہ کی مانند بے نشان ہی رہے اور ان کے رنگ و بو سے کوئی آشنا نہ ہوسکا:

آشنا از رنگ و بویم نیست کس
بے نشان چون لالۂ صحراستم

☆ مدیر سہ ماہی عطا کمشنری بازار محلہ گاڑیان، ڈیرہ اسماعیل خان

Marfat.com

آب و تابم بر کسی ظاہر نہ شد
در تہہ یم لولوئے لالاستم

آپ نے دس ہزار سے زائد اشعار کہے۔ آپ کا شائع کردہ مجموعۂ کلام چار حصوں پر مشتمل ہے۔ کلیات عطا حصہ اول، دوم وسوم اور امان نامہ۔ آپ کو قرآن و حدیث پر مکمل عبور حاصل تھا اور تاریخ اسلام کا گہرا مطالعہ رکھتے تھے اور آپ کے کلام میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور یک جہتی کی شدید خواہش واضح طور پر نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں عالمِ اسلام کی عظمتِ رفتہ اور زوال کی داستان بڑے دلگداز انداز میں بیان کی گئی ہے جس کے مطالعے سے بیک وقت سر فخر سے بلند بھی ہو جاتا اور دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے۔

حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں عرض کرتے ہیں:

ما بتان سنگ را بشکستہ ایم شمع توحید را بر کردہ ایم
ہم جہادے کردہ ایم از بہر دین بہر نام حق نہ بہر بغض و کین
گاہ در پیکار با دیوار چین گاہ با امواج بحر سہمگین
پیروان دین تو بیش از شمار از مراکش تا بہ اقصائے تتار

یعنی ہم نے بتوں کو توڑا ہے اور توحید کی شمع روشن کی ہے۔ ہم نے دین کی خاطر جہاد کیا ہے تاکہ حق کا بول بالا ہو نہ کہ بغض و کینہ کی خاطر۔ ہم دیوار چین سے برسرپیکار رہے اور کبھی خوفناک سمندروں کی موجوں سے۔ آپؐ کے دین کے پیروکار شمار سے زیادہ ہیں۔ مراکش سے لے کر اقصائے تاتار تک پھیلے ہوئے ہیں لیکن حالت کیا ہے ہماری؟

در جہان لیکن بسی خواریم ما عاجز و افتادہ و زاریم ما
راندہ و درماندۂ این روزگار بی سکون و بی قرار و بی وقار
قوم ما ہر سو قطار اندر قطار بی شمار و لیک ناید در شمار
کس نمی پرسد مسلمانان کہ اند قوتِ شان چیست یا خود شان کہ اند

ہم مسلمان اس ترقی یافتہ دور میں خوار و زار، عاجز و افتادہ اور راندہ و درماندۂ روزگار ہیں، بے وقار ہیں۔ کوئی نہیں پوچھتا کہ مسلمان کیا ہیں۔ ان کی قوت کیا ہے، وہ خود کیا ہیں۔ حالانکہ بڑی طاقت ہیں، قوت ہیں۔ ان کی قوت قدرت کی طرف سے ودیعت کردہ لامحدود وسائل ہیں جن میں تیل جیسی اہم قوت بھی شامل ہے۔ اس میں لاکھوں ایٹم بموں سے بھی زیادہ قوت و طاقت ہے۔ کاش کہ وہ خود اس کے مالک ہوتے اور اُسے ایک موثر ہتھیار کے طور پر مغرب کی طاغوتی طاقتوں کے خلاف استعمال کرسکتے۔ بیشتر مسلم ممالک

Marfat.com

کے پاس دولت کے انبار ہیں لیکن سوائے عیاشیوں اور عیش پرستانہ زندگی گذارنے کے اس کا کوئی مصرف نہیں۔

عطا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رحم و کرم کے طلب گار ہوتے ہیں:

در جہان مائیم بس خوار و دژم　　سوے ما کن گوشۂ چشم کرم
اے سوے تو چشم ما چشمی بہ ما　　رحمت اللعالمین، رحمی بہ ما

اس جہاں میں ہم خوار و افسردہ ہیں۔ گوشۂ چشم و کرم ہماری طرف پھیریے۔ حضورؐ ہماری نظریں آپ کی طرف دیکھتی ہیں۔ آپ بھی ہم پر نظر کرم فرمائیں۔

آقائے عطا کی شاعری کا بیشتر حصہ مسلمانانِ عالم کی زبوں حالی کے ذکر پر مشتمل ہے۔ امت مسلمہ کی حالت زار کے وہ عینی شاہد تھے اور یہی امران کے لیے باعث کرب و اضطراب تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ امت مسلمہ کفار و مشرکین کے ہاتھوں ہر جگہ ذلیل و خوار ہورہی ہے۔ دنیا کے ہر گوشے میں مسلمانوں کا قتل عام جاری ہے۔ ظلم وستم کا گھیرا دن بدن ان کے گرد تنگ ہورہا ہے۔ اپنی مدد آپ کرسکتے ہیں نہ آپس میں اتفاق کرسکتے ہیں۔ دنیا کی ایک چوتھائی آبادی ہونے کے باوجود مسلمان غیر ممالک کے دست نگر ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے بے پناہ وسائل عطا کیے ہیں لیکن وہ ان سے فائدہ نہیں اٹھا رہے۔ خوان غیر سے روزی حاصل کرتے ہیں اور ذلت و رسوائی کی زندگی بسر کررہے ہیں۔

بر آب و نانِ غیر توان زیست تا بہ کی　　این زیستن بہ لقمۂ بیگانگان غلط

آقائے عطا مسلمانوں کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں:

ای مسلمانان مسلمان زادگان　　ای ز راہ راست دور افتادگان
ای ز دین برگشتہ بی ذوق یقین　　بر زبان اللہ، بُت در آستین
ای ز حق بیگانہ، مغلوب گمان　　قبلۂ تو آستانِ این و آن
بے وقار و مفلس و خوار و ذلیل　　حاجتت را غیر می باشد کفیل
از مراکش تا بخارا و ختن　　حق ترا داد است اقلیم وطن
این وطن از جورِ جہل تو خراب　　پارہ پارہ چون قصب از مہتاب
جان تو در حلقۂ بندِ فرنگ　　ہمچو ماہی رفتہ در کامِ نہنگ
کافرانِ ہر وطن یک ملت اند　　در مظالم صاحبان جدّت اند
کافران با کافران در ساختند　　رایت کین جا بہ جا افراختند
شکوۂ ما نیست از قومِ ہنود　　یا ز اقوام نصاریٰ و یہود

Marfat.com

ہر چہ بر ما رفت از خود ماست آن — از زبون کردار ما پیدا است آن

آقائے عطا نے بہت پہلے فرمادیا تھا کہ ہر وطن کے کافر آپس میں ایک ملت ہیں۔ کافروں نے کافروں سے سازباز اور گٹھ جوڑ کر رکھا ہے اور آئے دن اپنے مظالم میں جدت سے کام لیتے ہیں۔ ان انسانیت سوز مظالم کو صفحۂ قرطاس پر رقم کرتے وقت قلم کانپتا ہے۔ گو کہ آقائے عطا بوسنیا، کوسوو، چیچنیا اور عراق و افغانستان میں ہونے والے مظالم بہ چشم ظاہر نہ دیکھ سکے لیکن بہ چشم باطن وہ دیکھ رہے تھے کہ مستقبل میں کفار و مشرکین زوال پذیر امت مسلمہ پر کیا کیا ظلم وستم ڈھانے والے ہیں۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی دکھ بھرے لہجے میں فرماتے ہیں کہ مجھے اقوام ہنود و یہود و نصاریٰ سے شکوہ نہیں ہے، ہم پہ جو گذری ہے، جو افتاد پڑی اس کے ہم خود ذمہ دار ہیں۔ ہماری زبوں کرداری کی وجہ سے تباہی و بربادی ہمارا مقدر بنی۔ ہم نے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے نہ پکڑا اور نفاق کا شکار ہوگئے۔

اقوام عرب اپنی قومیت پر فخر کرنے لگیں۔ حضورؐ نے ملت واحدہ کا جو درس دیا تھا اُسے بھول گئے۔ آج عرب ممالک فلسطین و عراق کے سوا عالم اسلام کے دیگر ممالک کے مسائل میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ انہیں کشمیر، بوسنیا، کوسوو، اور افغانستان پر کفار و مشرکین کی طرف سے ڈھائے جانے والے مظالم سے کوئی سروکار نہیں جس کا خمیازہ اور سزا وہ خود بھگت بھی رہے ہیں۔ بیت المقدس یہودیوں کے قبضہ میں ہے اور حجاز مقدس نصاریٰ کی تحویل میں ہے اور اب بغداد اور کربلا بھی۔ چنانچہ عرب قوم کی اس بے حسی اور بے بسی سے متاثر ہوکر آقائے عطا نے ایک درد بھری منقبت "فریاد ملت حزیں بہ پیشگاہ رحمت اللعالمین" لکھی۔ جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

سلام اے شہ کونین و صاحب اعجاز — سلام اے ز تو عالم بہ نزد حق ممتاز
بہ یک اشارۂ تو ماہ می شود دو نیم — بہ سوے مشرق ز تو مہر عصر گردد باز
تو در مدینۂ خود محو راحت و ملت — چو مرغ می تپد اندر گرفت چنگل باز
عدوے قومِ عرب کافران یک عالم — کہ ہمدم اند ہمہ با یہود، ہم دمساز
مدد خلافِ عرب جملہ با یہود کنند — بہ شکل مال و زر و برگ و ساز و توپ و جہاز
بہ ملت تو یہود است بر سرپیکار — ز دشت بدر کفِ خاک برسرش انداز

یہ ایک انوکھی منقبت ہے جس میں حضورؐ کی طرف سے جواب بہ شکل اشعار دیا گیا ہے۔ حضورؐ کا جواب نہایت عبرت انگیز ہے اور عرب قوم کے لیے لمحۂ فکریہ بھی، کہ اس نے امت اسلامیہ سے انحراف کیا ہے اور اپنی قومیت پر فخر کیا ہے جس کی سزا پوری عرب قوم بھگت

Marfat.com

رہی ہے۔

جواب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

عرب ز معنی ملت ہنوز بے خبر اند　　عرب بہ قومیت و نسل خویش فخر کنند
عرب ز ملت من انحراف ورزیدند　　عرب بریدہ اند از من بہ غیر ساختہ اند
پسند کردۂ حق ملت من اسلام است　　چنین نوشتہ بہ قرآن و خود عرب دانند
چو سنگ دور شد از کوہ سنگ گویندش　　چو آن بہ کوہ بود لاجرم بود الوند
خدائے ماست ہمان و من و کتاب ہمان　　مدد ز غیب رسد گر عرب رجوع کنند

ایک اور منقبت کے چند بند پیش ہیں:

ای رسول برحق و ای رحمت اللعالمین　　ای کہ رفتی از زمین بالائے افلاکِ برین
ای کہ دیدی در حضر خود ذات رب اللعالمین　　ای کہ پیہم بودۂ اندر غمِ ملت حزین
امت تو از جفائے زور دستان جان بلب

دشمنان ملت تو روس و امریکۂ لعین　　ہم اروپا دشمن دیرینۂ دین مبین
یا رسول اللہ حالِ ما مسلمانان بہ بین　　خستہ و آوارہ و بے برگ و ساز و بے یقین
امت تو از جفائے زور دستان جان بلب

حال زار کابل و شام و عرب ایران بہ بین　　ہم فلسطین و عراق و مصر و پاکستان بہ بین
کاروان خویش را در ورطۂ طوفان بہ بین　　غلبۂ کفار عالم بر مسلمانان بہ بین
امت تو از جفائے زور دستان جان بلب

قومِ ناخوشنود را از لطف خود خوشنود کن　　یعنی نامحمود را از مرحمت محمودکن
طالعِ ناسازگار قوم را مسعود کن　　رہبری قوم سوئے منزلِ مقصود کن
امت تو از جفائے زور دستان جان بلب

آقائے عطا نے ایک طویل نظم ''درباب ادارۂ علاقائی ترقیاتی تعاون'' لکھی جو ۷۸ اشعار پر مشتمل ہے اور سابقہ آر سی ڈی کے ادارے کے قیام سے کافی عرصہ پہلے معرض تحریر میں آئی تھی۔ اس نظم میں آپ نے چار برادر مسلمان ممالک ترکی، ایران، افغانستان اور پاکستان پر مشتمل علاقائی تعاون کے ادارے کے قیام کی تجویز پیش کی تھی۔ سابقہ آر سی ڈی میں افغانستان شامل نہیں تھا۔ اس نظم کے آخری چند اشعار جو نظم کے مقصد و معنی اور شاعر کی اتحاد اسلامی کی شدید خواہش کا اظہار ہیں، ملاحظہ ہوں:

Marfat.com

پیام بہ چہار ممالک اسلام

پیامم بہ ترکی و ایران یکی است به اقلیم خویش و به افغان یکی است
کہ ما مسلم و اصل ما اعجمی است بہ یک دیگری نسبتِ ما قوی است
گل و برگ یک گلستانیم ما نگارندۂ یک بہاریم ما
اگر خار در پای ایران خلد دل کابل و پاک و ترکی تپد
در آمیز با یک دگر ہمچنان کہ بینیم در انقرہ، اصفہان
بہ لاہور سیر صفاہان کنیم بہ کابل تماشای ملتان کنیم
نشاپور، مشہد، کراچی شوند سمرنا و لاہور، غزنی شوند
بیا تا نمک خوار یک خوان شویم بہ یک دیگری باز اخوان شویم
بیا تا چو طفلان یک مادری رویم و در آئیم از یک دری

تاریخ یقیناً اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ آقائے عطا درج ذیل اشعار میں اس تاریخی عمل کے بارے میں یقین کامل رکھتے ہیں:

باز گردد ملت خیرالامم پیش تو گردد سر اقوام خم
حکم تو جاری شود در بحر و بر از مراکش تا بہ چین و کاشغر
پیروی تو کند عالم دگر ہر کسی را سوی تو باشد نظر
اوستادی عالمی باشی بہ عقل از ہمہ اولی تری گردی بہ فضل

☆☆☆

Marfat.com

مولوی نذیر احمد گجراتی

رباعیات خیام کا ایک گمنام مترجم

ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی☆

فارسی کے عظیم شاہکار گلستان و بوستان سعدی کے بعد رباعیات خیام ایک ایسا سرمایہ ادب ہیں جن کا بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان میں سے فٹز جیرالڈ کا انگریزی ترجمہ سرفہرست ہے ۔ اردو میں بھی اگرچہ چند ایک شعراء نے اس میدان میں اپنی موزوں طبعی کی جولانیاں دکھائی ہیں' لیکن زیادہ شہرت آغا شاعر مرحوم اور پھر عبدالحمید عدم کو حاصل ہوئی ۔ اس مضمون میں ایک ایسے مترجم کا تذکرہ مقصود ہے جس کا تعلق ایک علمی گھرانے سے تھا' لیکن شاعری جس کا باقاعدہ شوق اور پیشہ نہ تھا' اور جس نے صاحب علم فضل ہونے کے باوصف ایک عام سی زندگی بسر کی اور نمود و نمائش سے دامن بچائے رکھا۔

مولوی نذیر احمد مرحوم کا تعلق گجرات شہر سے تھا - ان کی ولادت ۱۸۷۲ء کے لگ بھگ ہوئی ۔ ان کے والد مولوی حافظ امام الدین میونسپل ہائی سکول گجرات میں ریاضی کے مدرس تھے۔ حافظ مرحوم اعلیٰ درجے کے خطیب اور ادیب تھے ۔ کئی ایک تصانیف ان سے یادگار ہیں' مثلاً:

(۱) التنقیح فی ولادت المسیح ' جو انہوں نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل لکھی اور نومبر ۱۹۱۳ء میں مطبع دخانی رفاہ عام لاہور سے شائع ہوئی۔ رسالہ نقوش کے لاہور نمبر (ص ۹۱۵) میں اسے احمد بابا مخدومی سے منسوب کیا گیا ہے جو غلط ہے' اس لیے کہ حافظ مرحوم نے مخدومی کی فرمائش پر اسے شائع کرایا تھا ۔

(۲) سر سیّد کے مذہبی' اخلاقی اور تمدنی لیکچرز (ترجمہ)' فروری ۱۹۰۰ء میں اخبار اشاعت لاہور کے مالک محمد فضل الدین نے شائع کی ۔

☆یزدانی اسٹریٹ، ملت روڈ، سمن آباد، لاہور

Marfat.com

(۳) سرسیّد کے آخری مضامین (مرتبہ) ' دسمبر ۱۸۹۸ء میں لاہور سے فضل الدین ہی نے شائع کی ۔

(۴) اصلاح و رسوم " یہ غالباً وکیل ٹریڈنگ ایجنسی امرتسر نے شائع کی ۔

(۵) رسالہ ایثار ' ۱۹۱۰ء میں رفاہ عام پریس لاہور نے شائع کیا۔

(۶) رسالہ تقویٰ، ۱۹۰۹ء میں مطبع فیض عام ' علی گڑھ سے شائع ہوا۔

(۷) رسالہ زندہ جاوید امام " مطبع فضل ککے زئی سے شائع ہوا۔

(۸) رسالۃ النبی الامیؐ ' اسی مطبع نے شائع کیا۔

(۹) قول الہادی فی تفسیر یا عبادی، ۱۹۰۳ء مطبع مذکورہ۔

(۱۰) تہذیب اللسان، دسمبر ۱۹۰۵ء اخبار وکیل کے مالک غلام محمد نے اپنے مطبع روز بازار، امرتسر سے شائع کی ۔

(۱۱) علم الغیب " مذکورہ مطبع " امرتسر

(۱۲) راست بیانی برشکست قادیانی

(۱۳) اصلاح الانسان بعبادت الرحمن، ۱۳۱۳ہجری ' مفید عام پریس ' لاہور

(۱۴) رباعیات عمر خیام (مرتبہ) ' وکیل ٹریڈنگ بک ایجنسی ' امرتسر

(۱۵) مجموعہ لیکچرز و اسپیچز

اردو کے مشہور ادیب شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد کچھ عرصہ کنجاہ (ضلع گجرات) میں مرحوم حافظ مذکور کے ہمکار رہے تھے جس کے سبب دونوں کے آپس میں گہرے مراسم تھے اور شمس العلماء سے اسی دوستی اور لگاؤ کے باعث حافظ مرحوم نے اپنے لڑکے کا نام نذیر احمد رکھا تھا جن پر یہ مضمون ہے۔ شمس العلماء کے علاوہ حافظ کے سرسیّد مرحوم سے بھی دوستانہ روابط تھے ۔ چنانچہ انہوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد زندگی کا بیشتر حصہ (سرسید مرحوم کی زندگی تک) انہی کی رفاقت میں بسر کیا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خان اور اس دور کی دوسری سربر آوردہ شخصیتوں سے بھی ان کے تعلقات رہے ۔ حافظ مرحوم نے کچھ عرصہ علی گڑھ کالج کے سفیر کے طور پر بھی کام کیا اور اس سلسلے میں کئی ایک بیرونی ممالک مثلاً ایران ' برما ' اور سیلون وغیرہ کا دورہ بھی کیا۔ ایران میں قیام کے دوران انہوں نے رباعیات عمر خیام جمع کیں جو بعد میں امرتسر سے شائع ہوئیں۔ اس میں غلطی سے بعض رباعیات بابا طاہر عریان کی بھی شامل کر دیں۔ ان کے پوتے اور بہاولپور کے معروف اردو شاعر عبدالحمید ارشد(۱) (اب مرحوم) کے بقول ' حافظ مرحوم اپنے آخری ایام میں ایک کتاب بعنوان ''امام الدین'' لکھ رہے تھے لیکن زندگی

Marfat.com

نے وفا نہ کی اور کتاب نامکمل رہ گئی ۔ بعد میں گجرات کے ایک شخص نے یہ اوراق لے کر ان سے چھوٹے چھوٹے رسالے ترتیب دے کر اپنے نام سے شائع کروا دیے ۔

ہمارے ممدوح مولوی نذیر احمد مرحوم نے ایسے علمی، ادبی ماحول میں آنکھیں کھولیں اور اس کا پورا پورا اثر قبول کیا۔ اگرچہ مرحوم نے باقاعدہ تعلیم اسلامیہ کالج " لاہور سے صرف ایف ۔ اے تک حاصل کی تھی لیکن مطالعہ کا انہیں بیحد شوق تھا ۔ انگریزی پر اتنا عبور حاصل تھا کہ اس کا پورا لغت زبانی یاد تھا۔ چنانچہ دفتر میں جہاں یہ ہوتے وہاں ڈکشنری کی ضرورت نہ ہوتی ۔ ریاضی میں مہارت تامہ حاصل تھی ۔ لاطینی زبان بھی خوب جانتے تھے ۔ فارسی ادب پر انہیں پورا پورا عبور حاصل تھا ۔ فارسی شاعری میں مولانا رومؒ کی **مثنوی** اور **دیوان حافظ** سے انہیں گہرا لگاؤ تھا اور **رباعیات خیام** سے تو جنون کی حد تک عشق تھا ۔ حافظہ بلا کا پایا تھا۔ چنانچہ خیام کی بہت سے رباعیاں زبانی یاد تھیں ۔ مولانا غنیمت کنجاہی کی مثنوی اس انداز سے یاد تھی کہ نکتے نکتے اور لفظ لفظ کے معانی بتاتے تھے اور شعر میں ان کے آنے کی وجہ بیان کرتے ۔ انگریزی شاعری سے بھی انہیں بیحد لگاؤ تھا اور ورڈز ورتھ، گولڈاسمتھ، بائرن، کیٹس اور شیلے کی لمبی لمبی نظمیں انہیں یاد تھیں اور شیکسپیئر بھی کافی حدتک ان کے حافظے میں محفوظ تھا۔ اس لحاظ سے مولوی نذیر مرحوم علم کا ایک خزینہ تھے۔

عملی زندگی کا آغاز محکمہ انہار کی ملازمت سے کیا۔ اپنی دیانتداری اور پرہیزگاری کے باعث کسی ایسی سیٹ پر کام کرنا پسند نہیں کرتے تھے جہاں رشوت کا کاروبار یا اس کا احتمال ہو' اسی وجہ سے کوئی ترقی نہ پاسکے۔ البتہ تھوڑے تھوڑے عرصے کے لیے بعض بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ریٹائرمنٹ کے بعد گلشن گرلز ہائی سکول' گجرات میں ریاضی کے استاد کے طور پر کچھ عرصہ کام کیا۔ اپنی دیانتداری' پرہیزگاری اور کم آمیزی و کم گوئی کے باعث انہوں نے نہایت سادہ زندگی بسر کی ۔ ان کا لباس معمولی لیکن صفائی و پاکیزگی کا حامل ہوتا تھا' البتہ کھانے کے بہت شوقین تھے اور عمدہ سے عمدہ کھانا کھاتے۔

افسوس کہ انہوں نے تصنیف و تالیف کی طرف توجہ نہ دی ۔ صرف چار سو کے قریب رباعیات عمر خیام کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ' جو مخطوطہ کی صورت میں ارشد مرحوم کے پاس محفوظ تھا ۔ مولوی مرحوم نے ۱۸ جولائی ۱۹۵۹ء کو' بعمر ستاسی برس' بہاولپور میں وفات پائی اور وہیں کینال کالونی کے قریب واقع قبرستان میں دفن ہوئے ۔

برصغیر پاکستان و ہند میں رباعیات خیام کے جتنے نسخے آج تک شائع ہوئے ہیں ان سب میں بیشتر رباعیات کی خیام سے نسبت مشکوک ہے اور اکثر کا متن بھی چنداں مستند نہیں ۔

Marfat.com

زیر نظر مضمون میں چونکہ ان کے ایک منظوم اردو ترجمے کا تعارف مقصود ہے' اس لیے " نسبت و صحت متن" کی بحث سے اجتناب کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا اردو کے بعض شعرا نے رباعیات خیام کو منظوم اردو کا روپ دیا ہے' جن میں سے دو ترجمے اس وقت زیادہ مشہور ہیں ۔ ایک آغا شاعر قزلباش کا میخانۂ خیام ہے (جس میں ۲۴۰ رباعیات ہیں[۲]) اور جسے بہت مدت ہوئی فیروز سنز پبلشرز، لاہور نے شائع کیا تھا ۔ دوسرا مجموعہ عبدالحمید عدم نے دو جام کے نام سے مرتب کیا۔ اس میں ۱۶۰ رباعیات ہیں اور یہ ۱۹۶۰ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ آغا شاعر کے ترجمے کی سب سے بڑی خوبی زبان کا چٹخارا' محاورہ اور روزمرہ کا عمدہ استعمال اور لب و لہجہ کا گھمبیرپن ہے۔ پھر انہوں نے ترجمہ کرتے وقت رباعی ہی کے اوزان کو پیش نظر رکھا ہے جس سے اکثر جگہ اصل کا گمان ہوتا ہے ۔ مثلاً :

خیام

توبہ مکن از مے اگرت مے باشد	صد تائب باوفات درپے باشد
گل جامہ دران و بلبلان نعرہ زنان	توبہ بچنین وقت روا کے باشد

آغا شاعر

توبہ کی ضرورت ' جو صراحی ہو بھری؟	سو تائب عصر جان دے دیں تو بھی
گل پھول کھلے ہوں اور چہکتے بلبل	توبہ بھلا اس وقت میں ؟ یہ خوب کہی

(دوسرے مصرعے میں لفظ" باوفات" (با - وفا - ت) کو غلط سمجھا ہے ۔ خیام کا مطلب ہے کہ سیکڑوں توبہ کرنے والے باوفا تیرے پیچھے پڑجائیں گے ۔ شاعر نے اسے وفات سمجھ لیا ہے باقی ترجمہ اصل کے بہت قریب ہے

خیام

این کوزہ گران کہ دست در گِل دارند	عقل و خرد و ہوش بر آن بگمارند
مُشت و لگد و طپانچہ تا چند زنند؟	خاکے بدہان است چہ می پندارند؟

آغا شاعر

مٹی کو کمہار کوٹتے کیسا ہیں؟	عقل و خرد و ہوش بھی کیا پڑا ہیں

Marfat.com

کب تک یہ طمانچے، لات مکی کب تک ؟		کمبختوں کے منہ میں خاک، سمجھے کیا ہیں

خیام

طبعم بہ نماز و روزہ چون مائل شد		گفتم کہ مراد کلیم حاصل شد
افسوس کہ آن وضو بہ بادے بشکست		آن روزہ بہ نیم جرعہ می باطل شد

آغا شاعر

جب دل میں نماز روزے کے ڈول جمے		میں سمجھا کہ اب سارے دلدّر چھوٹے
افسوس کہ وہ ہوا سے ٹوٹا		وہ روزہ گیا ذرا سی اک چسکی سے

عدم کے ترجمے میں شعریت اور دوسرے شعری محاسن بلاشبہ اپنے بھرپور انداز میں ہیں لیکن ان کا ترجمہ آزاد ہے اور اکثر ایسا ہے کہ وہ اصل رباعی کے صرف ایک یا دو مصرعوں کے ترجمے پر اکتفا کرتے ہیں جس سے اصل مفہوم مفقود ہوجاتا ہے ۔ اس لحاظ سے اگر ہم ان کے ترجمے کو اخذ و اقتباس کا نام دیں تو زیادہ مناسب ہوگا ۔ علاوہ ازیں انہوں نے یہ ترجمہ قطعات کی صورت میں کیا ہے اور شاید ہی کہیں رباعی کے وزن کو پیش نظر رکھا ہو۔ ان کی بھی تین مثالیں، دلچسپی کے لیے پیش کی جاتی ہیں ۔

خیام

ما خرقۂ زہد در سر خم کردیم		وز خاک خرابات تیمم کردیم
باشد کہ درون میکدہ بیابیم		عمری کہ درونِ مدرسہ گم کردیم

عدم

آخرکار نورِ دانش کو زینتِ گیسوئے سیاہ کیا
میکدے میں وہ عمر ہاتھ آئی مدرسے میں جسے تباہ کیا

خیام

از گردش چرخ ہیچ معلوم نیست		جز رنج زمانہ ہیچ موہوم نیست
ہرچند بکارِ خویش در می نگرم		عمری بگذشت و ہیچ معلوم نیست

عدم

خاطرِ بے تپاک لے کے چلے		دامنِ چاک چاک لے کے چلے

Marfat.com

تیرے بازار میں تیرے گاہک　　سونا لائے تھے خاک لے کے چلے

خیام

سر از ہمہ ناقصان گران داری تو　　راز از ہمہ ابلہان نہان داری تو
بنگر کہ میان مردمان کار تو چیست　　چشم از ہمہ مردمان ہمان داری تو

عدم

تکیہ رکھ ہمدم موافق پر　　راز اپنا کسی پہ فاش نہ کر
خود تجھے آملے گا یار تیرا　　یار کو اس قدر تلاش نہ کر

عدم کے ان تراجم میں شعری محاسن ضرور ہیں لیکن انہیں خیام کی رباعیات کا مکمل ترجمہ نہیں کہا جاسکتا۔ مولوی نذیر احمد مرحوم کا ترجمہ اگرچہ زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوا اور ہنوز مخطوطہ کی صورت میں ہے' تاہم چند رباعیات کا ترجمہ بہاولپور کے ماہنامہ العزیز[۳] اور مجلّہ حمیت[۴] میں شائع ہو چکا ہے۔

مولوی نذیر مرحوم باقاعدہ شاعر نہ تھے۔ کبھی کبھی طبع آزمائی کرلیا کرتے تھے۔ اس کے باوصف ان کا ترجمہ اس قابل ہے کہ اس کا یہاں تعارف کرایا جائے۔ ان کے ترجمے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ سادہ اور رواں ہونے کے ساتھ ساتھ شعریت کا بھی حامل ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اصل کے مفہوم کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی ہے اور آغا شاعر ہی کی طرح ترجمہ کرتے وقت رباعی کے اوزان کو پیش نظر رکھا ہے جس سے ترجمے میں خاصی تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔ اگرچہ وہ اہل زبان نہ تھے لیکن اس کے باوجود ان کے یہاں محاورہ اور روزمرہ کا بھی استعمال نظر آتا ہے۔ ان کی چند ایک رباعیاں اور کئی ایک مصرعے آغا شاعر اور عدم سے بھی زیادہ جاندار ہیں' مثلاً:

آغا شاعر

گل نے جو کہا "مجھ سا حسین کون ہوا؟　　اس پر ستم گلاب گر بھی دیکھا"
بلبل یہ زبان حال سے چلائی　　"اک دن ہنسی تھی سال بھر کا رونا"

مولوی نذیر احمد

خوش رو نہیں مجھ سا کوئی اک گل نے کہا　　عطار کرے مجھ پہ ستم' ظلم ہے کیا
بلبل نے زباں کھول کے بس اتنا کہا　　"اک دن جو ہنسا' روتا رہا' روتا رہا"

Marfat.com

آغا شاعر کے ترجمے میں ''گلاب گر'' (خیام نے یہی لفظ استعمال کیا ہے) اور ''بلبل چلائی'' وغیرہ کے الفاظ ثقیل اور ذوق سماعت پر گراں گذرتے ہیں' لیکن مولوی مرحوم نے ''گلاب گر'' کا ترجمہ ''عطار'' کرکے اسے ایک حُسن بخش دیا ہے اور گل کی بجائے ''اک گل'' میں جو زور اور تخصیص ہے وہ واضح ہے۔ پھر ''ظلم ہے کیا''، ''زبان کھول کے بس اتنا کہا'' کے ٹکڑوں اور ''روتا رہا، روتا رہا'' کی تکرار' غرض ساری رباعی میں جو شعریت اور بھرپور تاثر ہے' آغا شاعر کی رباعی میں اس کی کمی ہے۔

آغا شاعر کی ذیل کی رباعی میں ہائے حُطّی اور ہائے ہوّز کے ساتھ ساتھ آنے سے عیبِ تنافر پیدا ہوگیا ہے جس کی وجہ سے ترجمہ کی سلاست و روانی متاثر ہوئی ہے:

پی بادۂ ناب' راحت روح ہے وہ   آسائش جان و دل مجروح ہے وہ
گھیریں جو تجھے ہزار غم کے طوفاں   دوڑ اس کی طرف کہ کشتی نوح ہے وہ

لیکن مولوی نذیر نے اس عیب سے بچنے کی پوری کوشش کی ہے اور اس طرح ان کے ترجمہ میں زیادہ روانی آ گئی ہے۔

خیام

می خور کہ مدام راحتِ روحِ تو اوست   آسایش جان و دل مجروح تو اوست
طوفانِ غم گر در آید از پیش و پست   در بادہ گریز' کشتیِ نوحِ تو اوست

مولوی نذیر احمد

مے پی لے کہ راحت یہ تیری روح کی ہے   سکھ جان کا' مرہم دلِ مجروح کی ہے
طوفان الم گھیرے اگر آ کے تجھے   چھپ بادہ میں' کشتی یہ تری نوح کی ہے

عدم نے خیام کی درج ذیل رباعی کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

بابط می گفت ماہیے در تب و تاب   ''باشد کہ بجوئے رفتہ باز آید آب''
بط گفت کہ ''چون من و تو گشتیم کباب   بود از پسِ مرگ ما' چہ دریا' چہ سراب''

عدم

بط سے ماہی نے جب کہا جل کر   ''کیا ہو گر جوئے تن میں آب آئے''
بط لگی کہنے ''جب کباب ہیں ہم   پھر سراب آئے یا حباب آئے''

اس میں انہوں نے بط اور ماہی کا ذکر اس طرح کیا ہے جیسے پہلے بھی ان کا تذکرہ ہو چکا ہے' یعنی اس میں تعیم کی بجائے تخصیص آ گئی ہے جس سے مفہوم کی وضاحت میں زور

Marfat.com

پیدا نہیں ہوسکا۔ دوسرے یہاں "تب و تاب" کے معنی "جلنے" کی نسبت "تڑپنے" کے زیادہ قریب ہیں۔ پھر یہ "جوئے تن" کی ترکیب بھی عجیب ہے کہ اس کے استعمال کا یہاں کوئی موقع محل نہیں ہے۔ اب ذرا مولوی نذیر مرحوم کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔ انہوں نے اصل مفہوم کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور شعریت کو بھی برقرار رکھا ہے:

اک بط سے تڑپتی ہوئی مچھلی بولی		"اس نہر میں شاید کہ پھر آئے پانی"
بط بولی کہ "جب ہوگئے ہم دونوں کباب		سب ایک ہیں پھر خشکی ہو یا طغیانی"

عدم کے مندرجہ ذیل قطعہ میں "گردن دراز کرنا" اگرچہ صحیح لفظی ترجمہ ہے، لیکن اردو کے مزاج سے خاصا دور ہے۔ پھر انہوں نے تیسرے اور چوتھے مصرعے میں مُبتدا (گردن) اور خبر (دراز کرنا) کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے جس سے حُسن و تاثیر میں کمی واقع ہوگئی ہے:

ہم اور طرز سے عرضِ نیاز کرتے ہیں		بغیر صوت و تکلم نماز کرتے ہیں
پیالہ دیکھتے ہیں مے کا جس جگہ، گردن		وہیں مثالِ صراحی دراز کرتے ہیں

یہ ترجمہ خیام کی درج ذیل رباعی کا ہے:

کردیم دگر شیوہ رندی آغاز		تکبیر فنا زدیم بر پنج نماز
ہر جا کہ پیالہ ایست ما را بینی		گردن چو صراحی سوے او کردہ دراز

اس میں جو صنائع قدرتی انداز میں آگئے ہیں، اگر انہیں ملحوظ رکھا جاتا تو ترجمے میں اصل کی سی خوبی پیدا ہوجاتی۔ مولوی نذیر مرحوم کو اس کا احساس تھا، چنانچہ انہوں نے خیام ہی کے الفاظ لے کر انہیں اردو محاورے میں سمو دیا ہے جس سے ترجمہ خاصا جاندار ہوگیا ہے:

رندانہ ادا ہم نے نکالی ہے نئی		تکبیر فنا پانچ نمازوں پہ پڑھی
جس جگہ پیالہ ہے وہیں بیٹھے ہیں ہم		گردن کو صراحی کی طرح کرکے کھڑی

اس مضمون میں مذکورہ بالا تراجم کا مقابلہ و موازنہ مقصود نہ تھا، محض مولوی نذیر مرحوم کے ترجمے کی بعض خصوصیات اجاگر کرنے کے لیے چند مثالیں دی گئی ہیں۔ مرحوم نے کوئی چار سو کے لگ بھگ رباعیات کا ترجمہ کیا ہے۔ ان میں اگرچہ اُن کا ترجمہ بعض جگہ بالکل سپاٹ ہوگیا ہے اور بعض مقامات پر تعقید لفظی سے سلاست و دلکشی متاثر ہوئی ہے، تاہم بحیثیت مجموعی وہ کئی خوبیوں کا حامل ہے، جن میں سادگی و سلاست، سہل ممتنع اور محاورہ و روزمرہ کا برمحل استعمال خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ چند ایک مثالیں اوپر گذر چکی ہیں، مزید مثالوں کے لیے ان کی رباعیات کا ایک مختصر سا انتخاب، مع اصل رباعیات کے، کسی تعارف و تنقید کے بغیر پیش خدمت ہے:

Marfat.com

خیام

این دہر کہ بود مدتی منزل ما		نابد بجز از رنج و بلا حاصل ما
افسوس کہ حل نگشت یک مشکل ما		رفتیم و ہزار حسرت اندر دل ما

مولوی نذیر احمد

اک عرصہ ہم اس دہر کی منزل میں رہے		غمہائے جہاں جھیل کے مشکل میں رہے
افسوس کہ مشکل نہ ہوئی ایک بھی حل		ارمان ہزاروں ہی یہاں دل میں رہے

خیام

ہرچند کہ رنگ خیام و بوی زیباست مرا		چون لالہ رخ و چو سرو بالاست مرا
معلوم نشد کہ در طرب خانۂ خاک		نقاش ازل بہر چہ آراست مرا

مولوی نذیر احمد

گو خوب ہے بُو رنگ بھی زیبا ہے مرا		منہ پھول سا، قد سرو سا اونچا ہے مرا
معلوم نہیں مجھ کو طرب خانے میں		نقاش نے کیوں جسم سنوارا ہے مرا

خیام

روزی کہ دو مہلت است می خور می ناب		کین عمر گذشتہ در نیابی، دریاب
دانی کہ جہان رو بہ خرابی دارد		تو نیز شب و روز ہمین نوش شراب

مولوی نذیر احمد

دو دن کی جو مہلت ہے ملی پی می ناب		ہے عمر گذشتہ تری چیز نایاب
معلوم ہے تجھ کو کہ جہاں فانی ہے		جینا ہے تو دن رات چلے جام شراب

خیام

می می خورم و مخالفان از چپ و راست		گویند مخور بادہ کہ دین را اعداست
چون دانستم کہ می عدوے دین است		باللہ بخورم خون عدو را کہ رواست

مولوی نذیر احمد

مے پینے پہ کہتا ہے مخالف میرا		اے ابلہ سنبھل، دشمن دیں ہے یہ بلا
جب میں نے بھی سمجھا کہ یہ ہے دشمن دیں		ہے خون عدو پینا مجھے، دوست روا

Marfat.com

خیام

ای وای برآن دل کہ در و سوزی نیست — سودا زدۂ مہر دل افروزی نیست
روزی کہ تو بے عشق بسر خواہی بُرد — ضایع تر از آن روز ترا روزی نیست

مولوی نذیر احمد

افسوس ہے اس دل پہ جو پُرسوز نہیں — محبوب کوئی جس کا دل افروز نہیں
بے عشق جو کٹ جائے ترا دن اے دوست — اُس دن سے بُرا اور کوئی روز نہیں

خیام

غافل بچہ امید درین شوم سرا — بر دولت این دل منہ از بہرخدا
ہر گاہ کہ خواہی کہ نشینی از پا — گیرد اجلت دست کہ بالا پیا

مولوی نذیر احمد

غافل کو ہے اس دہر میں امید بھی کیا — دل اپنا جو لے دولتِ دنیا سے لگا
جب چاہتے ہیں بیٹھ رہیں پاؤں پسار — کہتی ہے اجل آ کے ''پکڑ وہ رستا''

خیام

چون حاصلِ آدمی درین جاے دو در — جز دردِ دل و دادنِ جان نیست دگر
خرم دل آن کہ یک نفس زندہ نبود — و آسودہ کسے کہ خود نزاد از مادر

مولوی نذیر احمد

انسان کو اس دہر میں حاصل نہ ہوا — جُز رنج و الم' جان کے جانے کے سوا
خوش دل رہا دنیا میں جو اک پل نہ جیا — آسودہ رہا وہ جسے ماں نے نہ جنا

خیام

یاران موافق ہمہ از دست شدند — در پای اجل یکان یکان پست شدند
بودند بیک شراب در مجلس عمر — دوری دو سہ پیشتر ز ما مست شدند

مولوی نذیر احمد

ہمراز جو تھے دوست' وہ باقی نہ رہے — وہ پاؤں تلے اپنے' اجل نے روندے
مجلس میں مے ناب کے رسیا سارے — دو چار چلے دور کہ بس مست ہوئے

خیام

عاشق ہمہ روزہ مست و شیدا بادا — دیوانہ و شوریدہ و رسوا بادا

Marfat.com

در ہشیاری، غصہ ہر چیز خوریم　　چو مست شویم ہر چہ بادا بادا

مولوی نذیر احمد

عاشق کی صفت ہے رہے مست و شیدا　　دیوانہ و شوریدہ و رسوا ہر جا
ہم رنج اٹھاتے ہیں کہ جب ہوش میں ہوں　　جب مست ہوں چلتا رہے دھندا سارا

خیام

آن بہ کہ درین زمانہ کم گیری دوست　　با اہل زمانہ صحبت از دور نکوست
آن کس کہ بجملگی ' ترا تکیہ بدوست　　چون چشم خرد باز کنی " دشمنت اوست

مولوی نذیر احمد

اس دہر میں کر دوست بنانے میں کمی　　اب اہل زمانہ سے ہے دوری اچھی
جس دوست پہ بالکل ہے بھروسا تجھ کو　　جب چشم خرد کھولے گا' دشمن ہے وہی

حوالہ جات

۱- مرحوم ہی سے' ان کے خاندانی ریکارڈ کے حوالے سے ساری معلومات حاصل ہوئیں ۔ وہ ۱۹۲۶ء سے بہاولپور میں مقیم تھے ۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے وہ محکمہ انہار میں چیف ڈرافٹسمین تھے ۔ انتھک کام کرنے والے اور ادب کے شیدائی تھے ۔ وہ بھی اپنے بزرگوں کی راہ پر چلے ۔ چنانچہ ان کی یہ کتب شائع ہو چکی ہیں : تبسمات (رباعیات و قطعات کا مجموعہ) " ۱۹۴۰ء (۲) نئے چراغ (متفرق (اشعار) (۳) غزل کا سروپ " اردو غزل کا سروپ اور شعرائے بہاولپور کا کلام' ۱۹۶۲ء (۴) صحرا کے پھول ' مجموعۂ قطعات ' ۱۹۶۴ء (۵) جمال سحر (غزلیات کا مجموعہ)، ۱۹۶۵ء (۶) داغ داغ اجالا (مجموعۂ غزلیات)' ۱۹۶۸ء

۲- اس تعداد میں یقیناً کسی اور شاعر یا شاعروں کی رباعیات بھی شامل ہونگی۔

۳- العزیز: دبیرالملک مولانا عزیزالرحمٰن نے ۱۹۴۰ کے لگ بھگ بہاولپور میں 'عزیزالطابع' کے نام سے ایک چھاپہ خانہ لگایا ۔ مولانا ایک صاحب ذوق' سخن فہم اور فارسی و اردو کے شاعر تھے ۔ ان کی دیگر تصانیف کے علاوہ ان کے فارسی و اردو کلام کے دو مجموعے بوستان عزیز اور گلستان عزیز اسی مطبع سے شائع ہو چکے ہیں ۔ اپنے اس ذوق کی تشفی کے لیے انہوں نے مطبع مذکور کے اجراء کے ساتھ ہی اردو کا ایک ادبی مجلہ العزیز بھی جاری کیا ۔ مختلف اوقات میں حافظ محمود اور قیوم گیلانی اس کے مدیر رہے ۔ شروع میں یہ مجلہ ماہنامہ تھا" پھر بعض وجوہ کی بنا پر ہفت روزہ ہوکر ایک عرصے تک شائع ہوکر بند ہوگیا۔

۴- حمیّت : ماہنامہ حمیّت کا اجراء' مئی ۱۹۴۹ء میں ریگستان ادب بہاولپور میں ہوا۔ حمیدہ بیگم (زوجہ عبدالحمید ارشد) اور شاہد منصور اس کے مدیر تھے ۔ تعجب کی بات ہے کہ ادبی مراکز سے دور اور اس وقت ادب سے ایک حد تک بیگانہ اس علاقے میں ایک خاتون نے ادب کی آبیاری کی کس طرح ہمت کی ۔ اس

Marfat.com

رسالے کے سرورق پر یہ عبارت ہوتی تھی "خواتین پاکستان کی آواز" اس رسالے میں ادب کے علاوہ سائنس پر بھی ایک مضمون ضرور ہوتا تھا۔ راقم نے اس کے پہلے دو شمارے دیکھے ہیں۔ پہلے کی نسبت دوسرا شمارہ زیادہ ضخیم اور وقیع تھا اور اس کی طباعت بھی عمدہ تھی۔ اس میں علامہ اقبال پر صوفی تبسم مرحوم کا بھی ایک مضمون تھا۔ افسوس کہ یہ رسالہ ناقدری زمانہ اور یہاں کے عوام کی ادب سے عدم دلچسپی کے باعث کچھ عرصہ مالی مشکلات سے دوچار رہ کر بند ہوگیا۔

☆☆☆

Marfat.com

ڈاکٹر رانا محمد نصر اللہ احسان الٰہی

جیسا کہ میں نے انہیں دیکھا

ڈاکٹر امین اللہ وثیر☆

ڈاکٹر رانا محمد نصر اللہ احسان الٰہی مرحوم سے میری ملاقات غالباً ستمبر ۱۹۶۱ء کے آخری دنوں میں یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے شعبۂ عربی میں ہوئی۔ میں مرے کالج سیالکوٹ میں استاد عربی کی حیثیت سے کام کر رہا تھا کہ ۱۹۶۰ء میں اورینٹل کالج میں لیکچرار کی ایک عارضی اسامی پر میری تقرری عمل میں لائی گئی۔ میں نے اس پوسٹ پر ایک سال تک کام کیا مگر اس پر مستقل تقرری کے لیے یونیورسٹی کے متعلقہ دفتر کی عدم توجہی کے باعث جب اس اسامی کو مشتہر نہ کیا گیا تو میں جو کہ ہمیشہ سے ایک کمزور دل انسان واقع ہوا ہوں، ڈر گیا۔ ادھر مرے کالج کے ارباب اختیار نے بھی اصرار کیا کہ میں واپس آجاؤں۔ سیالکوٹ میرا آبائی وطن بھی ہے اور ان دنوں مرے کالج پنجاب کے معروف تعلیمی اداروں میں شمار ہوتا تھا، لہذا میں نے موقع غنیمت جانا اور گرمیوں کی تعطیلات کے دوران اورینٹل کالج کے شعبۂ عربی کی لیکچرر شپ سے یونیورسٹی کو استعفیٰ بھیج دیا۔

میں جب یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے لیے اورینٹل کالج پہنچا تو وہاں شعبۂ عربی میں بہت سے دوسرے حضرات کے علاوہ ایک نئے استاد جناب ڈاکٹر رانا احسان الٰہی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ اگرچہ، جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا ڈاکٹر صاحب کا تعلق بھی سیالکوٹ سے تھا بلکہ ان کے اور میرے محلے مشرقی سیالکوٹ کے علاقے میں پہلو بہ پہلو واقع تھے۔ اس سے پیشتر میرا ان سے کوئی تعارف نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ میونسپل کالج فیصل آباد کے پرنسپل کے عہدے پر فائز تھے اور تعطیلاتِ گرما کے دوران یونیورسٹی میں بحیثیت ریڈر (آج کل ایسوسی ایٹ پروفیسر) ان کی تقرری عمل میں آئی۔

ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ نہایت خندہ پیشانی سے ملے، نہایت شفقت

☆سابق سیکریٹری اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد

Marfat.com

اور اخلاق کریمانہ سے پیش آئے اور کہا کہ مجھے ابھی چند دن پیشتر ہی آپ کے استعفیٰ کے بارے میں پتہ چلا ہے، آپ کو مستعفی نہیں ہونا چاہیے تھا، گو اسامی عارضی تھی لیکن ایک آدھ سال بعد بہرحال مستقل ہو ہی جاتی۔ اگر میں یہاں پہلے سے موجود ہوتا تو آپ کو ایسا قدم نہ اٹھانے دیتا۔ اب بھی مناسب ہوگا کہ آپ اپنا استعفیٰ واپس لے لیں۔ میں نے عرض کیا کہ اب تو میں مرے کالج واپس جانے کا فیصلہ کر چکا ہوں، اور وہاں وعدہ کر کے آیا ہوں کہ وسط اکتوبر تک اپنے تدریسی فرائض کا آغاز کردوں گا، لہٰذا اب اس وعدے کی خلاف ورزی پر اپنی طبیعت کو مائل نہیں کر پاؤں گا۔

یہاں سے ڈاکٹر رانا احسان الٰہی صاحب کے ساتھ میرے نیازمندانہ تعلقات کا آغاز ہوا۔ ان کا تعلق سیالکوٹ کے ایک معزز محترم خاندان سے تھا جو اپنی طبعی شرافت و نجابت کے لیے معروف ہے۔ ان کے دادا مجسٹریٹ تھے اور ڈپٹی صاحب کہہ کر لوگ انہیں پکارا کرتے تھے۔ والد صاحب تحصیلدار تھے اور چھوٹے بھائی لاہور ہائی کورٹ بہاول پور بنچ کے فاضل جج۔ ڈاکٹر صاحب بذاتِ خود نہایت مخلص، دردمند دل رکھنے والے، درویشانہ صفات کے مالک نیک انسان تھے اور اسی بنا پر وہ ہر ملنے والے سے خندہ روئی سے پیش آتے۔ گزشتہ تقریباً تیس سال کے عرصے میں، میں نے انہیں شاید ہی کبھی غصہ و غضب کی حالت میں دیکھا ہوگا۔ وہ غریب نواز انسان تھے۔ مجھے ہمیشہ اپنے گھر کا فرد سمجھتے رہے، اور علمی زندگی میں انہوں نے ہمیشہ نہ صرف میری رہنمائی بلکہ قدم قدم پر میری اعانت کی، اور مجھے کارزارِ حیات میں آگے بڑھنے کے سلسلے میں اپنے مفید اور مخلصانہ مشوروں اور ہدایات سے نوازتے رہے۔ ان کا یہ حسنِ سلوک اپنے تمام متعلقین اور خصوصاً اپنے تلامذہ کے لیے مثالی قسم کا تھا۔

۱۹۶۳ء میں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج میں میری تقرری مستقل بنیادوں پر عمل میں آئی، اور مجھے ڈاکٹر رانا صاحب کی علمی سرپرستی میں بلا واسطہ کام کرنے اور ان کے علم و فضل سے مستفید ہونے کا موقع ملا، اور میں نے ان کے زیر ہدایت علمی و تحقیقی کام کا آغاز کیا۔ ڈاکٹر صاحب، یونیورسٹی اورینٹل کالج کے سابق پرنسپل و ڈین اورینٹل فیکلٹی اور اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے پہلے چیئرمین، برصغیر کے مشہور و معروف اسکالر اور استاد، پروفیسر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم کے نامور طلبہ میں سے تھے، اور مولوی صاحب مرحوم ہی کی فرمائش پر ان کا تقرر شعبۂ عربی میں ہوا تھا۔ رانا صاحب اس شعبہ کے استاد مقرر ہوئے لیکن ان کے فرائض میں دائرہ معارف اسلامیہ کے تحقیقی امور میں بعض امور کی پابجائی کا فریضہ بھی شامل تھا۔ چنانچہ وہ دائرہ معارف اسلامیہ میں بطور معاون رئیس ادارہ بھی کام کرتے رہے اور

Marfat.com

اگرچہ اس وقت اورینٹل کالج کے پرنسپل و صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب مرحوم شعبۂ عربی کے بھی صدر تھے لیکن شعبے کے جملہ انتظامی معاملات عملی طور پر ڈاکٹر رانا صاحب ہی انجام دیتے تھے۔ بعد میں وہ شعبۂ عربی کے باقاعدہ صدر بھی مقرر ہوئے۔

ان سب فرائض کی بجا آوری کے باوجود ڈاکٹر رانا صاحب کی علمی، تدریسی اور تحقیقی زندگی بڑی بھرپور تھی وہ خود بھی تحقیق کے دھنی تھے اور اپنے تلامذہ کو بھی تحقیق و جستجو کی رغبت دلاتے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ میرے پی ایچ ڈی کے مقالے کا عنوان ''مُلا عبدالحکیم سیالکوٹی'' اگرچہ ۱۹۵۴ء میں میرے ایم اے عربی کا امتحان پاس کرنے کے وقت ہی میرے دو معزز اساتذہ ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب مرحوم اور پروفیسر عبدالقیوم صاحب مرحوم نے تجویز کردیا تھا، لیکن اس موضوع پر باقاعدہ کام کا آغاز، میں اورینٹل کالج میں تقرری کے بعد ہی کرسکا۔ ڈاکٹر رانا صاحب مرحوم نے مجھے تحقیقی میدان میں کام کرنے کی طرف متوجہ کیا اور جب میں نے مُلا عبدالحکیم سیالکوٹی پر کام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے اس موضوع کو نہایت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور فرمایا کہ یہ موضوع علمی تحقیق کے سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، اور اس پر کام کرو گے تو یقیناً Original قسم کا ہوگا، پھر تم خود بھی سیالکوٹ سے تعلق رکھتے ہو، لہٰذا مغلیہ دور کے اس علمی مرکز کے ایک نابغۂ روزگار فرزند پر کام کرنا تمہاری خوش بختی ہوگی اور اس سے برصغیر پاک و ہند کے اس عظیم المرتبت فاضل کی روح بھی خوش ہوگی۔

اگرچہ میں نے ذاتی طور پر ملا عبدالحکیم سیالکوٹی'' کے سلسلے میں معلومات جمع کرنا شروع کردیں اور ان کی مشہور عالم تصنیف *الرسالۃ الخاقانیۃ فی علم الباری تعالیٰ* جو *الدرۃ الثمینہ* کے نام سے بھی معروف ہے، کے کئی خطی نسخے پاکستان، ہندوستان اور برطانیہ کے کتب خانوں سے حاصل کرلیے لیکن صحیح معنوں میں اس کام کا باقاعدہ آغاز کہیں ۱۹۶۶ء میں جاکر ہوسکا۔ اس میں اورینٹل کالج کی سیاست گردی کا بھی بہت کچھ عمل دخل تھا۔ قدم قدم پر اس راہ میں بعض بڑے لوگ روڑے اٹکاتے رہے جو ایک الگ کہانی ہے اور خاصا بڑا المیہ ڈرامہ۔ مگر میں ان ناخوشگوار حالات کا تذکرہ کرکے آپ کو بدمزہ نہیں کرنا چاہتا کہ اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں جن کا ذکر اگر میں کردوں تو آپ حیرت زدہ ہوکر رہ جائیں گے۔ ڈاکٹر رانا صاحب ہی میرے Thesis کے نگراں مقرر ہوئے اور میں ان کی رہنمائی میں *الرسالۃ الخاقانیۃ* کی تدوین و تحقیق اور علامۃ الدہر فاضل سیالکوٹی ملا عبدالحکیم کی زندگی، ان کے کارناموں اور ان کے اساتذہ و تلامذہ کے حالات کی جستجو میں کھو گیا۔ یہ کام

Marfat.com

۱۹۶۹ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس پورے عرصے کے دوران مرحوم ڈاکٹر رانا نے میرے ساتھ جس شفقت، مہربانی، بندہ نوازی اور کرم گستری کا رویہ اپنائے رکھا وہ میری زندگی کا نہایت خوشگوار سرمایہ ہے اور میں بلاتکلف اس حقیقت کا اظہار کرنا چاہوں گا کہ اگر ڈاکٹر رانا صاحب کی رہنمائی اور نوازشات میرے شامل حال نہ ہوتیں تو علم الکلام کے اس شاہکار، الرسالۃ الخاقانیۃ اور اس کے عظیم مصنف پر کام کرتے ہوئے میرے جیسا ہیچمدان شخص ہمت ہار جاتا اور ایک سے دوسرا قدم اٹھانا شاید ممکن نہ ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم ہر روز کئی گھنٹے میرے ساتھ بیٹھتے، میں جو کام کر کے لایا ہوتا اس پر گہری نظر ڈالتے، ایک ایک لفظ کو بغور دیکھتے، بحث و مباحثہ ہوتا، یونانی فلسفیوں اور مسلم مفکرین کی آراء پر سر دھنا جاتا، عبارت کو درست فرماتے، اور اس سب کے باوجود میری ہمت ٹوٹنے نہ دیتے، مجھے شاباش دیتے اور فرمایا کرتے کہ تم بہت محنت کر رہے ہو، انشاء اللہ اس کا تمہیں اجر ملے گا۔ میں اکثر و بیشتر سمن آباد کی جناح کالونی میں ان کے دولت کدے پر حاضر ہوتا۔ وہیں بیٹھ کر الرسالۃ الخاقانیۃ اور ملا عبدالحکیم السیالکوٹی کے موضوع پر گھنٹوں بحث ہوا کرتی اور اکثر مجھے ان کے اہل خانہ کے ساتھ کھانے میں بھی شرکت کے مواقع ملتے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس مقالے کی تکمیل کے بعد مجھے رغبت دلائی کہ میں یورپ کی کسی بہترین یونیورسٹی میں بھی اعلیٰ تعلیم کے لیے داخلہ لوں۔ میں نے عرض کیا کہ میں یورپ کے کثیر اخراجات برداشت کرنے کا اہل نہیں ہوں۔ چنانچہ انہوں نے خود ہی اس سلسلے میں میرے لیے پروفیسر آربری کو خط لکھا اور وہاں سے دلپسند جواب آیا، لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ انہی دنوں مجھے حکومتِ ترکیہ کی طرف سے ہائی اسلامک انسٹی ٹیوٹ قیصری میں مہمان پروفیسر (Visting Professor) کی حیثیت سے دعوت موصول ہوئی اور میں نے ڈاکٹر صاحب کے مشورے کے مطابق اس دعوت کریمانہ کو قبول کرلیا اور یوں کیمبرج جانے کی بجائے انقرہ اور استنبول کی علمی فضاؤں سے متمتع ہوتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب پروفیسر آربری کے بھی عزیز طلبہ میں سے تھے اور پروفیسر موصوف ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور انہیں کی زیر نگرانی ڈاکٹر صاحب نے ڈیڑھ سال کے قلیل عرصے میں یاقوت الحموی پر مقالہ لکھ کر کیمبرج یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ حاصل کی تھی۔ یہ بات مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ ڈاکٹر رانا صاحب کی سفارش پر ہی پنجاب یونیورسٹی کے بعض محققین کو کیمبرج میں داخلہ ملا۔ قیام ترکی کے دوران بھی ڈاکٹر صاحب سے میری خط و کتابت متواتر ہوتی رہی۔ میں گرمیوں کی چھٹیاں گذارنے بالعموم قیصری سے استنبول چلا جاتا جو صدیوں تک مسلمان کی سیاسی و علمی زندگی کا محور و مرکز رہا تھا

Marfat.com

اور جہاں فقط سلیمانیہ کتب خانے میں عربی، فارسی اور ترکی کے اسی ہزار کے قریب نادر مخطوطات موجود ہیں۔ میں وہاں بیٹھ کر بھی ڈاکٹر صاحب مرحوم کی علمی رہنمائی کا طالب رہا اور وہ مجھے اپنی قابل قدر آراء سے نوازتے رہے۔

ڈاکٹر رانا ایک معزز استاد، عظیم محقق اور ہمدرد انسان تھے۔ان سے سینکڑوں طلبہ نے کسب فیض کیا۔کوئی بھی شخص ان سے جب کبھی بھی علمی و تحقیقی موضوع پر اعانت کا طلب گار ہوا انہوں نے ہر ممکن حد تک اس کی مدد کی۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ میں نے ان سے کسی تدریسی مشکل کا اظہار کیا ۔ انہوں نے فرمایا: انشاء اللہ کل صبح بتاؤں گا اور واقعی دوسرے دن صبح وہ گھر سے اس مشکل مسئلے پر مکمل تحقیقی مواد مرتب فرما کر ساتھ لے آتے۔پنجاب یونیورسٹی میں ان جیسے گہری تحقیقی نظر رکھنے والے دانشور انگلیوں پر شمار کیے جاسکتے تھے۔

ڈاکٹر رانا ایک محنتی استاد اور محقق و مصنف ہونے کے باوصف نہایت سادہ رہن سہن اور درویشانہ طبیعت کے مالک تھے۔ وہ نمود و نمائش سے دور رہتے۔

۱۹۷۵ء میں میں Rotation کی بنا پر صدرِ شعبۂ عربی تھا۔ان دنوں آنا فانا ایک قانون کے ذریعے ریٹائرمنٹ کی عمر ۶۰ سال سے گھٹا کر ۵۸ سال کردی گئی اور یونیورسٹی کے بعض سینئر اساتذہ کرام کی طرح ڈاکٹر رانا صاحب بھی اس کی زد میں آگئے۔ میں ان کے خانگی حالات سے واقف تھا۔ میں نے کوشش کی کہ انہیں توسیعی بنیاد پر یونیورسٹی کی طرف سے شعبۂ عربی میں کام کرنے کی اجازت مل جائے۔ اس وقت کے پرنسپل اورینٹل کالج ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب نے بھی اس سلسلے میں بڑی تگ و دو کی لیکن جامعاتی سیاست میں ہم سب مات کھا گئے۔ میں نے یہاں تک تجویز کیا کہ ڈاکٹر رانا صاحب کو لیکچر بیس (Basis) پر ہی ہفتے میں دو تین پریڈ مل جائیں، لیکن ہمارے بعض فاضل و مدبر رفقائے کار نے اس کی بھی مخالفت کی اور اس طرح ایک فاضل و محقق ہستی کو جو شعبے کے لیے ہر طرح سے نیک نامی کا باعث بنتی اورینٹل کالج کی چادر دیواری سے دور رکھا گیا۔ تفو بر تو اے چرخ گردان تفو! لیکن عزت اور رزق تو اللہ کریم کی دین ہے۔ درویش صفت، پروفیسر ڈاکٹر رانا کو جب پنجاب یونیورسٹی کے سیاسی ماحول سے وقت سے پہلے نکل جانا پڑا تو ان پر رزق کے دروازے اس طرح وسعت پذیر ہوگئے کہ انسان عام حالات میں اس کا تصور تک نہیں کرسکتا۔NESPAK اور لندن کے *Encyclopaedia of Search* کی وساطت سے انہیں ہزاروں روپے کا معاوضہ ہر ماہ باعزت طریقے سے موصول ہوتا رہا۔

ڈاکٹر صاحب ایک بڑے مصنف بھی تھے اور زندگی بھر علمی و تحقیقی میدان میں

Marfat.com

مصروف کار رہے۔ انگریزی اور عربی دونوں زبانوں پر انہیں عبور حاصل تھا اور ان دونوں میں ان کی تحریر نہایت خوش خط بھی تھی۔ ہمدرد فاونڈیشن کے لیے کتاب الصیدنہ انہوں نے اپنے خوبصورت انداز میں ہاتھ سے تحریر کی اور وہ اسی صورت میں عکسی طباعت میں چھپی۔ ہجرہ کونسل کے لیے بھی انہوں نے کئی کتابوں کے مترجم کے طور پر کام کیا۔ ۱۹۷۹ء میں اسلام آباد میں جو عالمی سیمینار بسلسلہ نفاذ قوانین اسلامی منعقد ہوا تھا اس کی کاروائی مکمل صورت میں چھپ چکی ہے۔ میرے اور مرحوم گھانگرو صاحب، جائنٹ سیکریڑی وزارت قانون کے مشورے سے اس کاروائی کی تدوین کا کام ڈاکٹر رانا صاحب کے سپرد کیا گیا تھا، جسے انہوں نے ایک ڈیڑھ ماہ کے قلیل عرصے میں نہایت عرق ریزی کے ساتھ بہت خوبصورت انداز میں مدوّن کیا۔ڈاکٹر رانا، ناسازیٔ طبع کے باوجود تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے۔ کافی عرصے سے انہیں بلڈ پریشر کا عارضہ لاحق تھا۔اسلام آباد سے جب کبھی میرا لاہور جانا ہوتا میں ڈاکٹر صاحب کے دولتکدے پر حاضر ہوتا۔وہ اور ان کے اہل خانہ خاندان کے ایک فرد کی طرح میرا استقبال کرتے۔ متبسمانہ ملتے، تواضع کی جاتی اور میرے اور میرے اہل خانہ کے حالات سے آگاہی حاصل کرنے کی کوشش کا اظہار ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب مجھے بہتر سے بہتر مشورے دیتے اور ہمیشہ نیک خواہشات کا اظہار فرماتے۔ افسوس کہ میں ان کی زندگی کے آخری ایام میں ان سے ملاقات نہ کرسکا، مگر مجھے ان کی بیگم صاحبہ اور بڑی بیٹی سحیرہ نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب ہسپتال میں بھی مجھے یاد کرتے اور اکثر میرا ذکر کرتے رہے۔ ایک دن انہوں نے چٹ پر میرے نام کوئی پیغام بھی لکھا جو اہل خانہ سے پڑھا نہ جاسکا۔ انہوں نے آہستہ آہستہ کہا کہ وشیر صاحب سے کہنا کہ وہ کام جاری رکھیں میں بھی ان کی مدد کروں گا۔ معلوم نہیں وہ کیا کام تھا جس کی تکمیل کا ڈاکٹر صاحب فرمارہے تھے۔ خدا کرے کاغذ کا وہ پرزہ مل جائے اور میں اس کے مطالعے سے کوئی مفید کام انجام دے سکوں۔

تصانیف تا ۱۹۷۱ء

ا۔ کتب:

جواہر السیوف، الکندی

مختلف القبائل، ابن حبیب

واحد باری، (فارسی اردو فرہنگ) تصنیف ۱۰۲۸ھ

Life and Works of Yaqut-al-Hamawi

نفائس الادب (درسی کتاب برائے بی اے آنرز)

Marfat.com

۲۔ مقالات

جلال الدین القزوینی	معارف، اعظم گڑھ

اقبال اور وطنیت	سعادت، کوئٹہ

البدیعیات	المناز، لاہور

فہارس عجائب الاشعار (مسلم بن محمود شیرازی)، اورینٹل کالج میگزین، لاہور

جمہرۃ النسب (لابن کلبی)، اورینٹل کالج میگزین (بالاقساط)

اقبال اور بھرتری ہری	منروا، لائلپور

"Life and works of Al- kindi" سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور

منصب قضاء۔ صدر الاسلام میں، نذر رحمان، مطبوعہ لاہور

فلیمون الحکیم	ارمغان، لاہور

۳۔ مقالات برائے اردو دائرۃ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی

ٹھٹھہ	آت میدان	آسیہ
ابن اعثم الکوفی	ابن الصلاح	ابن ماکوہ
اہل الردّۃ	اُمامہ	ثناء اللہ پانی پتی
آدم	الآمدی	ابن بکار
ابن الفوطی	اصحاب بدر	جلال الدین قزوینی
ام المؤمنین	آب	آذر ماہ
ابراہیم	ابن حمدون	ابن قدامہ الحنبلی
اصحاب الفیل	یاقوت الحموی	ام القریٰ
برکھا رت	آبان	آزر
ابلیس	ابن حمدیس	ابن الکلبی۔ اصحاب الأیکہ

۴۔ دیگر تالیفات

المرایا المحرقۃ ابن الہیثم (ترجمہ انگریزی *The Burnning Mirrors*

and the inscriptions carved in Aramaic over doorsteps

مدائن صالح

کتاب الصیدنۃ: البیرونی (ہمدرد فاؤنڈیشن)

حرز العنایات (انگریزی ترجمہ)

Marfat.com

کتاب الازمنة والأنواء : ابو اسحٰق ابراہیم الأجدابی

(انگریزی ترجمہ: پاکستان ہجرہ کونسل *The Book of Seasonal Peroids and SkySigns*

☆☆☆

Marfat.com

شاہ غلام علی دہلوی مجددی کے ملفوظات

ایک نو دریافت مجموعہ

ڈاکٹر عارف نوشاہی ☆

حضرت میرزا مظہر جان جاناں (شہادت ۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۱ء) کے جانشین حضرت عبداللہ المعروف شاہ غلام علی دہلوی (۱۱۵۶-۱۲۴۰ھ/ ۱۷۴۳-۱۸۲۴ء) کے ملفوظات کے دو مجموعے ملتے ہیں: ۱۔ دُرّ المعارف مرتبہ شاہ رؤف احمد رأفت مجددی۔ جس میں ۱۲ ربیع الاول ۱۲۳۱ھ / ۱۸۱۶ء سے یکم شوال ۱۲۳۱ھ تک کی مجالس پر مبنی تاریخ وار ملفوظات درج ہیں۔ اس مجموعے میں کچھ ملفوظات بلاتاریخ بھی ملتے ہیں، جن میں سے بعض کا تعلق جمادی الثانی ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۸ء سے ہے۔ یہ مجموعہ کئی مرتبہ چھپ چکا ہے۔ ایک قدیم اشاعت مطبع نادری، بریلی ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۷ء کی ہے۔ (۱) ۲۔ ملفوظات شریفہ مرتبہ مولانا غلام محی الدین قصوری (۱۲۰۲-۱۲۷۰ھ / ۱۷۸۷-۱۸۵۴ء)۔ یہ مجموعہ تقریباً ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء میں مرتب ہوا اور محمد اقبال مجددی صاحب کے زیر اہتمام اقبال احمد فاروقی صاحب کے اردو ترجمہ کے ساتھ مکتبہ نبویہ، لاہور سے ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ (۲)

حضرت شاہ غلام علی دہلوی کے سوانح نگاروں نے ملفوظات کے انہی دو مجموعوں کا ذکر کیا ہے۔ مولانا قصوری کا مجموعہ چونکہ دُرّالمعارف کے بعد ملا اس لیے محققین نے اسے "نو دریافت" قرار دیا۔(۳) اب ہمیں حضرت شاہ غلام علی دہلوی کے ملفوظات کا تیسرا مجموعہ دستیاب ہوا ہے جس کا ذکر نہ تو پہلے کہیں پڑھنے میں آیا اور نہ اس کا نسخہ کہیں پایا گیا۔ محبی ڈاکٹر غلام معین الدین نظامی صاحب (ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ فارسی، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور) نے ۲۰۰۲ء میں مجھے ایک قلمی مجموعۂ رسائل مرحمت فرمایا۔ یہ مجموعہ جس میں شاہ غلام علی دہلوی کا وہ مجموعۂ ملفوظات بھی شامل ہے جس کا ذکر ہم آئندہ سطور میں کریں گے میرے ذخیرۂ مخطوطات میں شمارہ ۸۶ کے تحت داخل ہے۔ اس کے مندرجات حسب ذیل ہیں:

☆* ادارۂ معارف نوشاہیہ، ۶۹ ماڈل ٹاؤن، ہمک، اسلام آباد

Marfat.com

۱۔ تحفۃ الرسلہ (عربی) تصنیف شیخ محمد مبارک المشہور بہ ابی سعید بن شیخ علی المعروف بہ فضل اللہ المخزومی السلمی بن شیخ رضی الدین ابی خالد بن شیخ مہران طوسی۔ (۴) مکتوبہ غلام محمد، بلا تاریخ، ۱۰ص۔

۲۔ ملفوظات شاہ غلام علی دہلوی (زیر بحث کتاب)، ص ۱-۱۳

۳۔ کنز الہدایات فی کشف البدایات و النہایات (فارسی) تصنیف محمد باقر لاہوری، (۵) ص ۱۸-۱۴۲

۴۔ رفیق الطالبین (فارسی) تصنیف مولوی غلام حسین ہوشیارپوری مجددی (۶) کے آخری تین ورق، مکتوبہ ۲۰ رمضان ۱۲۶۲ھ، ص ۱۴۳-۱۴۸۔ اس کے بعد متعدد اوراد ادعیہ عربی اور فارسی میں ہیں جن کی تفصیل کا یہ مقام نہیں۔ ان میں سے چند ورق شیخ احمد پور سروری [کذا: پسروری] کے مکتوبہ ومملوکہ رہے ہیں جنکی تاریخ کتابت ذیقعدہ-ذیحجہ ۱۲۵۴ھ ہے۔

ملفوظات شاہ غلام علی دہلوی

یہ پیش نظر مجموعہ رسائل کا دوسرا رسالہ ہے جو ۱۳ صفحات پر مشتمل اور اس مجموعہ کے بقیہ رسائل نقشبندیہ کا ہم قلم نسخہ ہے۔ یہ مجموعۂ ملفوظات بھی شاہ رؤف احمد رأفت مجددی (وفات ۱۲۴۹ھ؟) کا جمع کردہ ہے اور دُرّالمعارف سے بعد کا کام ہے۔ دیباچے میں لکھتے ہیں کہ وہ ۱۲۳۲ھ(۱۸۱۷ء) میں اپنے مرشد حضرت عبداللہ دہلوی معروف بہ حضرت شاہ غلام علی دہلوی کے ملفوظات کی تدوین سے فارغ ہوئے (۷) تو اس کے بعد آنجناب نے انہیں خلافت سے مشرف فرما کر مالوہ کی طرف رخصت فرمایا۔ اس سفر سے واپسی کے بعد جب وہ دوبارہ اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو یہ خیال دل میں گذرا کہ ان کی زبان سے معارف کے جو موتی جھڑتے ہیں، انہیں کتابی صورت میں جمع کر دینا چاہیے، لیکن حلقے اور مراقبے میں مشغولی کے باعث کوتاہی ہوتی رہی۔ آخر ان کے سات روزہ ملفوظات جمع کر دیے۔(۸) یہ سات روزہ مجالس سہ شنبہ ۲۵ ربیع الآخر ۱۲۳۶ھ سے شروع ہو کر دو شنبہ ۲ جمادی الاول ۱۲۳۶ھ تک مسلسل ہیں۔ مرتب نے پہلی مجلس کا دن، مہینہ اور سال لکھا ہے، لیکن باقی چھ مجالس کا صرف دن اور ماہ لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ چونکہ دیباچے میں وضاحت کر دی ہے کہ یہ "تقریرات ہفت روزہ" ہیں، اس لیے باقی مجالس کے ساتھ سال لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور معلوم ہے کہ تمام ملفوظات ۱۲۳۶ھ سے متعلق ہیں۔

یہ مجموعہ بھی اسلامی حقائق و معارف کے بیان میں ہے۔ ہم یہاں ساتوں مجالس کے مضامین کا خلاصہ بیان کر رہے ہیں۔

مجلس اول: آیت "و فی انفسکم افلا تبصرون" کی تفسیر ہے۔

Marfat.com

مجلس دوم: شاہ ابو سعید [مجددی] کی مجلس میں آنے والی ایک عورت کا واقعہ ہے جو کہتی تھی کہ خدا کے فریادی ہیں۔ مسئلہ رفع سبابہ پر رائے، نسبتِ "یادداشت" کی سلسلۂ نقشبندیہ میں اہمیت، صفات سلبیہ اور، کلمۂ "لا حول و لاقوۃ الا باللہ" کے ورد کی خاصیت کا بیان۔

مجلس سوم: دلِ سالک پر فیضِ الٰہی کے نزول کی کیفیت کا بیان، مکتوباتِ حضرت مجدد کے ایک ٹکڑے کی وضاحت کہ افعال اختیار کرنے کا حق آدمی کو دیا گیا ہے۔

مجلس چہارم: جب سینہ کھل جائے تو اعتقادیات میں دلیل کی حاجت نہیں رہتی۔ عذابِ قبر کا بیان، حدیثِ "من رأنی فقد راء الحق" کی صحت کا بیان۔ حضرت مرزا مظہر جانجاناں کا اپنے شیخ طریقت شیخ محمد عابد [سنامی، متوفی ۱۱۶۰ھ] کی خدمت میں حاضر ہو کر طریقۂ قادریہ میں بیعت ہونے کی درخواست کرنا اور شیخ عابد سنامی کا مراقبے میں جا کر مرزا مظہر جان جاناں کو شیخ عبدالقادر جیلانی سے خرقہ دلوانا۔

مجلس پنجم: مرتب ملفوظات نے شاہ غلام علی سے عرض کیا کہ آنجناب نے حضرت مجدد رضی اللہ عنہ اور حضرت مرزا صاحب قدس سرہ کے احوال پر جو رسالے تصنیف کیے ہیں(۹) وہ لکھوا کر مالوہ کی طرف بھجوائے جائیں کیونکہ مولوی ضیاء الدین بھوپالی اور اُس علاقے کے دیگر دوستوں نے جو مرتبِ ملفوظات سے فیضیاب ہوئے تھے، اُن سے ان رسائل سے متعلق اشتیاق ظاہر کیا تھا اور بار بار درخواست کی تھی، پیرانِ نقشبندیہ اور پیرانِ جنیدیہ کا تقابل۔

مجلس ششم: مراقبۂ معیت کے وقت کا تعین (یہ سب سے مختصر مجلس ہے)۔

مجلس ہفتم: شاہ غلام علی دہلوی کا افضلیت بشر بعد از انبیاء کا عقیدہ اور اہل بیت کے ساتھ ان کی محبت کا انداز جس میں وہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے تصور میں جب طوافِ کعبہ کرتا ہوں تو وہاں سے مدینہ منورہ حاضر ہو کر [آنحضرتؐ پر] قربان ہوتا ہوں۔ وہاں سے حضرت امام حسینؓ کی مرقد مطہر پر کربلا میں حاضر ہوتا ہوں اور عرض کرتا ہوں کہ اے کاش میں بھی اُس وقت ہوتا اور اپنا سر آنجناب کے ساتھ ہو کر آپ کا مقابلہ کرنے والوں سے مقاتلہ کرتے ہوئے کٹا دیتا۔

اس قلمی نسخے کے کاتب نے ملفوظات نقل کرنے کے بعد ترقیمے کے مقام پر یہ عبارت لکھی ہے: "نقل از رسالۂ احوال خود تصنیف حضرت مولانا رؤف احمد مجدّدی نسباً و طریقتاً از خلفای حضرت قیوم زمان المسمی بعبد اللہ المعروف غلام علی شاہ"۔ (ص ۱۳)

شاہ رؤف احمد مجددی نے اپنے خودنوشت حالات جواہر علویہ میں لکھے ہیں،

Marfat.com

جس میں مشائخ نقشبندیہ کے بالعموم اور شاہ غلام علی دہلوی کے بالخصوص حالات اور ملفوظات نقل ہوئے ہیں۔ **جواھر علویہ** شاہ رؤف احمد نے تقریباً ۱۲۳۴-۱۲۴۰ھ / ۱۸۱۹-۱۸۲۴ء میں مکمل کی۔ یہ کتاب (فارسی) تاحال شائع نہیں ہوئی۔ اس کا ایک قلمی نسخہ آزاد لائبریری ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود ہے [۱۰] اور اس کا عکس ابو الحسن زید فاروقی صاحب ، چتلی قبر ، دہلی کے ہاں دستیاب ہے۔ **جواھر علویہ** کی ایک تلخیص مع اضافات شاہ عبدالغنی مجددی (م۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۸ء) نے تیار کی تھی جو **مقامات مظھری** کے تکملہ کے طور پر پہلے ۱۲۶۹ھ میں مطبع احمدی ، دہلی سے اور بعد میں **مقامات مظھریہ** ، طبع حقیقت کتابوی ، استنبول، ۱۹۹۰ء کے ساتھ(صفحات ۱۵۸-۲۰۲) شائع ہوئی [۱۱] اس فارسی تلخیص و تکملہ کا اردو ترجمہ محمد اقبال مجددی صاحب نے کیا ہے جو ان کے **مقامات مظھری** کے دونوں ایڈیشنوں میں شامل ہے۔ **جواھر علویہ** کا ایک غیر مربوط اردو ترجمہ ۱۹۱۹ء میں ملک فضل الدین نے لاہور سے شائع کیا تھا۔ مولانا نور احمد امرتسری مرحوم نے اس کا جوہر در احوال حضرت مجدد، **کنز الھدایات** کے ساتھ شائع کیا تھا۔[۱۲] **جواھر علویہ** کی مذکورہ بالا فارسی تلخیص اور ملک فضل الدین کے اردو ترجمے سے ہم نے اپنے مجموعۂ ملفوظات کا تقابل کرلیا ہے۔ یہ دو مختلف کتابیں ہیں ۔

حواشی

۱۔ محمد اقبال مجددی، مقامات مظھری تالیف حضرت شاہ علی دہلوی، اردو سائنس بورڈ ، لاہور، ۲۰۰۱ء ، طبع دوم ،مقدمہ ص ۱۶۹

۲۔ ایضاً ،ص ۱۶۹-۱۷۰

۳۔ ایضاً ،ص ۱۷۰

۴۔ **تحفة المرسله** کے دیباچے میں اگرچہ یہ جملہ موجود ہے "جمعتھا و رتبتھا للولو الصالح الروحانی عبدالقادر الجیلانی" یعنی مصنف نے یہ کتاب اپنے روحانی فرزند شیخ عبدالقادر جیلانی کے لیے جمع اور مرتب کی۔ اس سے ذہن شیخ عبدالقادر جیلانی کے شیخ طریقت ابو سعید مبارک مخزمی [جنہیں مخزومی بھی لکھا جاتا ہے] کی طرف جاتا ہے اور یہ انہی کے نام سے چھپ بھی چکا ہے لیکن **تحفة المرسله** کے مؤلف اور شیخ عبدالقادر جیلانی کے شیخ طریقت کے شجرۂ نسب کے اسماء میں جو فرق ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ شیخ عبدالقادر کے شیخ طریقت کی تصنیف نہیں ہے۔ دیکھیے: شریف احمد شرافت نوشاہی، **شریف التواریخ** ، ادارۂ معارف نوشاہیہ ، ساہن پال شریف ، ضلع گجرات ، ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء ، جلد اول ، ص ۶۴۱

Marfat.com

۵۔ کنز الهدایات از محمد باقر بن شرف الدین لاہوری عباسی حنفی ، بہ اہتمام نور احمد امرتسری ۱۳۳۵ھ میں شائع ہوئی۔

۶۔ رفیق الطالبین کے مصنف ابو محمد غلام حسین بن شیخ شرف الدین ہوشیار پوری سلسلۂ مظہریہ مجددیہ کے مرید تھے۔ ہمارے نسخہ کے ترقیمہ کی عبارت یہ ہے: تمت رسالہ رفیق الطالبین من تصنیف مولانا مولوی صاحب حضرت مولوی غلام حسین صاحب ہوشیارپوری مدظلہ مسند نشینِ تکیہ مولانا مرشد نا ...... ھادینا وسیلتنا الی اللہ اللطیف مولانا شاہ محمد شریف قدس اللہ تعالی اسرارہ در شیخ علی الطالبین انوارہ [؟؟] تحریر بتاریخ بستم ماہ مبارک رمضان شریف ۱۲۶۲ ہجری مقدس سی ام ماہ بھادھون ۱۹۰۳"۔اس ترقیمے میں مصنف کے نام کے ساتھ "مدظلہ" لکھا گیا ہے یعنی وہ ۱۲۶۲ھ میں بقید حیات تھے۔ مولوی غلام حسین ہوشیارپوری کی دو اور تصانیف تحقیقات ضروریہ للجمعہ اور رفیق السالکین کے قلمی نسخے بھی دستیاب ہیں۔ دیکھیے: احمد منزوی ، فہرست مشترک نسخہ ھای خطی فارسی پاکستان ، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان ، اسلام آباد، ۱۹۸۳ء ، جلد دوم ، ص ۱۰۵۸؛ جلد سوم ، ۱۹۸۴ء، ص ۱۵۲۲؛ جلد چہاردہم ، ۱۹۹۷ء ، ص ۴۴۸

۷۔ یقیناً یہ درّ المعارف کی تدوین کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اسی مجموعے میں ۱۲۳۱ھ کی مجالس کے ملفوظات ہیں

۸۔ شاہ رأفت کی اپنی عبارت یہ ہے اور یہی زیر نظر مجموعے کا ابتدائیہ بھی ہے: "بعد حمد و صلوۃ فقیر رؤف احمد مجددی جعلہ اللہ سبحانہ لذاتہ گزارش می نماید کہ چون در سنہ یک ہزار و دو صد و سی و دویم ۱۲۳۲/ سعادت تألیف ملفوظات حضرت پیر دستگیر قیوم زمان قطب دوران مرشدنا و امامنا حضرت عبداللہ دہلوی معروف حضرت شاہ غلام علی مدظلہ العالی حاصل نمودم بعد ازان ، آنجناب این بندۂ گندہ را مشرف بخلافت فرمودہ برائے ترویج طریقہ بطرف مالوہ رخصت نمودند۔ بعد از مراجعت ازآن سفر چون حاضر حضور شدباز بخاطر ریخت کہ چندی از دُرر غرر معارف کہ از زبان گو ہر فشان حضرت ایشان میریزند ، در رشتۂ تحریر انتظام دہم و کتابی دیگر جمع نمایم۔ بسبب عدم فرصت از حلقہ و مراقبہ مقعر این امر ماندم ۔ آخرش چندی از تقریرات،ہفت روزہ رشحہ ای از آن سحاب و نفحۂ از آن گلستان برای شاداب ساختنِ کشت قلوب طالبان صادقان و معطر نمودن دماغ صوفیانِ صافیان در سلک تحریر در آوردم" (ص ۲-۳)

۹۔ یہ رسالہ در ذکر مقامات و معارف و واردات حضرت مجدد اورمقامات مظہری ہو سکتے ہیں۔

۱۰-شاہ عبدالغنی اس کے سبب تالیف میں لکھتے ہیں" قدری ذکر شریف آنحضرت (شاہ غلام علی) مع ذکر خلفا مجملا ومنتخبا از جواہر علویہ کہ عم فقیر شاہ روف احمد مرحوم تالیف فرمودہ اند و نیز چیزی کہ علم فقیر بران رسیدہ بود ایراد نمود" (طبع استنبول،ص ۱۵۸)۔اس ایڈیشن کی فراہمی ترک محقق ڈاکٹر نجدت طوسون ،استنبول کے ذریعے ہوئی جس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں۔

.11-*Catalogue of Manuscripts in the Maulana Azad Library (Added during 1970-77)*, Aligarh, 1980, Vol. 1, p.60

۱۲۔محمد اقبال مجددی حوالۂ مذکور، ص ۵۶۹

☆☆☆

Marfat.com

عربی، فارسی اور اردو حروف تہجی کا تقابلی جائزہ

ڈاکٹر محمد عطاء اللہ خان☆

اردو اور فارسی حروف تہجی کا منبع عربی حروف ہجا ہیں۔ آرامیوں نے کنعانیوں سے ۲۲ حروف ہجا لیے تھے اور انہوں نے ان کے یہ نام رکھے۔ ان ناموں کی پہلی صورت ان کی نمائندہ صوت ہے۔ یہ نام آرامی، عبرانی اور عربی زبانوں میں بامعنی ہیں۔(۱) ذیل میں قدیم آرامی رسم الخط کے حروف تہجی دیے جاتے ہیں:

شکل	نام	معنی (اردو)
ا	الف	سینگ
ب	بیت	گھر
ج	جمل	اونٹ
د	دالث	دروازہ
ہ	ہے	کھڑکی
و	واؤ	کھونٹی
ز	زین	ہتھیار
ح	حیط	جنگلہ
ط	طیط	روئی
ی	ید	ہاتھ
ک	کاف	ہتھیلی
ل	لامد	پھندا
م	میم	پانی
ن	نون	سانپ

☆سابق استاد، اسلام آباد ماڈل کالج برائے طلبہ، G-6/3، اسلام آباد

Marfat.com

شکل	نام	معنی
س	سامک	مچھلی
ع	عین	آنکھ
ف	فے	منہ
ص	صاد	نیزہ
ق	قوف	گدی
ر	ریش	سر
ش	شین	دانت
ت	تاؤ	نشان

آرامی خط کے یہ ۲۲ حروف: ابجد ہوز حطی کلمن سعفص قرشت، عربی زبان کی اصوات کو پورے طور پر ادا نہیں کرسکتے تھے، اس لیے عربوں نے خط حمیری کے چھے حروف یعنی: ث، خ، ذ، ض، ظ اور غ اس میں شامل کرکے ۲۸ حروف پر مشتمل اپنا رسم الخط وضع کیا۔ مبطیوں نے اس میں "ء" کا اضافہ کیا۔ اس طرح ۲۹ حروف پر مشتمل عربی زبان کی تہجی وضع ہوگئی۔(۲) عباسی دور تک ان حروف کی ترتیب ابجدی یہی رہی ہے۔ ابجد ہوز حطی کلمن سعفص قرشت ثخذ ضظغ

عباسی دور ہی کے ایک عظیم خطاط ابن مقلہ نے اس کی درج ذیل ترتیب نو کی (۳) جو ابتک عربی، فارسی، اردو اور دیگر ان زبانوں میں رائج ہے جو عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں: ا ب ت ث ج ح خ د ذ ر ز س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک ل م ن و ہ ء ی

شمس قیس رازی (متوفی نصف اول ہفتم صدی ہجری) نے اس میں فارسی زبان کے چار حروف: پ، چ، ژ اور گ شامل کیے۔(۴) اس طرح فارسی حروف ہجا کی تعداد ۳۳ ہوگئی۔ فارسی کے انہی حروف ہجا میں تین ہندی تحی اصوات، ٹ، ڈ اور ڑ شامل کرکے اردو کا ابجدی نظام قائم کیا گیا، جو ابتک رائج ہے۔ اردو حروف تہجی کی ترتیب اور نام وہی ہیں جو فارسی کے ہیں، تاہم نام میں کہیں کہیں قدرے فرق بھی ہے:

شکل	اردو نام (۵)	فارسی نام (۶)
ا	الف	الف
ب	بے	با
پ	پے	پا
ت	تے	تا

Marfat.com

ٹ	ٹے	-
ث	ثے	ثا
ج	جیم	جیم
چ	چے	جیم فارسی
ح	حے	حا
خ	خے	خا
د	دال	دال
ڈ	ڈال	-
ذ	ذال	ذال
ر	رے	را
ڑ	ڑے	-
ز	زے	زا
ژ	ژے	ژا
س	سین	سین
ش	شین	شین
ص	صاد	صاد
ض	ضاد	ضاد
ط	طوئے	طا
ظ	ظوئے	ظا
ع	عین	عین
غ	غین	غین
ف	فے	فا
ق	قاف	قاف
ک	کاف	کاف
گ	گاف	گاف
ل	لام	لام
م	میم	میم

Marfat.com

ن	نون	نون
و	واؤ	واؤ
ہ	ہے	ہا
ء	ہمزہ	ہمزہ
ی	یے	یا
ے	بڑی ے	

اردو حروف تہجی میں عربی، فارسی اور ہندی اصوات کے حروف شامل ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:(۷)

۱۔ خالص عربی حروف: ث، ح، ذ،ص،ض،ط،ظ،ع اور ق

۲۔خالص ہندی حروف: ٹ،ڈ، ڑ

۳۔خالص فارسی حرف: ژ

۴۔ہندی و فارسی کے مشترک حروف: پ،چ اور گ

۵۔عربی و فارسی دونوں کے مشترک حروف: ز،ف،خ اور غ

۶۔مذکورہ بالا حروف کے علاوہ، اردو تہجی کے باقی حروف عربی، فارسی اور ہندی تینوں زبانوں میں مشترک ہیں۔

مذکورہ ۳۷ حروف تہجی کے علاوہ مندرجہ ذیل پندرہ اور شکلیں بھی ہیں، جو دو چشمی ''ھ'' سے مخلوط ہوکر بنی ہیں۔ ان کو عموماً مخلوط ہا کہتے ہیں۔ دراصل یہ مرکب نہیں بلکہ مفرد آوازیں ہی ہیں، جو بھاری (مہاپران) آوازیں کہلاتی ہیں۔(۸) تفصیل ملاحظہ ہو: بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، ڑھ، رھ، کھ، گھ، لھ، مھ اور نھ یہ آوازیں خالص ہندوستانی ہیں اور یہ عربی اور فارسی میں موجود نہیں اور ان میں سے رھ، لھ، مھ، اور نھ خالص اردو کی ہیں جو ہندی میں بھی موجود نہیں۔(۹)

اردو رسم الخط میں دو چشمی ہے کو ہائے متصل کہتے ہیں اور اسے صرف مذکورہ بھاری آوازوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جب ''ہے'' کو الگ حرف کے طور پر استعمال کرتے ہیں تو اسے ہائے منفصل کہتے ہیں اور ان دونوں کو ذیل میں دیے گئے طریقے کے مطابق لکھتے ہیں:

ہائے متصل	ہائے منفصل
بھلا	بہلا

Marfat.com

ہائے متصل	ہائے منفصل
پھلا	پہلا
بھرا	بہرا
کھلا	کہلا

عربی اور فارسی میں چونکہ ہائے متصل اور منفصل کا فرق نہیں، اس لیے ان زبانوں میں املاء کا یہ فرق نہیں ہے، لیکن اردو زبان میں یہ فرق ضروری ہے تاکہ ان دونوں میں امتیاز کیا جاسکے۔نون غنہ، واؤ مجہول اور ہائے مجہول اگرچہ اردو حروف تہجی میں شامل نہیں، تاہم املاء میں ان کی شکل الگ ہے۔تحریر میں اس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہیں: ں، و، اور ے یہ آوازیں خالص ہندی ہیں۔ قدیم فارسی میں ان کا استعمال تھا لیکن عربی کے زیر اثر جدید فارسی میں یہ آوازیں اب ناپید ہیں۔

اردو اور فارسی میں علاماتِ حرکت یکساں ہیں۔ کچھ ماہرین لسانیات نے ہندی مجہول اصواتِ مرکب کے لیے علامات، الگ سے بنانے کی کوششیں کی ہیں مگر وہ اردو میں مقبول نہیں ہوسکیں اور نہ کسی بھی قواعد کی کتاب میں شامل ہوسکی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ پروفیسر سید محمد سلیم، اردو رسم الخط، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۱ء، ص ۱۷۔۱۶

۲۔ایضاً، ص ۲۶

۳۔اعجاز راہی، تاریخ خطاطی، ادارۂ ثقافت پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص ۷۵

۴۔پرویز ناتل خانلری، تاریخ زبان فارسی، تہران، چاپ پنجم، ۱۳۷۴ شمسی ص ۶۹۔۶۵

۵۔بنجمن شلزے، ہندوستانی گرائمر، مرتب ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۷۷ء، ص ۵۹، ۶۰

۶۔حسن صدر الدین حاج سید جوادی، دستور نویسی فارسی در شبہ قارہ ، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء، ص ۱۴۴۔۱۰۶

۷۔مولوی عبدالحق، قواعد اردو، لاہور اکیڈمی، لاہور، ۱۹۵۸ء، ص ۳۷

۸۔ایضاً، ص ۳۸

۹۔سلیم فارانی، اردو زبان اور اس کی تعلیم، پاکستان بک سٹور، لاہور، (بار سوم)، ۱۹۶۷ء، ص ۱۱۰

☆☆☆

Marfat.com

اردو شاعری میں احوالِ چشمِ جاناں

محمد شعیب☆

اردو اصناف ادب پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والی زبان فارسی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ متحدہ ہندوستان پر مسلمانوں کے طویل دور حکومت میں فارسی ہی سرکاری زبان کا درجہ رکھتی تھی اور فرمانروایانِ ہند ہمیشہ اس کی سرپرستی کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری بھی فارسی زبان کی ہمیشہ مرہون منت رہی۔ سب سے مقبول صنف ادب ''غزل'' فارسی سے ہی اردو میں وارد ہوئی۔ ہمارے شعراء نے فارسی الفاظ و تراکیب اور تشبیہات و استعارات کو اپنی شاعری میں یوں برتا کہ آج یہ اردو کا جزوِ لازم سمجھے جاتے ہیں اور زبان زد خاص و عام ہیں۔

عشق و محبت اور واردات قلبی کا بیان فارسی کے نامور شعراء کے ہاں بڑے سلیقے سے ہوا ہے۔ انہیں کے زیر اثر اردو شاعری میں بھی محبوب کے سراپا کے بیان میں قیامتیں ڈھائی گئیں یہانتک کہ ہر عضو محبوب پر شعروں کے خزانے کھوجیوں کی راہ تک رہے ہیں کہ ان کو منظرِ عام پر لایا جائے۔ ان میں لب و رخسار، زلف پیچاں، پتلی کمر، گردن اور قد و قامت کے ساتھ، چشم جاناں سب سے اہم ہے کہ اسی سے عشاق کے دل لخت لخت ہوتے ہیں۔ زیر نظر مضمون میں اس حوالے سے چند معروف شعراء کے کلام کا مختصراً جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اردو شاعری کے باوا آدم ولی دکنی کا دیوان عشقیہ شاعری کا مرقع ہے۔ محبوب کی آنکھوں کا بیان ان کے ہاں انتہائی دلنشین ہے۔ کلام ولی سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا　　جادو ہیں تیرے نین غزالاں سوں کہوں گا

قتل کرتے ہیں دو نیناں پرخمار　　کون ہے لیوے تجھ آنکھوں سے قصاص

صنم ترے نین کی آرزو میں　　کبھو سالم، کبھو بیمار ہیں

خدائے سخن میر تقی میر محبوب کی نیم باز آنکھوں کو شراب کی مستی سے تشبیہہ دیتے ہیں:

☆ مکان نمبر ایف۔۸۲/۲۷، پی او ایف، واہ کینٹ

Marfat.com

میر ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے

وہ محبوب کی آنکھوں سے ڈسے جانے کے بعد ان سے دور بھاگنے کا مشورہ دیتے ہیں کہ وحشت کرنا محبوباؤں کا دلپسند مشغلہ ہے:

دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھ طریق غزالوں کا   وحشت کرنا شیوہ ہے، کچھ اچھی آنکھوں والوں کا

میر درد کو صوفی شاعر کہا جاتا ہے لیکن [redacted] بھی کسی کی چشم مست کا شکار رہے اور دل محبوب مجازی کو دے بیٹھے:

دل کس کی چشم مست کا سرشار ہوگیا   کس کی نظر لگی جو یہ بیمار ہوگیا

وہ محبوب کی آنکھوں کو برچھیوں سے تشبیہ دیتے ہیں کہ ان سے عشاق کے دل چھلنی ہوجاتے ہیں:

وہ نگاہیں جو چار ہوتی ہیں   برچھیاں ہیں کہ پار ہوتی ہیں

مرزا محمد رفیع سودا اردو کے نامور شاعر اور حریف میر تھے۔ ان کے کلام کا ایک خاص رنگ ہے۔ اس سے قطع نظر کہ نقاد غزلیات میر کے مقابل ان کی غزلوں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے ان کا صرف ایک شعر پیش خدمت ہے جس سے انہوں نے چشم محبوب میں ڈوبنے کی کیفیت واضح کی ہے۔ رعنائی خیال کا کرشمہ ملاحظہ ہو:

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا   ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

غلام ہمدانی مصحفی کے کلام پر میر کا گہرا اثر ہے کہ میر سے شرف ملاقات رکھتے تھے اور انشاء اللہ خان کے حریف تھے۔ جس نازنین کے جلووں کا شکار ہوئے اس کی آنکھوں کا بیان یوں کرتے ہیں:

اس نازنین کی باتیں کیا پیاریاں پیاریاں ہیں   پلکیں ہیں جس کی چھریاں، آنکھیں کٹاریاں ہیں

حیدر علی آتش بانکے شاعر تھے۔ پہلوان ناسخ ان کی کارستانیوں سے چراغ پا رہتے تھے۔ لکھنؤ میں رہ کر محبت نہ کرنا بھلا کیسے ممکن تھا، مگر محبوب کی آنکھوں کی مستی کو حیا بھری آنکھیں کہہ کر طرح دے گئے:

تشنۂ مے نے نقاب رخ زیبا الٹا   ٹھوکریں کھاتی ان آنکھوں میں حیا پھرتی ہے

مرزا غالب سے کون واقف نہیں ہے۔ شوخی و شرارت اور فلسفہ و ظرافت جہاں ان کے کلام کی خوبیاں ہیں وہاں فارسی الفاظ و تراکیب نے ان کے کلام کو دوآتشہ کردیا ہے۔ کچھ عرصہ غالب اردو کو فارسی سے کمتر بھی سمجھتے رہے کہ وہ دور ہندوستان میں مسلمانوں اور فارسی کے زوال کا دور تھا اور غالب نے فارسی کو سینے سے لگائے رکھا۔ غالب نکتہ شناس اپنے

Marfat.com

محبوب کی آنکھوں کو فسوں گر کہتا ہے کہ عشاق کے دل انہی کے حلقوں کے دام میں پھنستے ہیں۔ غالب کی سحرکاری دیکھیے:

اس چشم فسوں گر کا اگر پائے اشارہ		طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے
دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر		یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

غالب آشفتہ نوا خود دام محبوب میں پھنسنا چاہتے تھے کہ محبوب کی آنکھیں دیکھنے کے تمنائی رہے، بیشک ''اندازِ عتاب'' ہی سہی۔

منہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا، پر بہ انداز عتاب		کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

عشق پیشہ مومن خاں مومن وہ شاعر ہیں کہ غالب سے استادِ سخن نے ان کے ایک شعر کے بدل اپنا پورا دیوان دینے کے لیے کہا تھا۔ مومن اپنے محبوب کی آنکھوں کے بارے میں یوں سخن طراز ہیں:

اعجاز سے زیادہ ہے سحر اس کے ناز کا		آنکھیں وہ کہہ رہی ہیں جو لب سے بیاں نہ ہو
یارو وہ شرم سے کچھ نہ بولا تو کیا ہوا		آنکھوں ہی آنکھوں میں سو طرح کی حکایت ہوگئی

یعنی مومن کے محبوب کی آنکھیں کلام کرتی ہیں۔

شیخ محمد ابراہیم ذوق بادشاہ وقت کے استاد تھے۔ محبوب کی نگاہ ناز کی نیرنگیاں زبانِ ذوق سے سنیے:

وصفِ چشم و وصفِ لب اس یار کا کہنے کو ہیں		آج ہم درس اشارات و صفا کہنے کو ہیں
نگاہ وہ ترک کہ جس کی نہیں جفا کی پناہ		اور اس کی آنکھ وہ کافر کہ بس خدا کی پناہ

الطاف حسین حالی، غالب کے شاگرد تھے۔ انہوں نے جدید شاعری کی داغ بیل ڈالی۔ مولانا صفت حالی کا دل احتیاط کے باوجود محبوب کی صرف ایک نظر سے ہی نیم جاں ہوگیا:

کیا جانتے تھے جائے گا جی اک نگاہ میں		تھی دل کی احتیاط مگر بیم جاں نہ تھا

حضرت اکبر الٰہ آبادی کی شاعری طنز و ظرافت سے بھرپور ہے۔ باریش شخص تھے۔ اللہ سے نگاہ ناز بتاں سے بچنے کی دعا مانگتے رہے کہ یہ دین و ایمان کی راہزن ہے لیکن ان کی دعا رد ہوگئی اور جس چہرے پر گل کا گماں ہوتا تھا اس کی آنکھوں کے سامنے سب کچھ ہار بیٹھے۔ خوبصورت زبان و بیان کے پیرائے میں ان کے صرف دو اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

نگاہ ناز بتاں سے خدا بچائے رکھے		یہ وہ نظر ہے کہ راہزن ہے دین و ایماں کی
وہ نظر جو مجھ سے ملا گئے تو یہ اور آفتیں دکھا گئے		کہ حواس و ہوش و خرد ہے اب نہ شکیب و صبر قرار ہے

Marfat.com

داغ دہلوی، شاعر مشرق علامہ اقبال کے استاد تھے اور ایک زمانہ ان کی استادی کا معترف رہا۔ داغ کا شعر محبوب کی قاتل نگاہ کے پس منظر میں دیکھیں:

گئے ہوش تیرے زاہد جو وہ چشم مست دیکھی　　مجھے کیا الٹ نہ دیتی جو نہ بادہ خوار ہوتا

قومی ترانہ کے خالق حفیظ جالندھری کا **شاہنامۂ اسلام** شہرت دوام حاصل کر چکا ہے لیکن ان کی آہنگ بھری عشقیہ شاعری اپنی جگہ لاجواب ہے۔ ساتویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ حفیظ کے ہاں تذکرۂ نگاہ ناز ملاحظہ ہو:

ایمان شکن آنکھیں دل میں ہیں، دل ان میں ہے　　بت خانے میں کعبہ ہے، کعبے میں ہے بت خانہ
نگاہ آرزو آموز کا چرچا نہ ہو جائے　　شرارت سادگی ہی میں کہیں رسوا نہ ہو جائے
الٰہی دلنوازی پھر کریں وہ مے فروش آنکھیں　　الٰہی اتحاد شیشہ و پیمانہ ہو جائے

حسرت موہانی کی زندگی کے کئی روپ ہیں۔ میدان سیاست ہو یا کارزارِ عشق، ہمیشہ پیش پیش رہے۔ ان کی عشقیہ شاعری میں محبوب کی آنکھوں کا انداز کچھ یوں ہے:

روگ دل کو لگا گئیں آنکھیں　　اک تماشا دکھا گئیں آنکھیں
اس نے دیکھا تھا کس نظر سے مجھے　　دل میں گویا سما گئیں آنکھیں
وہ شرمائے بیٹھے ہیں گردن جھکائے　　غضب ہوگیا اک نظر دیکھ لینا

اردو شعراء نے جہاں غزل میں محبوب کی آنکھوں کا احوال مختلف رنگوں میں بیان کیا ہے وہاں نظمیہ شاعری بھی احوالِ چشمِ جاناں سے لبریز ہے۔ فیض جدید شاعری کا ایک بڑا نام ہے۔ کلام فیض حقیقت اور رومان کا حسین امتزاج ہے۔ فیض ایک عرصہ تک اس غلط فہمی کا شکار رہے کہ محبوب کی آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا ہی کیا ہے:

میں سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات　　تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات　　تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے
تو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے

پری چہرہ پروین شاکر کا انداز بیاں دیکھیے۔ تغزل اور موسیقیت یکجان ہیں:

چہرہ میرا تھا نگاہیں اس کی　　خامشی میں بھی باتیں اس کی
میرے چہرے پر غزل لکھتی گئیں　　شعر کہتی ہوئی آنکھیں اس کی

شہید محبت محسن نقوی کی شاعری میں جہاں حضور اقدس حضرت محمدؐ اور آل رسولؐ کی الفت و عقیدت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے وہاں عشق مجازی بھی پوری آب و تاب کے ساتھ

Marfat.com

جلوہ گر ہے۔ محبوب کی آنکھوں پر جہاں کچھ اشعار ہیں وہاں مکمل غزل بھی دلبستگی کا سامان لیے ہوئے ہیں۔ یہاں صنائع بدائع کے ساتھ تشبیہات اور قافیہ و ردیف کی تمام رنگینیاں موجود ہیں:

بھڑکائیں میری پیاس کو اکثر تیری آنکھیں
صحرا میرا چہرہ ہے سمندر تیری آنکھیں
پھر کون بھلا داد تبسم انہیں دے گا
روئیں گی بہت مجھ سے بچھڑ کر تیری آنکھیں
بوجھل نظر آتی ہیں بظاہر مجھے لیکن
کھلتی ہیں بہت دل میں اتر کر تیری آنکھیں
اب تک میری یادوں سے مٹائے نہیں مٹتا
بھیگی ہوئی اک شام کا منظر تیری آنکھیں
ممکن ہو تو اک تازہ غزل اور بھی کہہ لوں
پھر اوڑھ نہ لیں خواب کی چادر، تیری آنکھیں
یوں دیکھتے رہنا اسے اچھا نہیں محسن
وہ کانچ کا پیکر ہے تو پھر تیری آنکھیں
ریشم زلفوں، نیلم آنکھوں والے اچھے لگتے ہیں
میں شاعر ہوں، مجھ کو اجلے چہرے اچھے لگتے ہیں

منیر نیازی اردو شاعری کا ایک خوبصورت باب ہیں۔ ان کے محبوب کی طلسماتی نگاہوں کا احوال انہی کی زبانی سنیے:

اس کی آنکھ کے جادو کی ہر ایک کہانی سچی
میرے دل کے خوں ہونے کے سب افسانے جھوٹے
سنبھل کر دیکھ طلسمات ان نگاہوں کا
دل تباہ کی رنگین پناہ گاہوں کا

احمد فراز ہمارے عہد کا بڑا شاعر ہے اور ہم غزل کے عہد فراز میں زندہ ہیں۔ فراز کی شاعری خاص و عام میں مقبول ہے۔ ماؤں نے فراز کے نام پر بچوں کے نام رکھے اور بقول رؤف امیر، عشاق اپنے خطوں میں ایک دوسرے کو فراز کے شعر لکھتے ہیں۔ فراز کے بے وفا محبوب کی سیاہ چشمگی قیامت ہے اور ایک نگاہ سے ہی قافلۂ دل لٹ جاتا ہے۔ محبوباؤں کے محبوب شاعر احمد فراز کے کلام سے چشم محبوب کا احوال ملاحظہ کیجیے:

سنا ہے حشر ہیں اس کی غزال سی آنکھیں
سنا ہے اس کو ہرن دشت بھر کے دیکھتے ہیں
سنا ہے اس کی سیاہ چشمگی قیامت ہے
سو اس کو سرمہ فروش آہ بھر کے دیکھتے ہیں
بس اک نگاہ سے لٹتا ہے قافلہ دل کا
سو راہروان تمنا بھی ڈر کے دیکھتے ہیں

دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مصداق آخر میں کچھ شعراء کا کلام بلاتبصرہ پیش خدمت ہے:

حرف و لب سے ہوتا ہے کب ادا ہر اک مفہوم
بے زبان آنکھوں کی گفتگو بھی سمجھا کر

(محسن بھوپالی)

Marfat.com

کر نہ لیں وہ آمادہ مجھ کو ترکِ بادہ پر
دیکھ کر ان آنکھوں کو، جام بھول جاتا ہوں

میرے دامن پر دنیا نے یہ الزام لکھا ہے
پیاسی رت میں ان آنکھوں کو میں نے جام لکھا ہے
(قتیل شفائی)

ہم نے کب ستاروں سے روشنی کی خواہش کی
ہم تمہاری آنکھوں سے شب کو جگائیں گے

روشنیوں کے سارے منظر جھوٹے لگتے ہیں
لیکن اس کی آنکھ کے آنسو سچے لگتے ہیں
(نوشی گیلانی)

تیری چشمِ فسوں ساز تھی کہ موجِ کرم
وہیں وہیں پہ میں ڈوبا جہاں جہاں ٹھہری
(ناصر زیدی)

گہری جھیل سی آنکھوں میں
ڈال کے کالا کاجل
اک معصوم سے راہی کو
کر دیا تو نے پاگل

(سعد اللہ شاہ)

منابع و مآخذ

۱۔ کلیاتِ ولی، مرتبہ نور الحسن ہاشمی، الوقار پبلی کیشنز، لاہور
۲۔ کلیاتِ میر، مرتبہ کلب علی خان فائق، مجلس ترقی ادب، لاہور
۳۔ اردو پوائنٹ ڈاٹ کام۔ انٹرنیٹ سروس
۴۔ کلیاتِ آتش، مرتبہ ظہیر الدین احمد، اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی
۵۔ دیوانِ غالب، مرتبہ غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور
۶۔ کلیاتِ مومن، منشی نول کشور، کانپور
۷۔ کلیاتِ اکبر الہ آبادی، مرتبہ سید محمد مسلم رضوی، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی
۸۔ انتخاب کلامِ داغ، مرتبہ محمود الرحمٰن، میپکو، اسلام آباد
۹۔ محمد جمیل احمد، اردو شاعری پر ایک نظر، غضنفر اکیڈمی پاکستان، کراچی

Marfat.com

۱۰۔انتخاب حسرت، مرتبہ جلیل قدوائی، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی

۱۱۔فیض احمد فیض، نسخہ ھائے وفا، مکتبہ کارواں، لاہور

۱۲۔پروین شاکر، ماہ تمام، مراد پبلی کیشنز، اسلام آباد

۱۳۔کلیات منیر، مظہر پبلی کیشن، لاہور

۱۴۔کلیات احمد فراز، ماوراء پبلشرز، لاہور

۱۵۔سعد اللہ شاہ، تشنگی باقی رھے گی، عمیر پبلشرز، لاہور

☆☆☆

Marfat.com

ڈارون کا تصورِ ارتقاء اور اقبال

ایک تحقیقی جائزہ

ڈاکٹر محمد آصف اعوان☆

چارلس ڈارون (۱۸۸۲ء۔۱۸۰۹) کو مغرب کی مادہ پرست فکر اور تحریک الحاد کا نمائندہ مفکر قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس نے اگرچہ ابتدائی عمر ہی میں طب اور دینیات کی تعلیم حاصل کرلی تھی، تاہم اسے حیوانات اور نباتات کے مشاہدے اور ان کی شکل و ساخت کے تغیرات معلوم کرنے اور اس کی توجیہات پر غور کرنے کا بہت لپکا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے پانچ نہایت قیمتی سال بحری سفر میں صرف کیے۔ یہ سفر دراصل ڈارون کے لیے حیوانات اور مظاہر فطرت کا ایک مطالعاتی سفر تھا۔ اس سفر کے مشاہدات نے ڈارون کے فلسفۂ ارتقاء کے لیے خشتِ اول کا کام کیا۔ مظاہر فطرت کے اندر تغیرات اور مماثلتوں کے مشاہدے نے اس کے ذہن میں کئی ایک سوالات پیدا کیے جس کے نتیجے میں اس کے دماغ میں تخلیقات کی مختلف انواع کے درمیان ایک منطقی ربط اور تسلسل کا کھوج لگانے کا خیال پیدا ہوا۔ یہ گویا ڈارون کے تصورِ ارتقاء کا ابتدائی مبہم خاکہ تھا۔

ڈارون کا فلسفۂ ارتقاء پہلی مرتبہ جامع صورت میں اس کی کتاب '' مبدأحیات بوسیلہ قدرتی انتخاب'' *On the Origin of Species by Means of Natural Selection* میں منظر عام پر آیا۔ یہ کتاب ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی اور اس نے فکری دنیا میں ایک انقلاب برپا کردیا۔ ڈارون نے کہا کہ ہر جاندار کے جسم اور شکل و ساخت میں مسلسل خفیف تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں اور ایک طویل مدت کے بعد ان تبدیلیوں کے جمع ہو جانے سے ایک نیا جاندار وجود میں آتا ہے۔ اگر اس جاندار کی نسل جسمانی بناوٹ کے لحاظ سے جہد للبقا (Struggle for existence) کے دوران اپنے ماحول کی مشکلات سے کامیاب مقابلہ کرسکے تو ■ زندہ رہتی

☆ گورنمنٹ اسلامیہ کالج، گوجرانوالہ

Marfat.com

ہے، ورنہ مٹ جاتی ہے۔ چنانچہ زندگی اپنے ظہور کے بعد مسلسل ارتقاء پذیر ہے اور اسی وجہ سے مختلف انواع کے وجود بنتے اور مٹتے رہتے ہیں۔ روئے زمین پر نوعِ بشر کا ظہور بھی ارتقاء کے اسی قاعدے کا نتیجہ ہے۔

As Natural selection acts solely by the preservation of profitable modifications, each new form will tend in a fully-stocked country to take the place of, and finally to exterminate, its own less improved parent form and other less favoured forms with which it comes into competition. Thus extinction and natural selection go hand in hand. (1)

ڈاردن کے تصور ارتقاء میں انتخاب طبعی (Natural Selection) اور تنازع للبقاء (Struggle for existence) دو اہم پہلو ہیں۔ ڈاردن کے خیال میں وقت اور ماحول کے مطابق اپنے آپ کو جلد از جلد ڈھال لینے کا عمل انواع کی نہ صرف بقاء بلکہ دیگر انواع پر حکمرانی اور غلبے کا باعث بھی بنتا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف فلاسفی میں درج ہے۔

Some variations provide the organisms with an advantage over the rest of the population in the struggle for existence.(2)

ایسی انواع جو تنازع للبقاء کے دوران بہتر حکمت عملی کی بدولت اپنے نظام اور ساخت حیات میں ایسے تیز رفتار تغیرات کے عمل سے گذرتی ہیں جو انہیں دیگر انواع سے یکسر ممتاز (Distinct) کردیں وہ انتخابِ طبعی کے عمل میں بھی سرخرو رہتی ہیں۔ انتخاب طبعی کا عمل کیا ہے؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاردن کہتا ہے کہ انواع کے اندر غیر محدود طور پر بڑھنے، ترقی کرنے اور نسل میں اضافہ کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے جس سے آبادی میں بیحد اضافہ ہوجاتا ہے، لیکن وسائل حیات نہیں بڑھتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قدرتی آفات مثلاً بیماری، وبا، جنگ، قحط، زلزلہ اور موت کی دیگر صورتوں سے انواع اور وسائل حیات میں توازن قائم ہوجاتا ہے۔ ڈاردن کا خیال ہے کہ اس طریقے سے قدرت صرف ان انواع کا انتخاب کرتی ہے اور انہیں زندہ رہنے کا حق دیتی ہے جو کسی لحاظ سے دیگر انواع سے بہتر ہوں اور جنہوں نے تنازع للبقاء کے عمل میں ماحول کے ساتھ موافقت کرتے ہوئے اپنے آپ کو تغیرات کے عمل سے گذار کر ارتقاء کے اگلے مراحل میں قدم رکھ لیا ہو۔(۳) چارلس ڈاردن لکھتا ہے:

Every being which during its natural lifetime produces several eggs or seeds must suffer destruction during some period of its life, and during some season or occasional year; otherwise, on the principle of

Marfat.com

geometrical increase, its number would quickly become so inordinately great that no country could support the product. Hence,as more individuals are produced than [redacted] possibly survive, there must in every case be a struggle for existence, either one individual with another of the same species, or with the individuals of distinct species or with the physical conditions of life.(4)

آگے چل کر ڈارون اور بھی زیادہ واضح انداز میں لکھتا ہے:

There is no exception to the rule that every organic being naturally increases at so high a rate,.that, if not destroyed, the earth would soon be covered by the progeny of a single pair.(5)

ڈارون چونکہ میکانکی اور مادی نقطہ نظر کا حامل تھا اس لیے ابتدائے حیات کے سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں اور وہ اسے ایک ناقابل حل معما اور انسان کے حیطۂ عقل سے ماوراء مسئلہ قرار دیتا ہے۔ اسے اس بات کا پختہ یقین تھا کہ انواع کے حیاتیاتی ارتقاء میں کسی مافوق الفطرت ہستی یا قوت کا عمل دخل نہیں۔ ہیرلڈ ہولڈنگ لکھتا ہے:

اگر مادیت سے محض یہ مراد لی جائے کہ یہ فوق الفطرت مداخلت کو برطرف کر کے مظاہر کو معین فطری قوانین میں تحویل کرنے کا نام ہے تو ڈارون یقیناً مادیتی تھا۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ جانداروں کی صورتیں مکمل طور پر خدا کے تصور میں نہیں تھیں۔ یہ شکلیں نہایت ادنیٰ شروعات سے اور ماحول کے مسلسل اثرات سے طویل عمل ارتقاء کے بعد بنی ہیں۔(۶)

مختصر یہ کہ ڈارون کے نزدیک کائنات کی حیثیت ایک ایسی مشین کی سی ہے جس میں مظاہر اور انواع مشین کے پرزوں کی صورت میں میکانکی انداز میں کام کرتے اور مقررہ قوانین کے تحت چلتے ہیں۔ زندگی اپنے ادنیٰ ترین مراحل سے انسانی سطح کے اعلیٰ ترین مرحلے تک انہی معین قوانین اور میکانکی عمل کے نتیجے میں پہنچی ہے۔

اقبال کی فکر کا بنیادی نکتہ اس کا فلسفہ خودی تصور کیا جاتا ہے تاہم اگر بنظر عمیق دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی فکر پر اول تا آخر فلسفۂ ارتقاء کی چھاپ ہے یہانتک کہ تصورِ خودی بھی اسی بنیادی اور بڑے فلسفے کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔(۷)

اقبال اور ڈارون میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ اقبال کے نزدیک تمام مادہ کی حقیقت روحانی ہے۔ ''کائنات میں جذبۂ الوہیت جاری و ساری ہے۔'' (۸) مادہ کو اس کی روحانی حقیقت سے الگ رکھ کر دیکھا اور پرکھا نہیں جاسکتا جبکہ ڈارون کی کمزوری یہ ہے کہ

Marfat.com

اس کی نظر کائنات کے صرف مادی پہلو پر ہے۔ چنانچہ ڈارون کے متعلق پروفیسر سی۔ ای۔ ایم۔ جوڈر رقمطراز ہیں کہ "ڈارون کا پیش کردہ نظریہ عمل ارتقاء ارتقائے حیات کا ایسا عمل ہے جسے خالصتاً فطری طاقتوں کی کارفرمائی کا ماحصل سمجھنا چاہیے"(۹) یہی وجہ ہے کہ مغربی فلسفۂ ارتقاء میں ڈارون مادیت پرست اور میکانکی طرز فکر کا سب سے بڑا نمائندہ مفکر بن کر سامنے آتا ہے۔ اس کا یہ خیال ہے کہ تمام مظاہر فطرت میکانکی نوعیت کے حامل قوانین قدرت کے پابند اور اسیر ہیں اور خدا کے وجود کو فرض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، یہانتک کہ حیات اور اس کے تمام ارتقائی مراحل بھی طبعی اور کیمیائی طاقتوں کے اندھا دھند عمل سے انجام پاتے ہیں۔ گویا اقبال کے الفاظ میں : The conecpt of mechanism, a purely physical concept clamied to be the all embracing of nature. (10)

لیکن اقبال کے خیال میں مظاہر فطرت کی توضیح کے لیے محض میکانکی نقطۂ نظر کافی اور تسلی بخش نہیں کیونکہ میکانکی انداز فکر نہ صرف یہ کہ نامکمل معلومات فراہم کرتا ہے، بلکہ مظاہر کے باہمی ربط و تعلق کی نوعیت پر روشنی نہیں ڈالتا۔ اقبال کہتے ہیں کہ Natural science is by nature sectional; it cannot, if it is true to its own nature and function set up its theory as a complete view of reality.(11)

ڈارون کی مادیت پرست سوچ نہ صرف مظاہر فطرت کو میکانکی قوانین کا اسیر دیکھتی ہے بلکہ حیاتیاتی مظاہر کو بھی میکانکی قوانین کی قلمرو میں شامل کر کے تمام حیاتیاتی ارتقائی مراحل کو فطرت کے اندھا دھند عمل کا حاصل قرار دیتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ڈارون کے تصور ارتقاء میں حیات ارتقائی مراحل طے کرنے کے باوجود ان ماقبل ارتقائی مراحل کی قوتوں کے رحم و کرم پر ہے کہ جنہیں وہ تنازع للبقاء کے عمل میں پیچھے چھوڑ آئی ہے۔ اس طرح ڈارون حیات کی آزاد روی اور تخلیقی رو کا گلہ دبا کر رکھ دیتا ہے۔ کیونکہ اقبال کے بقول: In fact all creative activity is free activity. Creation is opposed to repetition which is ■ characteristic of mechanical action. (12)

اقبال کی نظر میں مادہ درحقیقت حیات کی ادنیٰ درجے کی خودیوں کی بستی کا نام ہے۔ ان خودیوں کے مسلسل ارتباط، اتصال، عمل اور ردعمل سے باہمی یگانگت کا ایک ایسا مقام آجاتا ہے کہ جہاں سے ایک ایسی اعلیٰ درجے کی خودی کا صدور ہو کہ جو احساس و ادراک کی حامل ہو۔ اقبال لکھتے ہیں: Suffice it to indicate that even if the body takes the intiative: the mind does enter as ■ consenting factor at a definite stage in the development of motion.(13)

Marfat.com

چونکہ ابتدا میں اشیاء میں خودی کا احساس پست درجے کا ہوتا ہے اس لیے جسم پر میکانکی قوانین کی عملداری زیادہ نظر آتی ہے، تاہم خودی کے احساس و ادراک کا رجحان مسلسل ترقی پذیر رہتا ہے یہانتک کہ خودی مراحل ارتقاء طے کرتے کرتے ارتقاع کے اس درجے پر فائز ہوجاتی ہے جہاں وہ بدن اور مادے کی غلامی سے مکمل طور پر آزادی حاصل کرلیتی ہے۔ اقبال رقمطراز ہیں:

The evolution of life shows that though in the beginning, the mental is dominated by the physical, the mental as it grows in power tends to dominate the physical and may eventually rise to a position of complete indenpendence. (14)

دراصل ڈارون اس حقیقت کو نہ سمجھ سکا کہ حیات ارتقاء کے سفر میں تدریجی مراحل سے گذرتی ہوئی ہر مرحلے کی صفات و خصوصیات کو اپنے اندر سمو کر ایک نئی اور بے چگون کلیت کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ اقبال کے بقول: The movement of life as an organic growth involves a progressive synthesis of its various stages.(15)

اقبال کے خیال میں زندگی کی میکانکی نقطۂ نظر سے توضیح کرنے والے ماہرین حیاتیات کا مطالعہ و مشاہدہ حیات کی طرف ایسی ادنیٰ صور و اشکال تک محدود ہے جن کے طرزِ عمل میں کسی حد تک میکانکیت سے مشابہت ہے لیکن اگر وہ خود اپنی ذات اور اس کے اندر مچلتے ہوئے احساسات، تحریکات، جذبات اور ماضی و حال سے مستقبل کی طرف ابھار اور حرکت کے رجحان پر غور کریں تو انہیں یقیناً حیات کے میکانکی تصور سے دستبردار ہونا پڑے گا، گویا حیات کے اندر آئندہ مراحل میں جو تبدیلیاں بھی واقع ہوتی ہیں وہ اس کی اپنی آغوش سے جنم لیتی ہیں اور اس پر کوئی خارجی میکانکی جبریت اثرانداز نہیں ہوتی۔ فکر کا یہی وہ مقام ہے کہ جہاں اقبال حیات کے اندر ارتقاء کی لگن کو مقصد کے ساتھ وابستہ کرکے اسے میکانکیت کی حدود سے باہر لے آتے ہیں اور لکھتے ہیں: The action of living organisms, initiated and planned in view of an end, is totally different to causal action. (16)

اقبال ڈارون کے اس خیال سے تو متفق ہیں کہ انواع کے اندر غیر محدود طور پر بڑھنے اور اپنی نسل میں اضافہ کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے، تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ انواع کا تحرک اور کثرت آفات قدرت کو دعوت دینے کا باعث بنتا ہے۔ اقبال: اور ''غنچہ ہے اگر گل ہو، گل ہے تو گلستاں ہو'' (۱۷) اور'' بے تعمیر کن از شبنم خویش'' (۱۸) کا مشورہ دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک کائنات کا ذرہ ذرہ سوئے منزلِ دوست گامزن ہے اور ارتقاء کی منازل طے کررہا

Marfat.com

ہے۔اقبال کے ہاں ارتقاء ادنیٰ درجات حقیقت کی طرف سفر کا نام ہے اور یہ سفر خارجی عوامل کے سفا کانہ عمل سے نہیں بلکہ انواع کی اندرونی لگن اور تسلسل عمل سے انجام پاتا ہے۔ چنانچہ اقبال ڈارون کے اس خیال کو درست نہیں سمجھتے کہ آفاتِ قدرت ارتقاء کے رخ کو متعین کرنے میں کوئی کردار ادا کرتی ہیں۔ کیونکہ اگر اس نقطۂ نظر کو قبول کرلیا جائے تو مراحل ارتقاء میں حرکت و عمل اور جدوجہد کے تصور کی نفی ہوجاتی ہے اور ارتقاء کا عمل محض آفاتِ قدرت کا محتاج نظر آنے لگتا ہے۔ علاوہ ازیں، ارتقاء ایک ایسا اتفاقی اور حادثاتی عمل بن کررہ جاتا ہے جس میں نہ عضویہ کی مرضی اور خواہش کو دخل حاصل ہے اور نہ کسی لگن، مقصد اور آرزو کو۔ یوں عضویہ کے جسم میں تمام تبدیلیاں خارجی عوامل کے مرہون منت ہوکر رہ جاتی ہیں۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ ڈارون کے نظری ارتقائی دھارے کے مطابق کسی عضویہ کے لیے ارتقاء کے اگلے مرحلے میں داخل ہونے سے پہلے بڑے سکون اور صبر سے کسی ناگہانی آفت یا بلا کا انتظار اس کا مقدر ہے۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین اپنے ایک انگریزی مضمون میں لکھتے ہیں:

> Darwin is a terrible shock to man's justified conviction of his own dignity over the rest of creation, which he thinks, he enjoys by virtue of the nobility of his mind and spirit and the sanctity of his reason and free-will. For the implications of his theory are that the whole of this wonderful world of life is nothing but the blind and fortuitous play of the reckless forces of nature—this position is, of course, completely antagonistic to that of Iqbal. (19)

ڈارون کے نزدیک چونکہ ماحول ایک تغیر پذیر عامل ہے اس لیے حالات اور ماحول کے مطابق انواع کی مطابقت کی خواہش، تحول اور جدوجہد ارتقاء کا باعث ہے۔ اگرچہ یہ بات درست ہے کہ نئے حالات اور جدید تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا، زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھنا اور آئینِ نو کا ساتھ دینا افراد اور اقوام کی زندگی میں بہت اہم ہے تاہم وہی افراد اور اقوام ترقی، کامیابی اور ارتقاء حاصل کرتی ہیں جو جمود اور سکوت کا شکار رہنے کی بجائے وقت اور حالات پر گہری نظر رکھتے ہوئے اپنے آپ کو ان کے مطابق ڈھال لیتی ہیں۔ بہرحال اقبال کے نزدیک افراد اور اقوام کی کامیابی اور ارتقاء وقت اور حالات کی اندھا دھند تقلید سے ہی مشروط نہیں بلکہ ان کے ہاں بقول اکبر الٰہ آبادی:

"مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں" (۲۰)

کے فلسفے کی زیادہ اہمیت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال انسان کو مظاہر فطرت کے سامنے

Marfat.com

جھکانا نہیں چاہتا بلکہ وہ مظاہر فطرت پر انسان کے دستِ تسخیر کو قائم اور مستحکم دیکھنے کا متمنی ہے۔ قوانین فطرت کا اسیر ہونا انسان کے شایان شان نہیں بلکہ قوانین فطرت، وقت اور حالات کو اپنے دستِ تصرف میں لانا، انہیں اپنی آرزوؤں اور گہری تمناؤں کے مطابق ڈھالنا، اپنی دنیا آپ پیدا کرنا، نئی بستیاں بسانا اور راہوارِ وقت کی لگام کو ہاتھ میں لے کر اپنے آدرش کے مطابق موڑنا اور پھیرنا اصل کامیابی اور ارتقاء کی علامت ہے۔ اقبال رقمطراز ہیں:

It is the lot of man to share in the deeper aspiration of the universe around him and to shape his own destiny as well as that of the universe now by adjusting himself to its forces, now by putting the whole of his energy to mould its forces to his own ends and purposes. (21)

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد؟
گفتم کہ نمی سازد، گفتند کہ برہم زن(۲۲)

ڈارون کے برعکس اقبال کے نزدیک عالم رنگ و بو میں اپنے آپ کو کھو دینے، گم کر دینے یا محض موافقت پیدا کرنے میں ہی کمالِ حیات یا ارتقاء مضمر نہیں بلکہ باطنی امکانات کی زیادہ سے زیادہ تسخیر سے اپنے اندر ایسی قابلیت اور صلاحیت کو نشوونما دینا وہ کارنامہ ہے جس سے انسان اس ''بتخانۂ شش جہات'' پر نہ صرف غلبہ اور تسلط حاصل کر پاتا ہے بلکہ اس کی اپنی مرضی کے مطابق اس کی تراش کرتے ہوئے ارتقاء حاصل کرتا ہے:

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر(۲۳)

اقبال کے تصور ارتقاء کے اس پہلو کی بہترین تفسیر ڈاکٹر اے۔ ریہل (Dr A Riehl) کے درج ذیل اقتباس سے ہوتی ہے:

The animal can adopt its actions to the changed conditions of its envirnments and from this power of adaptation, we first have reason to conclude that it posseses intelligence. Man on the other hand, can change the conditions about him and adopt them to his mind. He knows how to call forth independently new conditions which correspond to his purpose. He creates tools for himself, and changes the external world by his work. He fills and changes the surface of his planet with the products of his industry and skill; and as his practical understanding shows its superiority to mere adaptation by its power of initiative, his theoretical

Marfat.com

understanding shows itssuperiority by its power to arrange the perceptions it recevies, according to the concepts of his throught. (24)

اس میں شک نہیں کہ اقبال نے مذہب، فلسفہ، سیاست اور سائنس، ہر میدان میں حکمائے مغرب کی فکر و نظر کا گہرا مطالعہ کیا اور جہاں جو خوبی نظر آئی اسے قبول کیا، تاہم انہوں نے یکسر مادی اور الحادی نظریات پر بھرپور تنقید بھی کی اور انہیں انسانیت کے لیے گمراہ کن قرار دیا۔ اقبال اور ڈارون کا بنیادی فرق یہ ہے کہ اقبال کے فکر کی اساس دینی و روحانی ہے جبکہ ڈارون کی مادی و عنصری فکری روش اس روحانی سہارے سے محروم ہے۔ اقبال کا تصور ارتقاء مغربی طرزِ فکر کی غلامانہ پیروی کا ماحصل نہیں۔ وہ ارتقاء کے ضرور قائل ہیں اور اس لحاظ سے وہ ڈارون کے ہمنوا بھی نظر آتے ہیں تاہم انہیں ارتقاء کا وہی تصور دلپذیر ہے جس کی تعلیم قرآن پاک دیتا ہے۔

حواشی و حوالہ جات

1- Charles, Darwin, *The Origin of Species, by Means of Natural Selection*, William Benton Publishers, Chicago: 1987, p.80

2-Paul, Edwards,et. al., *The Encyclopaedia of Philosphy*, Collier MacMillan Publishers, London, 1972, Vol. 3-4.p. 297

۳۔ ڈارون نے انتخابِ طبعی (Natural Selection) کا یہ تصور مالتھس (Robert Malthus) کے نظریہ آبادی سے لیا اور اسے حیوانات کی دنیا پر چسپاں کر دیا۔

4- Charles, Darwin, *The Origin of Species*, p.33

۵۔ ایضاً

۶۔ ہیرلڈ ہولڈنگ، تاریخ فلسفہ جدید، ترجمہ از خلیفہ عبدالحکیم، نفیس اکیڈمی، کراچی: ۱۹۸۷ء، جلد دوم، ص ۵۳۱

۷۔ اقبال نے اسرارِ خودی میں ارتقائے خودی کے تین مراحل بیان کیے، مرحلہ اول، اطاعت، مرحلہ دوم، ضبطِ نفس اور مرحلہ سوم نیابتِ الٰہی۔

۸۔ اقبالنامہ، شیخ محمد اشرف، لاہور، سن ندارد، حصہ اول، ص ۴۵۹

۹۔ سی، ایم، جوڈ، افکارِ حاضرہ، ترجمہ از محمد بن علی با وہاب، مجلس ترقی ادب، لاہور: ۱۹۶۶ء، ص ۳۵

10-Muhammad Iqbal, *The Reconstruction of Religious Thought In Islam*, Sh. Muhammad Ashraf, Lahore; 1965. p 41

۱۱۔ ایضاً

Marfat.com

۱۲۔ایضاً

13-Muhammad Iqbal, *The Secrets of the Self,* Translated by Reynold A. Nicholson, Sh. Muhammad Ashraf, Lahore, 1975, p. xix

14-Muhammad Iqbal, *The Reconstruction*, p. 106

۱۵۔ایضاً، ص ۵۶

۱۶۔ایضاً، ص ۴۳

۱۷۔بانگ درا، ص ۲۸۰

۱۸۔پیامِ مشرق، ص ۲۶

19-Muhammad Rafiuddin, "Iqbal's Conecpt of Evolution", *Iqbal Review,* Vol. 1 No.1, April 1960, p 39

۲۰۔اکبر الہ آبادی، کلیات اکبر، پنجاب پبلشرز، کراچی، سن ندارد، ص ۳۸

21-Muhammad Iqbal, *The Reconstruction*, p .12

۲۲۔زبورِ عجم، ص ۷۵

۲۳۔ضربِ کلیم، ص ۴۱

24-A. Riehl, *An Intrduction to the Theory of Science and Metaphysics* Regan Paul, Trench, Trubner, London, 1984, pp. 75-76

☆☆☆

Marfat.com

بیدل و اقبال

ایک تقابلی جائزہ

محمد شاہ ضعیف☆

مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی ثم الدھلوی کمیت و کیفیت کے اعتبار سے عظیم مصنف اور سبک ہندی کے بلند مرتبہ شاعر تھے۔ مضمون آفرینی، باریک خیالی، رفعت اندیشہ اور عرفانی حقایق کے بیان کرنے میں وہ منفرد تھے۔ ان کا مزاج عارفانہ اور فلسفیانہ تھا۔ انہوں نے شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی بعض فتوحات اور حکمت عملیوں کو سراہا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کسی کی تعریف کی اور نہ مذمت۔ وہ ایک مدت تک اپنے مولد پٹنہ (عظیم آباد) میں زندگی گذارنے کے بعد دہلی آگئے اور بالآخر یہیں پیوند خاک ہوئے۔

وہ بچپن ہی میں سایۂ پدری سے محروم ہوگئے اور ان کی پرورش ان کے عم محترم مرزا قلندر نے کی۔ مرزا قلندر بڑی بلند سیرت کے مالک تھے۔ امّی محض تھے مگر بزرگوں کی صحبت میں حاضر ہونے کا بڑا شوق تھا۔ روحانیت کی لگن دل میں رکھتے تھے۔ اولیاء اللہ کی مبارک سیرت کے بڑے دل دادہ تھے۔ اس لیے انہوں نے سوچا کہ کجا ارباب طریقت کی پاکیزہ مشربی اور کجا عام معلموں کی سفلہ مزاجی لہٰذا بیدل کو عربی علوم کے ان اساتذہ کے زیر سایہ نہیں رہنے دینا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بھتیجے کو مکتب سے اٹھا لیا۔ مرزا قلندر کا یہ فیصلہ بہت ہی دور بینی کا نتیجہ تھا۔ بیدل کی مکتب کی تعلیم ختم ہوگئی، عربی علوم کے دروازے ان پر بند ہوگئے اور علمائے ظاہر کے متعلق ان کے دل میں مستقل نفرت پیدا ہوگئی۔ اعلیٰ انسانی اقدار اور اخلاق عالیہ کا رجحان پیدا ہوا اور روحانیت ان کا مطمح نظر بن گئی۔

بیدل ۱۰۵۴ھ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت کے ایک صوفی منش درویش مرزا ابوالقاسم ترمذی نے ازروئے حساب ان کی تاریخ پیدائش "فیض قدس" اور "انتخاب" کے الفاظ سے

☆ شعبۂ فارسی، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

Marfat.com

نکالی تھی۔ ان کے چچا کے علاوہ باقی گھر والے بھی ان کے شاندار مستقبل کے متعلق بڑے پُرامید تھے۔ تمام کا خیال تھا کہ بیدل ایسا انتخاب روزگار انسان بنے گا جو اپنی گونا گوں صفات کی بنا پر تمام جہاں میں مشہور ہوگا۔ مرزا بیدل کو قدرتی طور پر دم کرنے اور تعویذ لکھنے کا شوق ہوگیا تھا۔ ابھی وہ بہت چھوٹے تھے کہ بیماروں اور پریشان حال لوگوں کو دم کرتے اور اپنے گلے کا تعویذ ان کے گلے میں ڈال دیا کرتے۔ دھیرے دھیرے تعویذ گنڈوں سے دلچسپی بڑھتی چلی گئی اور ایک واقعے کی بنا پر یہ دلچسپی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ مرزا بیدل سلسلہ قادریہ سے منسلک تھے۔ قادری سلسلہ کے ایک پابند شرع بزرگ مولانا کمال نے مرزا قلندر کو ایک اسم بتایا، جسے پڑھ کر ہاتھ کے انگوٹھے پر پھونکنے سے آسیب کی تکلیف دور ہوجاتی تھی۔ بیدل نے وہ اسم سن کر اپنے ذہن میں محفوظ کرلیا۔ ایک روز وہ اپنے ہمجولیوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ محلے کی ایک عورت کو یہی تکلیف ہوگئی۔کئی تدبیریں اختیار کی گئیں مگر اس کی طبیعت بحال نہ ہوئی۔ کھیلتے کھیلتے بیدل نے سوچا، مولانا کی مبارک زبان سے سنا ہوا اسم آج آزمایا جائے۔چنانچہ انہوں نے پڑھ کر پھونکا تو عورت کی تکلیف فوراً دور ہوگئی۔ مولانا کمال کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو بڑے خوش ہوئے اور بیدل کو عملیات اور تعویذات کی اپنی خاص بیاض عطا فرمائی۔ اس واقعہ سے باطنی اثرات کے متعلق بیدل کا اعتقاد اور بھی پختہ ہوگیا۔ ان کے والد مرحوم مرزا عبدالخالق بھی بڑے بزرگ تھے۔

مرزا بیدل عظیم آبادی نے اساتذہ کا کلام بدقت نظر پڑھا۔ ان ایام میں وہ رمزی تخلص کرتے تھے۔ شاید اس بنا پر کہ انہیں گمان تھا کہ ان کا سینہ رموز و نکات کا خزینہ ہے اور ان کے منہ سے نکلے ہوئے اشعار اس خزینے کے گرانمایہ جواہر پارے ہیں۔ اس تخلص کے ساتھ انہوں نے بڑے اشعار کہے جو کبھی کبھی وہ اپنے مذکورہ بالاشفیق بزرگ مولانا کمال کو بھی دکھا لیا کرتے تھے۔ مولانا ہمیشہ ان کی تعریف کرتے۔اس کے باوجود بیدل نے اپنے اشعار کو محفوظ نہ رکھا۔ مولانا اسم با مسمّٰی تھے۔ وہ شعر و سخن کے ساتھ ساتھ باطنی طور پر بھی بیدل کی تربیت کی طرف متوجہ تھے۔ اس لیے بیدل کا سوز دروں بھی ترقی پذیر تھا اور عشق الٰہی بھی طبع میں حرارت پیدا کررہا تھا۔ ایک روز گلستان سعدی کا دیباچہ پڑھنے سے طبیعت پر خاص کیفیت طاری ہوگئی، حال وارد ہوگیا۔

گر کسی وصفِ او ز من پرسد
بیدل از بی نشان چہ گوید باز

خداوند تعالیٰ کی عظمت و کبریائی اور محبت کے متعلق دل میں جو احساسات اور جذبات پرورش پا

Marfat.com

رہے تھے، یک لخت اُبل پڑے۔ دیر تک بے حال رہے۔ زبان پر بار بار یہ مصرع آتا تھا:

بیدل از بی نشان چہ گوید باز

مرزا عبدالقادر بیدل دہلوی بنیادی طور پر درویش منش واقع ہوئے تھے۔ صوم وصلوۃ کے پابند تھے۔ دہلی میں صرف بھنے ہوئے چنے افطاری کے وقت استعمال کرتے تھے اور اکبر آباد میں پسا ہوا کتیرہ استعمال کیا کرتے تھے اور جب وہ ختم ہوا تو فاقوں کی نوبت آئی مگر گداگری مسلک فقر کے خلاف تھی، اس لیے متوکل رہے۔ حتیٰ کہ خداوند کریم نے اپنی قدرتِ کاملہ سے مایحتاج کا خودبخود انتظام فرما دیا۔ صوفیۂ کرام کا مشہور مقولہ ہے کہ ''المشاہدات مواریث المجاہدات''۔ انہی ایام میں مرزا بیدل کو عجیب و غریب مشاہدات، مکاشفات اور رؤیائے صالحہ کا اتفاق ہوا۔ علاوہ ازیں انہی ایام میں ایک رات وہ دہلی کے بازاروں میں گشت کرنے کے بعد واپس آرہے تھے کہ انہوں نے ہوا میں پرواز شروع کردی۔ ٹھہرتے تو زمین پر ہوتے، چلتے تو از خود پرواز شروع ہوجاتی اور ایک نواب صاحب کے محل کے قریب تو وہ ہوا میں اتنی بلندی پر جا پہنچے کہ صحن خانہ میں ایک پردہ دار خاتون کو شمع کی لو میں کپڑے سیتے بھی دیکھا۔

مرزا بیدل روحانی لحاظ سے بڑی ترقی کرنے لگے۔ آمد شباب پر جس طرح یک لخت قد بڑھتا ہے اور کیفیات دگرگوں ہوجاتی ہے یہی حالت بیدل کے روحانی ارتقاء کی تھی۔ جوانی ہی میں ان کے فقر کا شباب شروع ہوگیا اور پھر پختگی پیدا ہونے سے پہلے آٹھ دس سال تک ان کی زندگی بڑی طوفانی کیفیتوں کی حامل رہی۔ عالم جمادات، عالم حیوانات اور عالم نباتات میں سے ہر ایک کی استعداد مرئی طور پر نگاہوں کے سامنے آئی اور حقیقتِ انسان واضح ہوئی۔ اس نظارے کے دوران میں انہوں نے حضور ختمی مرسلتؐ کی ذات مبارک کو برسر بالیں دیکھا۔ بیدل کا سر حضور اکرمؐ کے زانوئے مبارک پر تھا اور آنجنابؐ کے سایۂ عاطفت میں تمام حقائق و رموز وا ہو رہے تھے۔ جب بیدل نے اپنے آپ کو دیکھا تو چاہا کہ اپنا سر حضورؐ کے زانوئے مبارک سے اٹھا لے لیکن وفور شرم و حیا کے باعث ایسا نہ کرسکا۔ کچھ دیر بعد پردۂ مثال پر ایک اور نظارہ دیکھا۔ بساط کبریا پر جناب ولایت مآب علی المرتضیٰ متمکن تھے۔ آپؓ کی ہیبت سے بیدل کا بند بند کانپنے لگا۔ اس موقع کی کیفیات کے زیر اثر بیدل نے مندرجہ ذیل نعت لکھی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیدل کے دل میں جناب سرور کائناتؐ سے نہایت درجے کی محبت وعقیدت پائی جاتی تھی:

Marfat.com

رونق این ہفت محفل از چراغش پرتوی
جوش این نہ بحر اخضر رشحہ ای از جوی اوست
از من بیدل چہ امکان داشت فہم راز غیب
شد یقینم کاین اشارت از خم ابروی اوست

''حقیقت محمدیہ ہمہ وقت سایہ افگن احوال تست و باطن نبوت ہیچ گاہ دامن تربیت از سرت بر نمی گیرد ہر چند آداب ظاہر از تو بجا نمی آید''۔ اپنے خواب کی تعبیر سن کر بیدل اس قدر مسرور ہوئے کہ فرط مسرت سے آنکھ کھل گئی۔ اس خواب کی عظمت اور اہمیت اظہر من الشمس ہے۔

علامہ اقبال کے دل میں بھی جناب سرور کائناتؐ سے انتہا درجے کی محبت اور عقیدت پائی جاتی تھی۔

خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

اقبال فرماتے ہیں کہ حضرت محمد مصطفیٰؐ ایک بحر ذخار کی مانند ہیں جس کی موجیں آسمان کو چھوتی ہیں۔ تم بھی اسی سمندر سے سیرابی حاصل کرو، تاکہ تمہیں حیات نو نصیب ہو، اور تمہاری وہ بھولی بسری کیفیات جنہیں مادی دنیا نے تم سے چھین لیا ہے، از سرنو تم کو میسر آجائیں:

می ندانی عشق و مستی از کجاست؟
این شعاع آفتاب مصطفیٰ ست
خاک یثرب از دو عالم خوشتر است
ای خنک شہری کہ آنجا دلبر است

اقبال کے نزدیک عشق اس وقت تک بے معنی ہے جب تک محبوب کا اتباع نہ کیا جائے۔ عشق میں محبوب کے عادات و خصائل، افعال و اقوال، رفتار و گفتار، عادات و اطوار، اخلاق و آداب، پسند و ناپسند کو اپنے لیے نمونہ بنانا اور تقلید و اتباع کا اہتمام کرنا ازبس لازم ہے۔

مرزا عبدالقادر بیدل دہلوی اپنے پاس ایک عصا بھی رکھتے تھے اس عصا کا نام ''شاخ نازک'' تھا۔ اس کا وزن ۳۵ سیر شاہجہانی تھا۔ عصا کے متعلق کہتے:'' سنت الانبیاء زینت الصلحاء، مونس الاعمیٰ، ممد الضعفاء و دافع الاعداء''۔ بیدل کی فکریات سے علامہ اقبال کی شیفتگی کا ایک ثبوت پروفیسر حمید احمد خان کے اس مضمون سے ملتا ہے جس میں انہوں نے علامہ اقبال سے روایت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے ایک زمانے میں کلام بیدل کا

Marfat.com

انتخاب کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ ۱۹۲۶ء میں علامہ اقبال نے بی اے کے فارسی کورس میں نکات بیدل سے کچھ حصہ انتخاب کر کے شامل کیا۔ علامہ اقبال ان دنوں یونیورسٹی کے فارسی بورڈ کے ممبر تھے۔ اس انتخاب سے جہاں ایک طرف بیدل کی حکیمانہ نظر، نکتہ آفرینی اور نادرہ کاری کا اندازہ ہوتا ہے وہیں علامہ اقبال اور مرزا بیدل کی فکریات کی مماثلات بھی کسی قدر واضح ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی بیدل شناسی کا اظہار کہیں تو بیدل کے ان اشعار سے ہوتا ہے جنہیں وہ تضمین کرتے ہیں اور کہیں ان کے بعض اشعار کی فکر افروز تشریحات سے، کہیں اقبال کشن پرشاد شاد کو دیوان بیدل ایڈٹ کرنے کی ترغیب دیتے نظر آتے ہیں اور کہیں غالب اور بیدل کے تصوف کا مقابلہ کر کے اول الذکر کے تصوف کو سکونی اور مؤخرالذکر کے تصوف کو متحرک قرار دیتے ہیں۔ صرف نثر ہی میں نہیں اقبال نے اپنی شاعری میں بھی بیدل دہلوی کا دو موقعوں پر ذکر کیا ہے۔ بانگ درا میں ''مذہب'' کے عنوان سے شامل نظم میں اقبال بیدل کو مرشدِ کامل قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ علوم جدید کی بنیاد محسوس پر ہے جبکہ بیدل کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ:

با ہر کمال اندکی آشفتگی خوش است
ہر چند عقل کل شدۂ بی جنون مباش

اقبال نے مذکورہ بالا شعر بیدل کی تضمین کر کے اپنے فلسفۂ زندگی کی بخوبی وضاحت کر دی ہے۔ ضرب کلیم میں ''مرزا بیدل'' کے زیر عنوان اپنی نظم میں اقبال نے کائنات کی ماہیت کے مسئلے کو سلجھانا چاہا ہے اور بیدل ہی کے ایک شعر کی تضمین کرتے ہوتے بتایا ہے کہ یہ شعر اس حیرت کدے کا دروازہ بہت خوبی سے کھولتا ہے:

دل اگر می داشت وسعت بی نشان بود این چمن
رنگ می بیرون نشست از بسکہ مینا تنگ بود
ہے حقیقت یا مری چشم غلط بیں کا فساد
یہ زمیں، یہ دشت، یہ کہسار یہ چرخ کبود
کوئی کہتا ہے نہیں ہے، کوئی کہتا ہے کہ ہے
کیا خبر، ہے یا نہیں ہے، تیری دنیا کا وجود
میرزا بیدل نے کس خوبی سے کھولی یہ گرہ
اہل حکمت پر بہت مشکل رہی جس کی کشود

مرزا بیدل اور اقبال کا حق اور حقیقت کے بارے میں نقطۂ نظر بہت مماثل ہے۔

Marfat.com

بحیثیت مجموعی اقبال بیدل کی نفس انسانی میں گہری بصیرت کے بے حد مداح نظر آتے ہیں۔ پھر دونوں عظیم شعراء وجدان ہی کو وہ معیار اور وسیلہ قرار دیتے ہیں جس کی مدد سے کائنات کی تفہیم ممکن ہے۔دونوں کا موقف یہ ہے کہ مجرد اور نری کھری عقل پرستی سے کام نہیں چلتا۔ دونوں عظمت انسان کے قائل ہیں اور دونوں کی نظر وجود انسانی میں موجود ان بے پناہ امکانات پر ہے جن کے بل پر فطرت کی قوتوں کو تسخیر کیا جاتا ہے اور اعلیٰ ترین مراتب پر فائز ہوا جاسکتا ہے۔ بیدل متعدد استعاروں، تشبیہوں اور علامتوں کی مدد سے اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں۔ کہیں وہ عظمت انسانی کا علم بلند کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کوہ سینا نے بھی اپنا نور اسی جگنو سے مستعار لیا ہے اور کہیں وہ انسان کو ترغیب دیتے ہیں کہ وہ اپنے قلب کے حجابات دور کرے تاکہ خزانۂ ازلی تک اس کی رسائی ہوسکے۔ ذیل کے چند شعر دیکھیے جو بیدل کے تصور حیات اور تصور انسان کی بخوبی وضاحت کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ بیدل کے حرکی تصور حیات میں ان کے نسلی خصائص کا بھی بڑا دخل ہے:

بیدل:
برون دل نتوان یافت ہرچہ خواہی یافت
کدام گنج کہ در خانۂ خراب تو نیست

اقبال:
عالم سوز ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو، ہجر میں لذت طلب

بیدل:
ہر دو عالم خاک شد تا بست نقش آدمی
ای بہار نیستی از قدر خود ہشیار باش

اقبال:
آشنا اپنی حقیقت سے ہو، اے دہقان ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

ان اشعار کے مطالعے سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اقبال اور بیدل کے بعض اشعار میں کس قدر گہری معنوی اور اسلوبی مماثلت اور ان کے الفاظ و تراکیب میں کس قدر اشتراک پایا جاتا ہے۔ اقبال کے ہاں ''قافلۂ رنگ و بو'' ،''آئینہ دار ہستی'' اور '' فیض شعور'' جیسی تراکیب نظر آتی ہیں جن پر بیدل کی ایجاد طراز طبیعت و منفرد اسلوب کا رنگ صاف دیکھا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالغنی نے اپنی کتاب *Life and Works of Abdul Qadir Bedil* میں ایسی تراکیب کی ایک طویل فہرست نقل کی ہے۔

اقبال اور بیدل دونوں تصوف کی ان صورتوں کو افراد ملت کے لیے خطرناک تصور

Marfat.com

کرتے تھے جنھوں نے شریعت کی تکالیف اور تقاضوں کو پسِ پشت ڈال کر ایسی طریقت کا جواز مہیا کردیا تھا جو ایک طرف بہانۂ بے عملی ثابت ہوئی اور دوسری جانب دسیوں ایسی بدعات کا باعث بنیں جو روح اسلام کے منافی تھیں۔ اقبال نے متعدد مقامات پر ایسے تصوف کو عجمی تصوف کا نام دیا ہے اور اس کے منفی اثرات کا تصوف پر اپنی مختصر کتاب کے علاوہ اپنے مضامین، خطوط اور دیباچۂ اسرار خودی میں مفصل جائزہ لیا ہے۔ جہاں تک بیدل کا تعلق ہے وہ بھی اس قسم کے تصوف کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں:

در مزاج خلق بیکاری ہوس می پرورد
غافلان نام فضولی را تصوف کردہ اند

بیدل کے سلسلے میں جو چیز زیادہ قابل اعتنا ہے وہ ہے ان کا اعلی درجے کا کثیر الجہات ذہن جو دنیا کے تقریباً تمام عظیم مفکروں کے روحانی تجربات سے گذرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان مفکرین میں برگساں بھی شامل ہے۔ البتہ بیدل کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ کسی ایسے شاعر سے مابعدالطبیعات کے ایک مرتب اور منضبط نظام کی توقع نہیں کی جاسکتی جس کے بے چین ذہن کو ترتیب و تہذیب کے تکلیف دہ عمل میں پڑے بغیر ایک گریزپا حقیقت کے بے انتہا پہلوؤں سے صرف نظر کرنے کے سوا چارہ نہیں۔ بیدل کے یہاں ان کے دیگر خیالات و نظریات کے ساتھ ساتھ ایک تصور وہ بھی ہے جسے برگساں کا تصور حقیقت کہنا چاہیے اور جس کا تجزیہ اقبال اور بیدل اپنی روحانی ترقی کے مراحل میں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

اقبال، بیدل کے بے حد مداح تھے۔ وہ انھیں مرشد کامل کہتے ہیں اور انھیں اپنے کلام نظم و نثر میں بڑی عقیدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ بیدل اور غالب دہلوی کے فکر وفن کے روابط پر تحقیق کرنے سے بھی انھیں بغایت دلچسپی تھی۔ بیدل کے کلام کی تضمین بھی فرمائی اور پیروی بھی کی۔ بیدل معاصرین سے لے کر عصر حاضر کے اردو و فارسی شعرائے برصغیر کے لیے باعث توجہ رہے مگر اس ضمن میں غالب کے بعد اقبال دوسروں سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ اقبال کے بقول بیدل اپنی روش کے موجد اور خاتم تھے۔ اس لیے اقبال نے بیدل کی تقلید میں اپنی توانائی صرف نہیں کی، اور نہ بیدل کی مداحی کے باوجود، ان کی مشکل پسندی کی روش اختیار کی۔ بیدل کے موضوعات بحث میں سے اقبال کو حیرت، خودداری، جنون (عشق)، وسعت قلب اور بے نیازی خاص طور پر عزیز تھے۔

بیدل کی کئی پسندیدہ تراکیب اور لفظیات جیسے حیرت، آئینہ، شمع، ازخود رمیدہ، عشق

Marfat.com

غیور، بانگ درا، مزرع تسلیم، الطاف عمیم، برق، برق تجلی، ذوق نمود، ذوق تبسم، لطف خرام، اور توسن ادراک اور قافلۂ رنگ و بو وغیرہ اقبال کے ہاں فراوانی سے موجود ہیں۔

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ
آزادی و یک رنگی اے ہمت مردانہ
یا حیرت فارابی یا تاب و تب رومی
یا نعرۂ مستانہ، کعبہ ہو کہ بت خانہ

بیدل کے ہاں حیرت کا نمونہ:

خیالش بر نمی تابد شعور ای بی خودی جوشی
نمی گنجد بدیدن جلوہ اش ای حیرت آغوشی

افلاطون کے ہاں حیرت کی یہ اہمیت ہے کہ اس کے ذریعے ہمیں فطرت سے ہمکلامی کرنے کا موقع ملتا ہے۔ بیدل کے ہاں حیرت کی اہمیت ماورائے وارداتِ عقل ہے اور اس ضمن میں مرزا بیدل سے زیادہ خوبصورت انداز اختیار کرنا ناممکن ہے۔آخری عمر میں اقبال نے حیرت کے بجائے "یقین" پر لکھا ہے جو تصور اولیہ ہی کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ بہرصورت، بیدل کا تحیر و حیرت، تفکر فی الانفس والآفاق کا مظہر ہے۔پیام مشرق کی ایک غزل کو ہی دیکھ لیجیے جس کا مطلع یوں ہے:

سوز سخن ز نالۂ مستانۂ دل است
این شمع را فروغ ز پروانۂ دل است

یہ مرزا بیدل کا بھی پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ ان کا ایک معروف شعر ہے

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو و سمن درآ
کہ تو ز غنچہ کم ندمیدہ ای درِ دل کشا بہ چمن درآ

اقبال نے ضرب کلیم میں "مرزا بیدل" عنوان کے ایک قطعہ میں جو شعر تضمین کیا ہے وہ انسان کے عالم اکبر ہونے کا مظہر ہے جس کے مقابلے میں یہ کائنات عالم اصغر ہے۔ اقبال نے بھی کہا ہے:

آنچہ در عالم نگنجد آدم است
آنچہ در آدم بگنجد، عالم است

Marfat.com

ایک قطعہ دیکھیں:

ہے حقیقت یا مری چشم غلط بیں کا فساد
یہ زمیں، یہ دشت، یہ کہسار، یہ چرخ کبود
کوئی کہتا ہے نہیں ہے، کوئی کہتا ہے کہ ہے
کیا خبر، ہے یا نہیں ہے تیری دنیا کا وجود
مرزا بیدل نے کس خوبی سے کھولی یہ گرہ
اہل حکمت پر بہت مشکل رہی جس کی کشود

علامہ محمد اقبال کا مطالعہ کرتے وقت ایسا نظر آتا ہے کہ انہوں نے بیدل سے بعض مضامین اخذ کیے اور اپنے اردو یا فارسی اشعار میں بانداز دیگر بیان کیے ہیں، مثلاً:

بیدل:
دانا نبود از ہنر خویش برومند
از میوۂ خود بہرہ محال است شجر را

اقبال:
آہ بدقسمت رہے، آواز حق سے بے خبر
غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر

بیدل:
بر طبع ضعیفان ز حوادث المی نیست
خاشاک کند کشتی خود موج خطر را

اقبال:
سفینہ برگ گل بنالے گا، قافلہ مور ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہوگا

بیدل:
چہ لازم با خرد ہمخانہ بودن
دو روزی می توان دیوانہ بودن

اقبال:
اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

بیدل:
پشت و روی صفحۂ ادراک تست اسلام و کفر
سطر قرآن را ز کم بینی چلیپا کردۂ
حسن مطلق را مقید تا کجا خواہی شناخت
آہ ازان یوسف کہ در چاہش تماشا کردۂ

اقبال:
زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے
غضب ہے سطر قرآں کو چلیپا کردیا تو نے

Marfat.com

کنوئیں میں تو نے یوسف کو جو دیکھا بھی تو کیا دیکھا
ارے غافل جو مطلق تھا، مقید کردیا تو نے

مجنوں گورکھپوری بیدل کو ایک بہت بڑا دانشور، معلم اخلاق اور دانائے راز سمجھتے تھے جو زندگی کی اصلیت اور اخلاق و تمدن کی اہمیت سے واقف تھا۔ ان کے بقول اگلے زمانے کے فارسی زبان کے شاعروں میں بیدل سے بڑا حکیم اور مفکر مشکل ہی سے ملے گا۔ اندرونی جذبات اور احساسات کو بیان کرنے کے لیے مختلف قسم کے پیرائے استعمال کرتا تھا جو غیر مانوس ہوتے ہوئے بھی جمیل اور دل کش معلوم ہوتے تھے، مثلاً:

رمیدی از دیدہ بی تأمل، گذشتی آخر بصد تغافل
اگر ندیدی تپیدن دل، شنیدنی داشت نالۂ ما

مجنون گورکھپوری یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ بیدل واقعی محیط بے ساحل ہے۔ اس کی کائنات فکر کا رقبہ لا محدود ہے۔ دنیا اور انسان کی خلقت کے راز، انسان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور مسئلوں میں کون سا پہلو یا مسئلہ ہے جس پر بیدل نے غور و فکر نہ کیا ہو اور جس کے متعلق اس کے ہاں ہدایتی اشارے نہ ملتے ہوں۔ حکمت و فلسفہ، اخلاق و معاشرت، مذہب و معرفت، کیا ہے جو بیدل کے کلیات نظم و نثر میں نہ ہو اور جس میں بیدل ہمارے لیے ایک مجتہد کی حیثیت نہ رکھتا ہو۔ مضامین اور اسالیب میں ہمارے لیے بیدل کے ہاں جیسا لامتناہی تنوع ہے اس کی مثال فارسی یا اردو کے کسی دوسرے شاعر یا نثرنگار کے ہاں نہیں ملتی۔ اسی عظمت اور تنوع کے سبب ہم عصر یا بعد کے لوگ بیدل سے حقیقی معنوں میں آشنا نہ ہو سکے۔ وہ اپنی شخصیت، اپنے فکر واحساس اور اپنے اسلوب و انداز کے اعتبار سے ایک مجتہد تھا۔ دنیا کی اس تنگ نارسائی اور اپنے بلند مقام کا اسے احساس تھا:

در جستجوی ما نکشی زحمت سراغ
جائی رسیدہ ایم کہ عنقا نمی رسد

خواجہ عبدالرشید رموز و تصوف سے متعلق اپنی تصنیف *معارف النفس* میں لکھتے ہیں کہ علامہ محمد اقبال سے پہلے دنیائے اسلام نے ہندوستان میں تین مفکر پیدا کیے: حضرت مجدد الف ثانیؒ، مرزا عبدالقادر بیدل دہلویؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ۔ بیدل دہلویؒ کے متعلق خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ تصوف کی دنیا میں ان کا مقام بہت بلند ہے اور جو رموز و نکات اس کے ہاں موجود ہیں مغرب ابھی تک ان کی تہہ تک نہیں پہنچ سکا۔ روحانی دنیا پر بیدل کی گرفت بڑی پختہ اور تجربہ کارانہ ہے۔ وجودیت اور روحانیت کی تعلیم جو اس کے ہاں موجود ہے وہ

Marfat.com

دانایان مغرب کے ہاں ناپید ہے۔ بیدل ہی تھا جس نے پہلے دل کو آئینۂ تمثال بڑے پیار سے پکارا تھا۔ وہ تمام کائنات کو کلمات تصور کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ کلمات حروف سے تخلیق کیے گئے ہیں جو کتاب کائنات میں مصور ہیں اور یہ مصور حروف اشیاء کی صورتیں ہیں جو ہم دیکھتے ہیں اور سنتے ہیں اور اسی آئینۂ تمثال کے توسط سے ہم ان کا ادراک کرتے ہیں۔ خواجہ صاحب رقمطراز ہیں کہ بیدل کا کلام بڑا سنگین اور مشکل ہے، تاہم جہاں جہاں اور جب کبھی کسی جگہ پر معانی کی جھلک پڑتی ہے تو ذہن کے کئی ایک تاریک خانے منور ہوجاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ بیدل کے ہاں ہمیں وہ سب کچھ ملتا ہے جس کی تلاش ہم مغربی فلسفہ اور روحانیت میں کرتے ہیں۔ بیدل جمال شعور اور حقیقت و مجاز کے متعلق بھی بعض نکتے بڑی خوبی سے بیان کرتا ہے۔

علامہ اقبال کی طرح بیدل کے اشعار میں بھی ملت اسلامیہ کا درد، احترام و عظمت انسانی کے افکار، اجتماعی شعور اور خودشناسی کے تصورات پائے جاتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مرزا بیدل بھی علامہ اقبال کی طرح ملوکیت کے خلاف تھے۔ اقبال مرزا بیدل کے مداح بھی تھے اور ان کے فکر وفن سے متاثر بھی۔ بیدل اور اقبال دونوں عظیم، منفرد، صوفی منش، درویش اور اعلیٰ کردار کے مالک تھے۔ دونوں قلندرانہ نظریہ اور رویہ رکھتے تھے۔ اقبال کی طرح بیدل بھی زندگی کے بارے میں حرکی نظریہ رکھتے ہیں اور ان کے ہاں بھی اقبال کی طرح زندگی کی اعلیٰ اقدار کا شعور ملتا ہے۔ وہ اقبال کی طرح آرزو، بلند ہمتی اور سعی و کوشش کو اعلیٰ زندگی کی اساس سمجھتے ہیں۔ دونوں کا نظریہ متصوفانہ ہے۔

بیدل اور اقبال میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ بیدل کے ہاں متفکرانہ حیرت اور اقبال کے ہاں حکیمانہ اور مصلحانہ یقین ہے۔ بیدل کے ہاں مستی اور تحیر کی سی کیفیت ہے۔ یہ شاعر خدا مست، خدا کے جلال و جمال کے مناظر جو کائنات میں ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں، دیکھتا ہے، غور کرتا ہے اور مسرور و متحیر ہوتا ہے۔ تحیر کا عنصر بیدل کے کلام میں ان کے جذب و مستی کی کیفیت کا بھی آئینہ دار ہے اور ان کے عارفانہ فہم کا عکاس بھی۔ بیدل کی نظر میں تو پتھر میں بھی دل دھڑک رہا ہے۔ یہ بھی ایک مینا خانۂ دل ہے۔ اسے بھی ذرا آہستہ ہاتھ لگائیے:

ذرہ تا خورشید عرفان جلوہ است اما چہ سود
دیدہ ھای خلق بر غفلت نگاہ افتادہ است

مرزا بیدل خدا مست تھے۔ اس لیے ان کی غزلوں میں حمد حق کے فکر انگیز اور ایمان افروز مطالب بہت زیادہ ہیں اور اس عنوان سے بھی وہ فارسی کے بے مثال شاعر ہیں۔ اسی

Marfat.com

عشق حق کا ایک اثر انسان دوستی کا وہ شدید جذبہ ہے جو ان کے کلام میں بہت نمایاں ہے جبکہ ملی جذبہ اور درد اقبال کے کلام پر چھایا ہوا ہے۔ اقبال کے ہاں ایک مصلحانہ اضطراب اور حکیمانہ پیچ و تاب کی کیفیت ہے جبکہ بیدل کے ہاں عارفانہ سکون و تمکین کا احساس ہوتا ہے۔ اقبال اور بیدل بلاشبہ بڑے شاعر اور صوفی منش درویش تھے۔

مآخذ

۱۔ علامہ محمد اقبال، ضرب کلیم، اردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور

۲۔ کلیات بیدل، مرتبہ خلیل اللہ خلیلی، افغانستان

۳۔ کلیات بیدل و دیوان، دہلی

۴۔ کلیاتِ اقبال، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور

۵۔ دانشنامۂ ادب فارسی (ادب فارسی در شبہ قارہ) مرتبہ حسن انوشہ، بخش دوم، تہران

۶۔ لغت نامۂ دھخدا، تہران

۷۔ فرہنگ معین، تہران

۸۔ دائرۂ معارف مشاھیر جھان، مرتبہ سروش قربانی، تہران

۹۔ دائرۂ معارف فارسی، انجمن دائرہ معارف افغانستان، کابل

۱۰۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، زیر اہتمام دانشگاہ پنجاب، لاہور

۱۱۔ دل بیدل، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، مجلس تحقیق و تالیف فارسی، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

۱۲۔ مطالعۂ بیدل، فکر برگساں کی روشنی میں، از علامہ محمد اقبال، ترتیب و ترجمہ ڈاکٹر تحسین فراقی، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور

۱۳۔ روح بیدل از ڈاکٹر عبدالغنی، مجلس ترقی ادب کلب روڈ، لاہور

۱۴۔ اقبال اور فارسی شعراء از ڈاکٹر محمد ریاض، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور

۱۵۔ بیدل از خواجہ عبداللہ اختر، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور

۱۶۔ شاعر آئینہ ھا از محمد رضا شفیعی کدکنی، تہران

۱۷۔ بازیافت مجلہ شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

۱۸۔ شعرناب، مرتبہ خواجہ نظام الدین معظمیؒ، مکتبہ علمیہ، لاہور

۱۹۔ ارمغان پاک، شیخ محمد اکرام، لاہور

۲۰۔ اقبال اور محبت رسولؐ از ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی، لاہور

☆☆☆

Marfat.com

رومی و اقبال

گلشن قیصرہ☆

پیر رومی خاک را اکسیر کرد از غبارم جلوہ ھا تعمیر کرد
پیر رومی را رفیق راہ ساز تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

مولانا جلال الدین جو رومی' مولوی' مولانا اور مولانا روم کے ناموں سے متعارف ہیں' بلخ میں پیدا اور قونیہ میں فوت ہوئے۔علوم معقول ومنقول کی تدریس آپ کا پیشہ تھا۔ شمس الدین بن علی بن ملک داد تبریزی کی ملاقات نے ان کے طرز حیات میں انقلاب پیدا کردیا۔شمس تبریزی سلوک وعرفان کی منازل طے کر چکے تھے اور ان کی شخصیت میں بلا کی جاذبیت تھی۔۶۴۲ھ میں جب ان کی ملاقات مولانا سے ہوئی تو اس کے بعد مولانا نے درس و تدریس کے مشاغل سے ہاتھ اٹھا لیا اور ہمہ تن جذب وسلوک اور عشق ومعرفت کی طرف مائل ہوگئے۔ اہل قونیہ کو یہ بات ناگوار گذری اور وہ شمس تبریزی کو برا بھلا کہنے لگے۔لہذا اہل ظاہر کی بڑھتی ہوئی مخالفت کو دیکھتے ہوئے شمس قونیہ کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ گئے۔

مولانا کو اپنے پیر کی صحبت سے محروم ہونے کا سخت قلق ہوا۔ ہر وقت انہی کی یاد رہتی تھی۔آپ کے فرزند سلطان ولد اپنی مثنوی **ابتدا نامہ** میں لکھتے ہیں کہ مولانا نے اسی رنج فراق میں صوفیانہ غزلیات کا ایک **دیوان پیر** کے نام سے تصنیف کیا۔اسی مناسبت سے یہ ضخیم مجموعۂ اشعار **دیوان شمس تبریز** کے نام سے معروف ہے۔

مولانا کی دوسری اہم تصنیف **مثنوی معنوی** ہے۔یہ مثنوی در حقیقت ایک عظیم کارنامہ ہے جسے عالمگیر شہرت حاصل ہے۔

مثنوی میں قرآنی معارف کی بہت شرح و بسط کے ساتھ تفسیر کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ مثنوی کا آغاز بھی قرآن مجید کے انداز پر ہوا ہے۔ کلام مجید کے آغاز میں سورۂ فاتحہ ہے جو قرآن مجید کا لب لباب ہے۔ کلام مجید کی پیروی کرتے ہوئے آپ نے ''نے'' کو روح انسانی قرار دے کر تصوف ومعرفت کا ماحصل ابتدائی چند اشعار میں بیان کردیا ہے۔

☆استاد شعبۂ فارسی، ایف۔جی مارگلہ کالج برائے خواتین، اسلام آباد

Marfat.com

فرماتے ہیں:

بشنو از نی چون حکایت می کند　　　از جدائیہا شکایت می کند
کز نیستان تا مرا ببریدہ اند　　　از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند
ہر کسی از ظن خود شد یار من　　　وز درون من نجست اسرار من
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق　　　تا بگویم شرح درد اشتیاق

باقی سب دفاتر ابتدائی چند اشعار کی تفسیریں ہیں۔ اسی لیے مولانا کے ہموطنوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ پہلوی زبان کا قرآن ہے۔ مولانا خود مثنوی کے دیباچے میں لکھتے ہیں وھو اصول اصول اصول الدین۔

مولانا مثنوی میں شاعری اور سخن پردازی کی نسبت رشد و ہدایت اور تعلیم کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں عالم و عارف بھی ہیں اور مبتدی اور عامی بھی۔ وہ مختلف قصے کہانیاں بیان کرنے کے بعد آخر میں ان سے نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ اختلافی مسائل کو مناظروں کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ مسائل کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر پُر زور دلائل دیتے ہیں۔ پھر محققانہ انداز میں خود فیصلہ دیتے ہیں جس سے تمام غلط فہمیاں دور ہوجاتی ہیں۔

مثنوی کے اہم مضامین روح انسانی' روح انسانی کا روح مطلق سے فراق' توحید' عشق' اخلاق' جدوجہد' تصوف و معرفت' رجائیت اور جماعتی زندگی کی فضیلت ہیں۔

مولانا روم کے درست سات سو سال بعد علامہ اقبال ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے آپ کو رومی کا مرید و مقلد کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

چو رومی در حرم دادم اذان من　　　ازو آموختم اسرار جان من
بہ دور فتنۂ عصر کہن او　　　بہ دور فتنۂ عصر روان من

مولانا روم کے دور میں مسلمان قوم تارتاریوں کے حملوں کے نتیجے میں مضمحل اور مایوس ہوچکی تھی۔ لوگ زندگی کی فعالیتوں کے بجائے گوشہ نشینی اور غار و کوہ کو ترجیح دینے لگے تھے۔ وحشی منگول انسانوں پر بے جا ظلم ڈھاکر ان کو زندگی کی سرگرمیوں سے محروم کر چکے تھے۔ ایسی زندگی گذارنا انسانوں بالخصوص مسلمانوں کے شایان شان نہیں تھا کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر کرم اور خنجر و شمشیر اور تیغ و سناں سے عاری ہو کر ذلت و رسوائی کے گڑھوں میں پڑے رہیں۔ دین اسلام میں مصلحت جنگ و شکوہ میں ہے جبکہ رہبانیت اور غار و کوہ کی زندگی دین عیسیٰؑ میں پسندیدہ ہے۔ مولانا روم کو مسلمانوں کی تساہل پسندی' کم ہمتی اور پستی و ذلت کا سختی اور شدت سے احساس تھا۔ وہ بہائم اور دام و دد نما لوگوں سے رنجیدہ خاطر ہو کر

Marfat.com

''انسان'' کے متلاشی ہوئے جو نایاب تھا تو '' شیخ '' کی زبان میں فرمایا کہ مجھے ایسے ہی انسان کی آرزو ہے جو نہیں مل رہا۔ ان ست عناصر ہمراہیوں سے میں دل گرفتہ ہو چکا ہوں اور مجھے شیر خدا؄ اور رستم دستان کی آرزو ہے۔

مولانا روم کے بعد علامہ اقبال کے دور میں ان کے ہموطن مسلمانوں کے بھی بعینہٖ یہی حالات تھے۔ غلامی نے مسلمانوں کو پست ہمت کر دیا تھا۔ بے عمل مسلمان غلامی' ذلت' رسوائی اور پستی و بے قدری کے گڑھے میں پڑے اس حالت کو نوشتۂ تقدیر سمجھ کر اس پر قناعت کیے بیٹھے تھے۔ علامہ نے ان کا ہاتھ تھاما اور اس گڑھے سے نکلنے کے گُر بتائے۔ اُنہیں بتایا کہ تمہارے آباء و اجداد زمانے میں مسلمان ہو کر معزز ہوئے اور تم تارک قرآن ہو کر زبون و خوار ہو۔ تم نے شمشیر و سنان کو چھوڑ کر جب طاؤس و رُباب کو اپنایا تو ذلت ' زوال تمہارا مقدر ٹھہرے لیکن ابھی بھی امید کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری کشت ویران تھوڑی سی نمی سے برگ و بار لاسکتی ہے' کیونکہ تمہاری مٹی بہت زرخیز ہے۔ تم اُنہی آباء کے وارث ہو جنہوں نے صحرا سے نکل کر سلطنت رُوما کو پلٹ دیا تھا اور قدسی مجھے یہ مژدہ سُنا رہے ہیں کہ یہ شیر ایک دن پھر ہوشیار ہو جائیں گے۔ خدا کی رحمتیں تمہارے ہی لیے ہیں۔ تم شان ''کئی'' کے پھر سے حامل ہو سکتے ہو لیکن بغیر محنت کے کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا۔ خدا بھی اُنہیں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ تمہارے اجداد نے قرآن کو سینے سے لگایا' اطاعت خدا اور اطاعت رسول ؐ کا راستہ اختیار کیا' اللہ کے کلمے کو بلند کرنا اپنی زندگیوں کا مقصد و مطلوب بنایا' اور محمدؐ سے وفا کی راہ میں جانیں قربان کیں' اور آپ ؐ کی اطاعت کی تو خدا بھی ان کا ہو گیا اور اس نے ان پر نوازشات کی حد کر دی۔ قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں ان کی زیرِ نگیں ہو گئیں۔ خدا کے محبوب ؐ کو اُنہوں نے محبوب رکھا تو خدا ان کا محب ہوا۔ اُنہوں نے جنگ کی تو خدا کے لیے اور محبت کی تو خدا کے لیے۔ شاہان جہان کی طرح جنگ سے ان کا مقصد غارتگری اور جوع ارض نہ تھا بلکہ سُنت نبویؐ کا اتباع اور اعلائے کلمۃ اللہ تھا۔ انہوں نے اپنی جائے پیدائش ہی کو نہیں بلکہ ہر ملک کو اپنا ملک سمجھا کیونکہ ہر مُلک خدا کا ملک ہے اور ہر جگہ پر اسی کے قانون کی سربلندی ضروری ہے۔ طارق بن زیاد نے اسی جذبے کے تحت اپنی کشتیاں جلادیں تھیں۔ اسی جذبۂ عشق و اطاعت سے سرشاری کا اعجاز تھا کہ عناصر نے بھی ان کی اطاعت کی۔

نائب حق در جہان بودن خوش است بر عناصر حکمران بودن خوش است
در اطاعت کوش ای غفلت شعار می شود از جبر پیدا اختیار

Marfat.com

ہمارے آباء و اجداد نے خدا اور رسولؐ کے دیے ہوئے قانون کو اپنایا تو شاہ و گدا کا فرق مٹ گیا اور محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے ۔ ایک دفعہ امیرالمؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زرہ گم ہوگئی جسے آپ نے ایک یہودی کے ہاتھ میں دیکھ کر جب واپسی کا تقاضا کیا تو یہودی نے کہا کہ آپ دعویٰ کریں اور لے لیں لہذا عدالت میں مقدمہ دائر کیا گیا۔ شریح قاضی القضات تھے ۔ کہا کہ گواہ لائیں ۔ آپ حضرت حسنؓ اور اپنے غلام قنبر کو لے گئے ۔ قاضی نے کہا ''حضرت حسنؓ آپ کے بیٹے اور قنبرؓ آپ کے غلام ہیں ۔ ان کی شہادت قابل قبول نہیں۔'' آپؓ نے کہا ''میرا اور کوئی گواہ نہیں ہے۔'' یہودی یہ دیکھ کر حیرت میں آ گیا اور یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ دین محمدؐ بھی کیسا دین ہے کہ اس میں امیر وقت کے ساتھ بھی عام انسانوں کا سا سلوک روا رکھا جارہا ہے ۔ چنانچہ وہ فوراً مسلمان ہوگیا۔ اسی طرح سلطنت عثمانیہ کے تاجدار سلطان مراد نے جب ایک معمار کی تعمیر کردہ مسجد کو ناپسند کرتے ہوئے خشمگین ہوکر اس کے ہاتھ کاٹ دیے تو معمار قاضی کے پاس دعویٰ لے کر گیا ۔ قاضی نے سلطان مراد کو طلب کیا، سلطان کا رنگ ہیبت قرآن سے فق ہوگیا اور عدالت میں مجرموں کی طرح حاضر ہوا۔ خجالت و ندامت سے اُس کی آنکھیں اپنے پاؤں پر گڑی تھیں ۔ اُس کے رخسار احساس شرمندگی کے باعث سرخ ہو رہے تھے ۔ عدالت میں گردوں فر شہنشاہ اور دعویٰ گر فریادی برابر کھڑے تھے ۔ سلطان نے کہا ''میں اپنے کیے پر شرمندہ ہوں اور اپنے جرم کا اعتراف کرتا ہوں۔'' قاضی نے کہا ''زندگی قصاص میں ہے اور اسی قانون الٰہی پر ثبات حیات کا دارومدار ہے ۔ ایک مسلمان غلام' احرار سے کمتر نہیں اور بادشاہ کا خون معمار کے خون سے رنگین تر نہیں۔'' یہ سُن کر بادشاہ نے جب اپنا ہاتھ آستین سے باہر نکالا تو مدعی خاموش نہ رہ سکا ۔ اُس نے ''بالعدل والاحسان'' والی آیت پڑھی اور کہا کہ ''میں نے سلطان کو خدا اور اُس کے رسول حضرت محمدؐ کے لیے بخش دیا۔'' آئین مصطفےٰؐ کی شان ملاحظہ فرمائیں کہ ایک چیونٹی نے سلیمان پر فوقیت حاصل کرلی ۔

آغاز اسلام اور قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے نہ صرف عدل و انصاف بلکہ تمام اسلامی قوانین و اقدار اور نوامیس شرع محمدیؐ کی پوری پوری پاسداری کی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا و مافیہا اور کائنات کے حکمران بن گئے ۔ حضرت عمرؓ کا خط جب دریائے دجلہ میں ڈالا گیا تو خشک دجلہ میں روانی آ گئی، حضرت عقبہ بن نافعؓ نے جب افریقہ کے گھنے جنگل سے جانوروں اور درندوں کو تین دن کے اندر اندر نکل جانے کا حکم دیا تو تمام موذی جانور' سانپ اور اژدھے رینگ رینگ کر جنگل کو خیر باد کہنے لگے ۔

Marfat.com

آج بھی ایمان ابراہیمی اگر سینوں کو ضیاء بخشے تو آگ انداز گلستان پیدا کرسکتی ہے اور فضائے بدر کو دیکھ کر اب بھی ملائک مسلمانوں کی مدد کو گردوں سے قطار اندر قطار اُتر سکتے ہیں ۔ ناامیدی اور مایوسی کفر ہے ۔ جرأت' ہمت اور کوشش و عمل کامیابی کے لیے لازمی ہیں ۔ کم ہمتی اور بے عملی' پستی' ذلت اور زبوں حالی کا باعث ہیں۔ بے حس ؞ حرکت ساحل اپنے ہی وجود سے ناآشنا رہتا ہے جبکہ بے خود و سرمست موج دنیا و مافیہا سے بے نیاز رواں رہتی ہے اور جس کا چلتے رہنا ہی اس کی زندگی کا باعث بنتا ہے ۔ ستارے اللہ کے مقرر کردہ نظام کے مطابق چلتے رہتے ہیں اور ازل سے اب تک اُن کا وجود اُن کی اس اطاعت کے باعث ہی قائم ہے ۔ جو چلتے رہتے ہیں وہ آگے بڑھ جاتے ہیں اور جو ٹھہر جاتے ہیں وہ کچلے جاتے ہیں ۔ حرکت سے جہاں کی زندگی ہے ۔ یہی اس دنیا کی قدیم رسم ہے ۔

مسلمانوں کے اسلاف پوری طرح اسلام میں داخل ہوئے اور عشق نبیؐ میں دیوانگی کی انتہا کو پہنچے ۔ حضرت بلال حبشیؓ کو تپتی ریت پر لٹایا گیا تو وہ احد احد کہتے رہے ۔ حضرت اویس قرنیؓ نے اپنے تمام دانت شہید کر دیے' حضرت ابوبکر صدیقؓ وقت پڑنے پر اپنے نبیؐ کی خدمت میں اپنے گھر کا سارا ساز و سامان لے کر پہنچ گئے اور نبی اکرمؐ نے پوچھا کہ گھر میں کیا چھوڑ آئے ہو؟ تو بقول اقبال عرض کیا:

صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس

یہ تو چند مثالیں ہیں ۔ اصحاب پاک رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور دور ابتداء کے تمام مسلمان ہی پیکر وفا تھے ۔ نبی اکرمؐ کے ہر حکم پر امنا و صدقنا کی تصویر تھے ۔ وہ نبیؐ کے تھے' خدا اُن کا تھا اور وہ خدا کے تھے ۔ نبیؐ' خدا کا راستہ لوگوں کو دکھاتے رہے ۔ اُس کی باتیں لوگوں کو بتاتے رہے' اس کی راہ میں ایذائیں سہتے اور ایذائیں دینے والوں کو دُعائیں دیتے رہے اور اُن کے لیے اللہ سے ہدایت مانگتے رہے ۔ یہاں تک کہ آپؐ نے سفر طائف میں لہولہان کر دینے والے ظالموں کو بھی بددُعا نہ دی ۔ جو بڑھیا آپؐ پر کوڑا پھینکتی رہی جب وہ بیمار ہوئی تو اس کی عیادت کو گئے ۔ جور عدو سے کبھی بھی دل میں ملال نہ آیا بلکہ وہ راہ حق میں مزید ثبات و استقامت کا باعث بنا۔ اللہ کی خاطر دشمنان خدا و دین سے جنگیں کیں ۔ عشق خدا ہی صلح و پیکار کا باعث ٹھہرا ۔ اللہ نے بھی اپنے محبوبؐ کو سرخرو و سرفراز فرمایا ۔ طٰہٰ' یٰسین' مزمل و مدثر کے ناموں سے پیار کا اظہار کیا ۔ حوض کوثر کا مالک بنایا' دین و دنیا کی بادشاہت سے نوازا۔ اپنے محبوبؐ سے محبت رکھنے والوں کو بھی اللہ نے دوست رکھا ۔ عاشقوں نے نبیؐ کی محبت میں بے مثال و لازوال کارنامے انجام دیے اور کتاب عشق میں اُن سچی

Marfat.com

داستانوں کو رقم کیا جن سے آنے والی نسلوں کی رہنمائی ہوئی اور ہوتی رہے گی۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نے تمام عمر خربوزہ اس لیے نہیں کھایا کہ ان کو معلوم نہ تھا کہ حضورؐ نے خربوزہ کس طرح سے تناول فرمایا تھا۔ حضرت بایزید بسطامیؒ کی تقلید محبوبؐ میں فقید المثال تھے۔ آپ ہر کام نبیؐ کی سنت کے مطابق کیا کرتے تھے۔

مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ انسان جب اللہ کا ہوجاتا ہے اور اُس کی محبت میں بے لوث اور مخلصانہ نالہ کرتا ہے تو ساتوں آسمانوں میں شور و غلغلہ برپا ہوجاتا ہے۔ اُسے ہر لحہ خدا کی طرف سے سینکڑوں نامہ و پیام موصول ہوتے ہیں۔ وہ ایک بار ''یارب'' کہتا ہے' ساٹھ بار خدا کی طرف سے ''لبیک'' کا جواب آتا ہے۔ اُس کی ذلت و لغزش کو اللہ تعالیٰ اطاعت گزاروں کی اطاعت و عبادت سے بہتر قرار دیتا ہے۔ اُس کو ہر لحہ ایک خاص معراج نصیب ہوتی ہے جو اُس کے سر پر سینکڑوں خاص تاج رکھتی ہے۔ اُس کا وجود اس زمین پر ہوتا ہے اور اُس کی جان لامکان میں ہوتی ہے، جو سالکوں کے وہم و تصور سے بھی بالاتر ہے۔ بندۂ خدا مکان و لامکان کا حکمران بن جاتا ہے۔ وہ حکمرانی و فرمانروائی ایسی ہے جس طرح ایک بہشتی کے اختیار میں جنت کی چاروں نہریں۔ عاشق اپنے معشوق کے قہر و غضب اور اُس کے لطف و کرم کا یکساں عاشق ہوتا ہے۔ وہ اُس کے قہر میں بھی حلاوت محسوس کرتا ہے۔ وہ اُس سے محرومی سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔ خار زارِ عشق کی ایذاؤں کو وہ گلزار کے گلوں کی طرح عزیز رکھتا ہے۔ بُلبُل کو پھولوں سے عشق ہے اور ان کے فراق میں فریاد کرتی ہے۔ عاشق کو پھولوں کے ساتھ ساتھ کانٹے بھی عزیز ہوتے ہیں۔ وہ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ اگر میں اس خارزار سے بُستان میں چلا جاؤں تو میں بلبل کی طرح نالہ و فریاد کروں گا۔ عاشق بلبل نہیں بلکہ وہ آتشِ عشق میں رہنے والا ماہی بے آب ہے۔ عاشق کو عشق کی تمام تلخیاں اور ناگواریاں پسند ہیں۔ عشق، عاشقوں کی تمام بیماریوں کا معالج ہے۔ وہ ان کی نخوت و ناموس کی دوا اور سب امراض کے لیے افلاطون و جالینوس ہے۔ عشق عاشقوں کے لیے کانٹوں کو پھول اور زہر کو شہد بنا دیتا ہے۔ عشق تانبے کو سونے اور تلخیوں کو شیرینیوں میں بدل دیتا ہے۔ مولانا کے بقول میں عشق کی جتنی بھی وضاحت کرتا ہوں ناکافی ہوتی ہے۔ جب میں لفظ عشق پر غور کرتا ہوں تو اپنی کی گئی وضاحت پر شرمندہ ہوتا ہوں۔ عشق حق سراپا حق ہے۔

مولانا فرماتے ہیں انسان دنیا کے جال میں پھنس جاتا ہے اور سختی سے جکڑا جاتا ہے۔ اس جال سے نکلنے کے لیے قوت درکار ہے۔ زندگی کشت بہار ہے۔ جو اس بہار کی حقیقت نہیں جانتا وہ اس کی قدر و قیمت سے آشنا نہیں ہوسکتا۔ لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان

Marfat.com

اللہ کی پناہ کی طرف بھاگے اور ہر لحہ اسی کی طرف رجوع کرے اور راغب ہو کیونکہ اللہ نے انسانوں پر ہزاروں مہربانیاں کی ہیں۔ اس کی پناہ تو ایسی ہے کہ جس میں آ کر انسان آب و آتش کے لشکر کو بھی اپنا ہموا پاتا ہے ۔ ایسا ہی لشکر حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ کا ہمدم و دوست اور ان کے دشمنوں کے لیے عذاب ثابت ہوا۔ آگ حضرت ابراہیمؑ کے لیے قلعہ بن گئی اور نمرود کے دل کو اُس نے جلادیا ۔ نمرود کی بے انتہا باطل قوت' کرشمۂ حق کے مقابل ریت کا پہاڑ ثابت ہوئی ۔ اللہ کا لطف و کرم بے حد و بے حساب ہے جس سے اُس نے ہمیشہ اپنے مخصوص بندوں کو نوازا ہے ۔

علامہ اقبال نے مولانا روم کی مثنوی کی تقلید میں مثنوی اسرار خودی ' لکھی اور اپنی مثنوی کی بنیاد مولانا کی ایک غزل کے مندرجہ ذیل اشعار کو بنایا اور انہیں اپنی مثنوی کا سرنامہ قرار دیا۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر — کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زین ہمرہان ست عناصر دلم گرفت — شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

اس مثنوی میں خودی کی تربیت کے لیے اقبال نے تین مراحل کا ذکر کیا ہے ۔ پہلا مرحلہ اطاعت' دوسرا ضبط نفس اور تیسرا نیابت الٰہی ہے ۔ اقبال کا نظریۂ خودی حضرت علیؑ کے اس قول کے عین مطابق ہے کہ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ ۔ اللہ اور رسولؐ کی فرمانبرداری کرتے ہوئے جب انسان ترغیبات نفس سے بچتا ہے اور غیراللہ کے سامنے گردن نہیں جھکاتا تو اُس کی خودی اور خودداری قائم رہتی ہے ۔ گداگری اور سوال سے رسول اکرمؐ نے منع فرمایا ہے ۔ اقبال بھی طریق امیری پر اُس فقیری کو فوقیت دیتے ہیں جس میں خود فروشی نہ ہو۔ اطاعت اور ضبط نفس کے بعد جب انسان تیسرے مرحلے میں پہنچتا ہے تو وہ عناصر کا حکمران اور سایۂ خدا بن جاتا ہے اور جزو وکل کے رموز سے آگاہ ہوجاتا ہے ۔ ایسے مرد کامل کا اقبال خیرمقدم کرتے ہیں اور اُس کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ نوع انسان کھیتی اور تو اس کا حاصل اور کاروانِ زندگی کی منزل ہے ۔

علامہ نے اپنی تمام شاعری میں اپنی پسماندہ' زبوں حال اور پست و خوار قوم کو جرأت و ہمت' سعی و عمل' خودداری' امید' اطاعت خدا و عشق رسولؐ کا پیغام دیا اور ان کو اپنے اسلاف کے عظیم کارنامے یاد دلائے ہیں۔ اُن کی شاعری کا مقصد وحید قوم کو مجتمع کرنا اور منزل تک پہنچانا ہے ۔ فرماتے ہیں :

Marfat.com

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست　　سوی قطار می کشم ناقۂ بی زمام را

اُن کا ترانہ قوم کے لیے بانگِ درا ہے جو بکھرے ہوئے مسافروں کو جمع کر کے پھر سے بہ شکل کاروان جادہ پیما کرتا ہے۔ پیام مشرق کی نظم بعنوان ''حُدی'' میں علامہ فرماتے ہیں میرا نغمہ دلکش ہے۔ اس کے زیر و بم جانفزا ہیں۔ یہ قافلوں کے لیے گھنٹی ہے۔ پھر ساربان کی زبان سے ''ناقہ'' کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''اے کہ تو حرم میں جبیں سائی کرتی ہے' تو کچھ اور تیز قدم اُٹھا کیونکہ اب ہماری منزل زیادہ دور نہیں ہے۔''

مولانا روم بھی مثنوی میں قافیہ بندی اور وزن شعر وغیرہ کی نسبت رُشد و ہدایت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں جب میں قافیہ کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرا دلدار مجھے کہتا ہے کہ تو میرے دیدار کے علاوہ کچھ اور نہ سوچ اور اگرچہ میں فاعلات فاعلات نہیں جانتا لیکن میرے اشعار آب حیات سے بہتر ہیں۔

☆☆☆

Marfat.com

رنگوں کا نفسیاتی مفہوم اور ان کے ذہن انسانی پر اثرات

عابد حسین قریشی☆

اس کائنات میں پھیلے ہوئے لامحدود خوبصورت رنگ اس کائنات کی اساس بھی قرار دیے جاسکتے ہیں اور ان کا وجود انسانی زندگی کے لیے ضروری بھی ٹھہرایا جاسکتا ہے کہ یہ انسان کی زندگی، طبیعت' رویے اور نفسیات سبھی پر اثرانداز ہوتے ہیں' اور ایک اعتبار سے انسان کے رویوں کی تشکیل میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر اس کائنات میں رنگ نہ ہوتے تو ہم تصور بھی نہیں کرسکتے کہ یہ کائنات کتنی بے کیف اور بے رنگ ہوتی اور انسان کس قدر ذہنی الجھنوں اور دباؤ کا شکار رہتے کہ یہ رنگ ہی ہیں جو انسانوں کو ہرلحہ کلرتھیراپی مہیاکرکے بہت سی ذہنی الجھنوں اور نفسیاتی دباؤسے نجات دلاتے رہتے ہیں۔ یہ کائنات کس قدر رنگدار اور کس قدر درخشندہ ہے اس کا اندازہ شاید ہم میں سے انتہائی تیز بصیرت رکھنے والاانسان بھی نہ لگاسکے' کیونکہ انسان کی قوت بصیرت محدود ہے اور اس محدود بصیرت سے ہی ہمیں یہ کائنات نہایت رنگدار اور خوبصورت نظرآتی ہے ۔ ذرا ایک مرتبہ تخیل کے درکھولیں کہ اگر یہ کائنات صرف سلیٹی رنگوں پر مشتمل ہوتی یا پھرنگین تو ہوتی مگر انسان بھی چند جانوروں کی مانند کلر بلائنڈ پیدا ہواہوتا تو یہی کائنات ہمارے لیے کتنی غیر جاذب نظر اور بغیر کشش کے ہوتی ۔ شاید وجود زن بھی تصویر کائنات میں رنگ نہ بھرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ رنگوں نے ہر انسان کو متاثر کیا ہے خواہ وہ تخلیق کار ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ شاعروں نے اس کو موضوع شاعری بنا تو ماہرین فن تعمیرات نے انہیں عمارات کا جزو لازم سمجھا ۔ ادیبوں اور فلسفیوں نے رنگوں کو موضوع بحث بنایا تو ماہرین نفسیات نے رنگوں کے ذریعے سے ذہنی گتھیوں کو سلجھایا' رقاصوں نے رنگوں کو اپنے فن کا بنیادی مقصد گردانا تو مصوری کی تمام دنیا ہی رنگوں کے مدار پر گھومتی ہے' بلکہ اب تو میڈیکل سائنس میں کلرتھیراپی سے حیرت انگیزعلاج بھی ہو رہے ہیں ۔ الغرض' رنگوں کے بغیر کائنات خاصی حدتک بے کیف اور غیر دلچسپ ہوتی اور شاید فنون لطیفہ کی تقریباً تمام شاخوں میں اس قدر معیاری فن پارے تخلیق نہ ہوتے' جس قدر آج تک ہوئے ہیں ۔

☆استاد شعبہ فائن آرٹس، بلوچستان یونیورسٹی، کوئٹہ

Marfat.com

جیسے انسانوں کو رنگوں سے محبت ہے اسی طرح ہمارے پاس یہ ماننے کے لیے بہت سے دلائل موجود ہیں کہ خدائے ذوالجلال بھی رنگوں کو پسند کرتے ہیں' مثلاً اگر حق تعالیٰ چاہتے تو اس کائنات کو رنگوں سے محروم تخلیق کر سکتے تھے' یا انسانوں کو رنگوں کی تمیز عطا نہ کرتے اور ہم اس کائنات کو سلیٹی رنگ کی ٹونز میں دیکھتے۔ اس کی بہت سی مثالیں بھی موجود ہیں' مثلاً انسانوں میں جزوی یا کلی طور پر بلائینڈ بچے پیدا ہوتے ہیں۔ بہت سے جانور کائنات کو رنگوں میں نہیں دیکھ سکتے جیسے بلی' اور کچھ جانور ایسے ہیں جو تمام رنگ نہیں دیکھ سکتے، مثلاً گرین اور ریڈ ان کو ایک ہی رنگ نظر آتا ہے لیکن وہ چند رنگوں میں تمیز کر سکتے ہیں۔چنانچہ ہم یہ باور کر سکتے ہیں کہ خدا نے کائنات کو رنگین بنایا اور انسانوں کو رنگوں کی ویژن عطا کی۔ بلوچوں کے ایک شاعر ابراہیم نالی جواں سال بگٹی نے خالق کائنات کے لیے ''رنگین بادشاہ'' کا استعارہ کیا تھا۔'' رنگی بادشاہ مارا تتی نگاہ'' (اے رنگوں کے خالق بادشاہ ہم پر نگاہ رحمت فرما۔) اسی مضمون کو تصوف کے مشہور معروف شاعر سچل سرمست نے یوں ادا کیا: ''انت بجردی خبر نہ کائی ۔ رنگی رنگ بنایا۔''

حق تعالیٰ کا خود جمیل ہونا اور جمال کو پسند کرنا بھی رنگوں کے تنوع اور ان کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے - یہی وجہ ہے کہ ہم رنگوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے' اور یہی وہ مقام ہے جہاں تک میں معزز قارئین کو لانا چاہتا ہوں کہ یہاں سے میرے مضمون کی ابتدا ہوتی ہے' یعنی رنگوں کا نفسیاتی مفہوم اور انسانی ذہن پر رنگوں کے اثرات ہوتے ہیں' اور کیا کیا ہوتے ہیں۔

رنگوں کے انسانی نفسیات (بلکہ حیوانی نفسیات پر بھی) بے شمار اثرات ہوتے ہیں' مثلاً کچھ رنگ انسانوں کو مشتعل کرتے ہیں' کچھ ذہن کو پر سکون کرتے ہیں، اور چند رنگ ذہن کو سلا بھی دیتے ہیں ۔ کچھ رنگ انسان کو ہشاش بشاش کرتے ہیں تو چند رنگ سست کر دیتے ہیں۔ کچھ رنگ انسان کے اعصاب کو ڈھیلا کر دیتے ہیں اور انسان میں نفسیاتی قوت مدافعت کم ہو جاتی ہے' اور کچھ رنگ ڈیپریشن میں لے جاتے ہیں۔ یہاں مجھے ہالینڈ کے انیسویں صدی کے مشہور مصور وین گاف کے بارے میں چند سطور لکھنے کا موقع دیجیے ۔ رنگوں کے استعمال میں وان گاف کو کافی شہرت حاصل ہے کہ اس کے رنگ انسانی اعصاب کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں ۔ چنانچہ ہم ''نائٹ آف دی جنرلز'' کے ہدایت کار نے وین گاف کے رنگوں سے مخصوص کام یہ لیا تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران مشہور اور معتبر نازی جرنیل Tanz پیرس کے قریب ورسیلز محل میں لوئی چہاردہم کی آرٹ گیلری کے دورے کے دوران جب وین گاف کی تصاویر کے سامنے جا کر رکتا ہے تو کیونکہ وہ اندر سے احساس جرم کا شکار ہوتا ہے اس لیے اس مصور کے

Marfat.com

رنگ جنرل ٹانز کے اعصاب کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں اور وہ لڑکھڑا کر گرتا گرتا بچتا ہے۔ (۱)

اسی طرح جرمن Expressionism کا تقریباً تمام رنگوں کے استعمال کے حوالے سے دنیا میں منفرد مقام رکھتا ہے کہ ان مصوروں کے رنگ ناظر کی طبیعت اور رویے پر مختلف قسم کے اثرات مرتب کرتے ہیں' اور یہی اس دبستان کی سب سے بڑی قوت ہے۔ (۲)

سرخ رنگ

کچھ رنگوں کا اثر اگرچہ نفسیاتی طور پر ذہن کو قدرے مشتعل کرنے کا ہوتا ہے' تاہم مجموعی طور پر یہ رنگ مثبت اثرات نقش کرتے ہیں' مثلاً سرخ رنگ بین الاقوامی طور پر خون کا رنگ ظاہر کرتا ہے اور خون زندگی کی علامت ہے۔ چنانچہ سرخ رنگ ایسے بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جن کا مطلب مثبت ہو۔ بہت سی رسومات میں سرخ رنگ کو اہمیت حاصل ہے۔ تقریباً پورے برصغیر پاک و ہند میں دلہن کا لباس عروسی سرخ رنگ کا ہوتا ہے اور دولہا کی کلائی پر سرخ پھول باندھا جاتا ہے۔ یہ سب سرخ رنگ کو خوش بختی سے تشبیہ دینے کی علامات ہیں۔ سرخ رنگ ذہن کو مشتعل اور اس کے خلیات کو جھنجھوڑ کر جگانے میں مدد بھی کرتا ہے' اور انسانی نفسیات کو ہشاش بشاش اور چاک و چوبند رکھنے میں مثبت کردار ادا کرتا ہے۔

شعروں کے انتخاب کی مانند رنگوں کا انتخاب بھی دل کے راز کھول دیتا ہے۔ چنانچہ محبوب کو سرخ گلاب پیش کرنے کا مطلب تقریباً بین الاقوامی سطح پر اپنی شدید محبت کے جذبات دوسرے تک پہنچانا ہے۔ یورپ کے دور تاریک کی بہت سی رسومات میں سرخ رنگ کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ سرخ لبادہ' سرخ جام اور سرخ شراب استعمال میں لائی جاتی تھی۔ قدیم روم میں بھی سرخ رنگ کو خصوصی اہمیت حاصل تھی اور اسے جذبات کو ابھارنے والا رنگ تصور کیا جاتا تھا۔ چنانچہ پمپئی میں ۵۰ ق م کے دور کا ایک تھیٹر دریافت ہوا ہے جسے Villa of the Mysteries کہا جاتا ہے جس کی چاروں اطراف کی دیواروں پر نہایت خوبصورت سرخ رنگ کا پینٹ کیا گیا ہے اور اس کے برعکس لائٹ کریم کلر میں ناچتی گاتی رقص کرتی تھرکتی لڑکیوں کی تصاویر مصور کر کے اس پورے تھیٹر کو ایک Sensual احساس' دیا گیا ہے۔ (۳)

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی ایک بیت کا ترجمہ کچھ یوں ہے: "من کی رنگین صنم کھڑکی سے دیکھ پاتا ہوں صرف لال ہے۔" رنگ کیونکہ سرخ رنگ زمانہ قدیم سے حیوانیت کا رنگ بھی تصور کیا جاتا رہا ہے اس لیے یہ انتہا پسند جذبات کی ترجمانی بھی کرتا ہے' یعنی شدید محبت' شدید نفرت' شدید قوت ارادی' مکمل اقتدار' مکمل قربانی کے شدید جذبات وغیرہ سب اسی

Marfat.com

رنگ کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس رنگ کو پسند کرنے والے ''تخت یا تختہ'' جیسے نظریات کے قائل ہوتے ہیں اور کسی درمیانی راہ پر سمجھوتہ نہیں کرتے۔ اس کے گرویدہ انسان عموماً خود دار اور غیرتمند بھی پائے گئے ہیں۔ یہ رنگ کیونکہ خون کو علامتی انداز میں پیش کرتا ہے' اس لیے اس کو زندگی کا علامتی رنگ بھی سمجھا جاتا ہے۔ قدیم پتھروں کے دور کے انسان کیونکہ زندگی اور موت سے متعلق باشعور نہیں تھے اس لیے مردے کی تدفین میں ایک اہم رسم یعنی اس کے جسم پر سرخ رنگ چھڑکنا بھی شامل کرلیا کرتے تھے' تاکہ مرنے کے بعد اس کو نئی زندگی مل سکے۔ سرخ رنگ اس حد تک زندگی کی علامت سمجھا جاتا ہے کہ سولہویں صدی کے ایک مشہور ہسپانوی مصور El Greco (۱۶۱۴-۱۵۱۷ء)' جونہایت خوبصورت اور جیتے جاگتے پیلے اور سرخ رنگ کے استعمال میں ایک منفرد مقام کا حامل ہے۔ کے بارے میں Jean Coc,teau کا مندرجہ ذیل تبصرہ ملاحظہ ہو:

> From unknown mystries, Greco extracted unearthly richness of colours, yellows and reds which he alone knows. He used them like an angelic trumpet, his vibrant reds and yellows make the dead who, hands raised towards heaven, rise up from their graves, ripping their shrouds.

ہماری اپنی تاریخ سے ہمیں ایک حوالہ ملتا ہے جہاں سرخ رنگ کو زندگی' غیرت' خون اور قربانی کی علامت تصور کیا گیا۔ ۱۵ مئی ۱۸۵۷ء کو شروع ہونے والی ہندوستان کی جنگ آزادی سے قدرے قبل اس رنگ کو انہیں اقدار کے لیے علامتی انداز میں استعمال کیا گیا تھا- چنانچہ بنگال سے ''سرخ کنول'' کی تحریک ابھری تھی' جس نے چندماہ میں پورے بنگال کو علامتی انداز میں یہ پیغام پہنچا دیا کہ اب تمہارے ملک کا حسن بھی اور غیرت بھی غیروں کے قبضے میں آچکی ہے اور بنگال کے سرخ شفق والے آسمانوں پر بھی اب انگریزوں کی حکومت ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ خون کی قربانی دے کر اپنے ملک کی سرخی شادابی اور رعنائی کو بچالو۔ (۴)

سرخ رنگ کا ایک روحانی درجہ بھی ہے۔ طبیعات کی رو سے سرخ رنگ کے احساس کی وجہ حرکت موجی کی تیزی ہے جس کا تعدد چارسو کھرب فی سیکنڈ بتایا جاتا ہے۔ اگر ہم خارجی طور پر اس تعدد کا شمار دو ہزار فی سیکنڈ کے حساب سے کریں' جو ادراک نور کی حد ہے' تو چھ ہزار سے زائد عرصے میں ہم شمار کر پائیں گے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آن واحد میں ہمیں سرخ رنگ کا ادراک ہوجاتا ہے۔ (۵)

Marfat.com

سرخ رنگ کو اس حد تک فضیلت حاصل ہے کہ دنیا کے تمام جھنڈوں میں مجموعی طور پر سرخ رنگ سب سے زیادہ استعمال ہوا ہے' اور انگلستان میں برٹش ہاؤس آف لارڈز میں کرسیوں کا رنگ سرخ ہے جس سے اس امر کا صاف اشارہ ملتا ہے کہ سرخ رنگ کو رنگ فضیلت کے طور پر بھی مانا جاتا ہے۔

جہاں فضیلت، زندگی 'خون اور قربانی جیسے اعلیٰ اوصاف سرخ رنگ سے منسوب ہیں وہاں یہ رنگ جذبات میں ابال اور جنسی خواہشات میں ابھار بھی پیدا کرتا ہے۔ اس کو پسند کرنے والے زندگی سے بھی شدید پیار کرتے ہیں۔ بعض جانوروں کو بھی سرخ رنگ سے اشتعال انگیز ہوتے دیکھا گیا ہے۔ مثلاً سپین میں Bull Fight میں بھینسے کو مشتعل کرنے کے لیے سرخ رنگ کی چادر دکھائی جاتی ہے۔ بندر کی نفسیات کا بھی مشاہدہ کیا گیا ہے اور معلوم ہوا ہے کہ اگر میسر آجائے تو وہ اپنے جسم کو کسی رنگدار کپڑے میں لپیٹنا پسند کرتا ہے اور سرخ کپڑا مل جائے تو بے انتہا خوش ہوتا ہے۔ سرخ رنگ کو پسند کرنے والے بہت جلد غصے میں آجاتے ہیں۔ چنانچہ مریخ کو سرخ سیارہ کہتے ہیں اور زمانہ قدیم سے یہ جنگ و جدل کا سیارہ مانا جاتا ہے اور قدیم مائی تھالوجی کے مطابق مریخ دیوتا کی ڈھال بھی سرخ رنگ کی ہوتی ہے۔

اردو ادب میں سرخ رنگ کو اچھے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور اس کی آمیزش سے کچھ اچھے استعارے موجود ہیں۔ مثلاً سرخ و سفید (صحت مند)، سرخ چشم (غیور آنکھ) سرخرو (کامیاب)، لالی گلاب کی (روایات کا حامل)، سرخی شفق (شادابی) سرخی حیا (صنف نازک کا زیور) وغیرہ۔ علاوہ ازیں' بلوچی ادب میں بھی سرخ کی آمیزش والے الفاظ اچھے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً لال (ہیرا 'مجازاً محبوبہ) لال تاک (ایک خوشبودار بوٹی) لال و لال (کامرانی و سرفرازی) لانٹ (شعلہ)۔ اسی طرح سرخ کے ساتھ مرکب الفاظ بھی اچھے مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں' مثلاً سہرو (سونا) گل سہرو (گلاب کا پھول) سرخند (گھوڑے کی اعلیٰ نسل) سہرچم (غیور)، سہرگیں ورنا (سرخ ▪ سفید جوان)، سہراب (سرخرو) سہرپلی (سرخ لالہ)۔(۶)

اسی طرح سرخ رنگ کو کلر تھیراپی کے طور پر بھی بہت سی اقوام میں استعمال کیا جاتا ہے' مثلاً بلوچوں کی عقائد کے مطابق الرجی کے مریض کو اگر شہد میں گیروا رنگ ملا کر کھلایا جائے اور اوپر سے سرخ کمبل اوڑھا دیا جائے تو کلر تھیراپی کے ذریعے کمبل الرجی کو زیادہ سے زیادہ باہر کھینچ لے گا اور حیران کن حد تک یہ ٹوٹکا درست ثابت ہوا ہے۔ (۷)

Marfat.com

سفید رنگ

سفید رنگ تقریباً تمام دنیا میں مقدس سمجھا جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دو پسندیدہ رنگوں میں سے ایک سفید تھا۔ بہت سی اقوام میں سفید رنگ کو افضل اور اونچا مقام حاصل ہے۔ سفید رنگ کو بادلوں سے بھی مناسبت ہے اور بادلوں کو بالا و پاک ہونے کی وجہ سے سفید رنگ کو تقدس اور قدر و منزلت ملی ہے۔ عیسائیت کے مطابق سفید رنگ کو پاکدامنی سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ چنانچہ سفید رنگ کے للی کے پھول اگر کسی خاتون کو پیش کیے جائیں تو اس کا مطلب اس کے دامن کا بے داغ ہونا ہے۔ چنانچہ عیسائی نظریے کے مطابق حضرت جبرائیل علیہ السلام جب حضرت مریمؑ کو ولادت یسوع مسیح کی بشارت سنانے تشریف لائے تو ان کے ہاتھ میں سفید للی کے پھول تھے' جو انہوں نے تحفتہً پیش کیے اور اٹلی میں سیانا مکتب فکر کے چودھویں صدی کے مشہور مصور سیمونے مارٹینی نے ۱۳۳۳ء میں اسی موضوع کو اس خوبصورتی سے مصور بھی کیا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام کے ہاتھ میں زیتون کی شاخ ہے جو امن کی علامت ہے اور تصویر کے عین درمیان میں رکھے گلدان میں سفید للی کے پھولوں کا گلدستہ سجایا گیا ہے اور حجرے میں اوپر فضا میں مقدس ارواح آسمانوں سے بشارت دینے کے لیے جمع ہیں۔ یہ تصویر اس وقت فلورنس کی یوفی زی آرٹ گیلری میں محفوظ ہے۔

جنگ میں سفید رنگ کو صلح و امن کا رنگ تصور کیا جاتا ہے۔ سفید فاختہ دنیا میں امن کی علامت ہے۔ سفید رنگ کو کردار کے بے داغ ہونے سے بھی تشبیہ دی جاتی ہے۔ جاپانی مرد مبارکباد کے موقع پر سیاہ سوٹ کے ساتھ سفید چاندی ایسی نکٹائی زیب تن کرتے ہیں اور سفید گلاب کا تحفہ بھی جاپان میں خوشی کے موقع پر دیا جاتا ہے۔

عیسائیت میں دلہن کا لباس سفید ہوتا ہے جو عفت کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ مغرب زدہ ہونے کی وجہ سے اب جاپان میں بھی دلہن کے روایتی لباس مخصوص کیمونو کی بجائے یورپ کی مانند سفید لباس بڑے پیمانے پر زیب تن کیا جاتا ہے۔

سفید رنگ کو پسند کرنے والے انسان متوازن ذہن کے ہوتے ہیں اور اپنی خواہشات پر سب سے زیادہ اختیار رکھتے ہیں۔ وہ مدبر ہوتے ہیں، بہتر حکمت عملی کا ثبوت دیتے اور اچھے منتظم ثابت ہوتے ہیں۔ یہ کبھی جوشیلے نہیں ہوتے۔ دھیمے مزاج کے ہوتے ہیں اور اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہیں۔ اردو ادب میں سفید رنگ کو اونچے پہاڑوں پر پڑی برف سے بھی تشبیہ دی جاتی ہے۔ اس لیے اس کو پاکیزگی اور عفت کا رنگ بھی سمجھا جاتا ہے۔ سفید ریش ایک استعارہ ہے جس کا مطلب قابل احترام ہستی اور تقریباً دنیا کے ہر ملک میں اس کا یہی

Marfat.com

مطلب ہے۔ سفید رنگ سب سے ٹھنڈا رنگ ہے اور ذہن کو سکون اور ٹھنڈک بخشتا ہے۔ اس کو پسند کرنے والے روحانی، جسمانی اور ذہنی اعتبار سے متوازن و معتدل ہوتے ہیں۔ یہ قابل اعتماد دوست بن جاتے ہیں بشرطیکہ یہ خود دوسرے کو دوست تسلیم کریں۔

سفید رنگ میں ایک اور خوبی بھی ہے۔ یہ اپنے حجم سے بڑا نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس کالا رنگ اپنے حجم سے چھوٹا نظر آتا ہے' مثلاً برابر کے حجم کی دو اشکال میں ایک میں کالا رنگ اور دوسری میں سفید رنگ بھر کر دیکھیں۔ سفید شکل اپنے حجم سے بڑی اور کالی حجم سے چھوٹی نظر آئے گی۔

سیاہ رنگ

سفید رنگ بہت سی وجوہات کی بنا پر منفی معنوں میں استعمال ہوتا ہے تاہم شاذ و نادر یہ مثبت مطالب میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اس وقت اس کی قدر و منزلت بڑی منفرد اور بہت زیادہ ہوتی ہے۔ بین الاقوامی طور پر اس کو ماتم اور سوگ کا رنگ تصور کیا جاتا ہے۔اس کو موت کا رنگ بھی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ بہت سی قوموں میں مرگ کی تمام رسومات میں مرد و زن سیاہ لباس ہی زیب تن کرتے ہیں' مثلاً جاپان میں مرگ کی رسموں یعنی ''اوتسویا'' (مرگ والے گھر میں رت جگا) اور سوّیشکی (مردے کو جلانے کی رسم) دونوں میں مرد سیاہ سوٹ کے ساتھ سیاہ نیکٹائی اور خواتین سیاہ سکرٹ اور جمپر یا سیاہ ون پیس اور یا پھر قدیم روایتی سیاہ کیمونو پہنتی ہیں۔ برصغیر میں اس کو تاریکی' بدکاری' ظلم' ناکامی' بیزاری' نفرت اور گناہ وغیرہ سے منسوب کیا جاتا ہے' مثلاً اردو ادب میں ایسے استعارے موجود ہیں جیسے سیاہ' سیاہی' سیاہ کار' سیاہ کاری' کاروکاری' سیاہ رو' سیاہ بختی' سیاہ دلی وغیرہ یہ تمام منفی رجحانات کو پیش کرنے والے معنوں کے حامل ہیں۔ علاوہ ازیں' یوم سیاہ' سیاہ حروف میں لکھی جانے والی تاریخ 'کالا دھن' کالا قانون' کالا بازار' کالا من' کالے کرتوت' تمام منفی مفاہیم کے حامل ہیں۔ تاہم یہ رنگ دہرے معنی کا بھی حامل ہے اور جہاں یہ مثبت معنوں میں استعمال ہوتا ہے وہاں ذوق جمالیات کی انتہائی خوبصورتی بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور اردو ادب میں سیاہ رنگ کے ساتھ بہت سے نہایت منفرد اور خوبصورتی کی انتہا کے معانی لیے ہوئے استعارے بھی موجود ہیں، جیسا کہ سیاہ چشم' سیاہ ابرو' سیاہ بال' سرمہ' کاجل' تمام ذوق جمالیات کے اعتبار سے حسن کی علامات ہیں۔ اسی طرح خاتون کی خوبصورت خمیدہ لٹ کو کالی گھٹا سے تشبیہ دینا بھی اردو ادب اور شاعری میں نایاب نہیں ہے۔گورے چہرے پر یا کسی اور خوبصورت جگہ کالے تل کا ہونا بھی خوبصورتی کا عکاس ہے۔

تاہم سیاہ رنگ کی یہ مخصوص علامات بھی بدستور قائم ہیں کہ یہ رنگ افلاس' ظلمت'

Marfat.com

غربت' درماندگی' پسماندگی' غلامی اور کمتر سماجی حیثیت کی غمازی کرتا ہے۔ چنانچہ سپین میں عورتیں سیاہ لباس بطور عجز یا اظہار شرم کے زیب تن کرتی ہیں ۔ سیاہ رنگ جادو شکن قوتوں کا حامل بھی تصور کیا جاتا ہے ۔ اس لیے اسے جادو ٹونے اور نظر بد سے بچانے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے ۔ برصغیر کے علاوہ بھی کئی اقوام میں اسے جادو شکن سمجھا جاتا ہے ۔ چنانچہ پیارے بچے یا دوشیزہ کے گال پر سیاہ رنگ کا نظر وٹو لگانا بھی ایسے ہی یقین کا اظہار ہے ۔ بلوچ معاشرے میں زچہ کے گھر کے باہر نظر بد یا شیاطین کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے کالا توا لٹکانا اور بچوں کے سرہانے کالا ہرل اور اُون کی کالی کھتی لٹکانا بھی انہی نظریات کے زیر اثر رسومات ہیں ۔(۸)

بلوچوں کی رسوم کے مطابق کالے رنگ کو کبھی کبھی بہت افضل اور مثبت درجہ بھی حاصل ہے ۔ مثلاً دو قبائل میں اگر کوئی خونریز جنگ ہو رہی ہو اور صلح کی کوئی صورت نظر نہ آتی ہو اور ایسے میں اگر کوئی سیہ سر (سیاہ بالوں والی خاتون) درمیان میں آ جائے تو اس کی شرم و عزت رکھنے کے لیے دونوں قبائل جنگ روک دیتے ہیں اور پھر گفت و شنید کر کے صلح کی کوئی نہ کوئی صورت نکال ہی لی جاتی ہے ۔ (۹)

کیونکہ یہ رنگ توجہ مبذول کروانے میں کارآمد ثابت ہوتا ہے اس لیے اس کو پسند کرنے والے لوگ زیادہ تر ذوق جمالیات کے شیدائی ہوتے ہیں اور خوبصورتی کو سب سے اہم گردانتے ہیں ۔ لیکن سیاہ رنگ کے ساتھ اگر کوئی سرخ رنگ بھی پسند کرتا ہے تو یہ جنگ و جدل کا انتہائی دیوانہ' خون بہانے کا شوقین اور بدلہ لینے میں انتہا پسند ہوتا ہے ۔ ایسے شخص کے ہاتھ میں اگر طاقت آ جائے تو وہ کسی ظالم حکمران سے کم نہیں ہوتا جو محض ظلم کر کے خوش ہوتا ہے ۔ تاہم صرف سیاہ رنگ کو پسند کرنے والے انسان میں یہ اوصاف نہیں ہوں گے اور وہ زیادہ سے زیادہ خوبصورتی پر مرمٹنے والا شخص ہوگا' خواہ مرد ہو یا عورت ۔

نیلا رنگ

نیلا رنگ بین الاقوامی طور پر خوبصورت، گہرا اور طمانیت پسندی کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔ بعض اقوام میں یہ تحفظ پسندی کی علامت ہے ۔ اگر نیلے اور سفید رنگوں کے خوبصورت امتزاج کے ساتھ ڈیزائننگ میں خاص ہم آہنگی پیدا کی جائے' تو یہ تصوف کے رنگ بن جاتے ہیں ۔ چنانچہ ملتان میں شاہ رکن عالم ارو شیخ بہاء الدین زکریاؒ دونوں کے مقابر پر نیلے اور سفید رنگ کے خوشنما امتزاج فراخدلی سے استعمال کیے گئے ہیں ۔ اسی طرح لاہور میں حضرت علی ہجویری داتا گنج بخش کے مزار سے ملحقہ مسجد میں تصوف کے رنگوں کے طور پر خوبصورت نیلا اور سفید

Marfat.com

رنگ ہم آہنگ کیے گئے ہیں۔

نیلا رنگ دنیا بھر میں بہت زیادہ لوگوں کا پسندیدہ رنگ ہے' بالخصوص فرانسیسی اسے بہت زیادہ پسند کرتے ہیں ۔ اس کو پسند کرنے والے لوگ وجدانیت پسند ہوتے ہیں اور آسمانوں کی بلندیوں کے خواب دیکھتے ہیں۔نیلا رنگ بیک وقت گہرائی اور بلندی دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے کیونکہ سمندر اور آسمان دونوں نیلے ہیں ۔ اس لیے ایسے استعارے موجود ہیں جو انتہائی اونچائی اور انتہائی گہرائی میں اچھے مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں' مثلاً گہری جھیل جیسی نیلی آنکھیں، نیلے آسمان جیسی بلندی' آسمان جیسا بلند، نیلا پربت ۔ جاپان میں بھی ایک نیلا پہاڑی سلسلہ موجود ہے جس کو جاپانی میں Aoi Samyaku کہتے ہیں اور جو ان کے ادب میں فراخدلی سے استعمال ہوتا ہے۔ یہ رنگ پسند کرنے والے دوسروں کی عزت اور اپنی عزت دونوں کے حامی ہوتے ہیں ۔ یہ لوگ کبھی کبھار انتہاپسند بھی ہوجاتے ہیں اگرچہ عموماً یہ متوازن ذہن کے مالک اور اعتدال پسند ہوتے ہیں'لیکن انتہا پسندی میں مکمل طور پر روحانیت پسند یا مادہ پرست بن جاتے ہیں۔ بہرحال یہ مشکل اور کٹھن راستوں سے نہایت متوازن ہوکراپنے آپ کو گذار سکتے ہیں ۔ برطانیہ کی شہزادی مارگریٹ کا پسندیدہ رنگ بھی نیلا ہے جسکی مناسبت سے اس میں اس رنگ کے تمام اوصاف پائے جاتے ہیں ۔ گہرا خوبصورت نیلا رنگ قوم یہود کا بھی پسندیدہ ہے ۔ بلوچ قوم میں نیلے رنگ کے کچھ علامتی معانی بھی لیے جاتے ہیں ۔

اس کو شیاطین' جنات اور وباؤں کے خلاف قوت سمجھا جاتا ہے ۔ چنانچہ ایام زچگی میں زچہ اور نومولود کو بد روحوں اور حاسدوں کے شر سے پاک رکھنے کے لیے اس کمرے کے در و دیوار پر مختلف مقامات پر نیلے رنگ سے کراس (X) کے نشانات لگائے جاتے ہیں ۔ بچے کی دونوں ہتھیلیوں میں نیل چھڑکتے ہیں اور پنگھوڑے کے پایوں پر نیلے رنگ سے نشانات لگائے جاتے ہیں یا نیلا ربن باندھ دیا جاتا ہے ۔ (۱۰)

اگر نیلا رنگ قدرے پھیکا گدلا اور سلیٹی مائل ہو تو یہ نفسیاتی طور پر مفلسی کی ترجمانی کرتا ہے اور ایسا رنگ پسند کرنے والے ذہنی یا نفسیاتی طور پر مفلس ہوتے ہیں ۔ چنانچہ ۱۸۹۹ء میں پیرس میں وارد ہونے کے بعد سپین کا مشہور مصور پبلو پکاسو انتہائی مفلسی سے دوچار ہوا تھا اور ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۵ء تک چھ برس کے لیے پکاسو پر Blue Period چھا گیا تھا ۔ جس دوران اس نے ہلکے اور سلیٹی مائل نیلے رنگوں میں تصاویر بنانا شروع کردی تھیں' حتیٰ کہ موضوعات کے اعتبار سے بھی پکاسو کا یہ دور معاشرے کے مفلس اور دھتکارے ہوئے لوگوں کو پینٹ کرنے کا دور تھا ۔ چنانچہ اس زمانے میں اس کے ہاتھوں فٹ پاتھ پر بیٹھے باجے بجانے

Marfat.com

والے' معاشرے سے خارج اور فقرا و غربا کے موضوعات پر بیشمار تصاویر تخلیق ہوئیں ۔ یہ اس کی غربت کا اس پر نفسیاتی اثر تھا ۔ ۱۹۰۶ء میں امیرزادی اولگا سے شادی ہوجانے کے بعد غربت کا یہ طلسم ٹوٹا اور اس کے بعد پکاسو پر Pink Period یا Rose Period آتا ہے جو خوشحالی کا رنگ ہے ۔

سبز رنگ

سبز رنگ آنکھوں اور بینائی کے لیے انتہائی خوشگوار اور صحت مند رنگ ہے ۔ پھیلے ہوئے سبزہ زاروں کو دیر تک دیکھتے رہنے سے بینائی پر اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ خصوصاً گنبد خضرا کا کھلا کھلا خوشگوار سبز رنگ مسلمانوں کے لیے تو گویا قابل عبادت ہے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا دوسرا پسندیدہ رنگ بھی سبز رنگ تھا۔ یہ اعصاب کی تھکن دور کرتا ہے' ٹینشن دور کر کے الجھے ذہن کو سکون بخشتا ہے اور ذہن پر تازگی اور مثبت اثرات چھوڑتا ہے۔ بینائی کو بڑھانے کی وجہ سے عموماً معروف جاپانیوں کی زندگی میں ایک بہت بڑی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ٹوکیو اور اوساکا جیسے پرشور بڑے شہروں سے نکل کر شمالی جزیرے ہوکائیڈو میں آٹھ دس روز گذاریں اور صرف دور تک پھیلے ہوئے سبز میدانوں کو گھورتے رہیں اور موقع میسر آنے پر بہت سے جاپانی سچ مچ ایسا ہی کرتے ہیں ۔

سبزہ زاروں اور نباتات سے سبز رنگ کو ایک خاص مناسبت ہے۔ اس لیے دنیا بھر میں اس رنگ کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ۔ چنانچہ اردو ادب میں بہت سے ایسے استعارے ہیں جن سے سبز رنگ کی قدرومنزلت ظاہر ہوتی ہے یعنی سبز پوش (بزرگ ہستی) سبز پرندہ (خوشخبری لانے والا)' سبز گنبد (گنبد خضرا) اور مزاروں پر کی سبز چادریں۔

اسی قدر و منزلت کی مناسبت سے سبز رنگ کو احتراماً جوتوں میں استعمال نہیں کیا جاتا اور بلوچی ادب میں قدم اور سبز کا اکٹھے استعمال یعنی سبز قدم منفی معانی کا حامل ہے ۔ اس کا مطلب ناکامی ہے ۔ یعنی سبز قدم شخص دراصل سبزی جیسی پاک شے کو روندتا چلا آرہا ہے' اس لیے ناکام ہے۔ (۱۱) چنانچہ اس میں بھی بلاواسطہ تقدس ہی پنہاں ہے ۔ حالانکہ اور کئی مقامات پر بلوچی ادب میں سبز مبارکباد اور اچھے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، مثلاً اسے محبت، خوشحالی" فارغ البالی' آسودگی' صحت و توانائی کا رنگ سمجھا جاتا ہے۔ بلوچی ادب میں محبت کا پیامبر قاصد پرندہ ہمیشہ سبز رنگ کا ہوتا ہے۔ بلوچی میں سانولے اور سانولی کو پیار سے سوز کہا جاتا ہے سوز کے معنی سبز ہیں ۔ محبوبہ کے لیے سوزیں کہنی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ بلوچ خواتین کا پسندیدہ لباس' خصوصاً خوشی کے مواقع پر سبز ہوتا ہے ۔ اس رنگ میں انبساط کا عنصر بھی پایا جاتا ہے ۔

Marfat.com

اس لیے دعائیہ کلمات میں "سبز باتے" ایک فصیح و بلیغ دعا ہے۔ جس کے معنی ہیں پھلو پھولو، خوشحال رہو۔ (۱۲)

زمانہ قدیم سے تہذیبی دور میں سبز رنگ کے استعمال کے شواہد ملتے ہیں۔ اس کے مخصوص علامتی معانی ہیں اور اسے حسن و جمال کا مظہر گردانا جاتا تھا' مثلاً قدیم مصر میں ابتدائی فرعونی دور میں خواتین اپنی آنکھوں کی خوبصورتی بڑھانے کے لیے خوبصورت گہرے سبز رنگ کا پاؤڈر ان کے اردگرد لگاتی تھیں' جو چمکتے سورج کی تیز دھوپ سے ان کی آنکھوں کو تحفظ بھی دیتا تھا۔ چنانچہ ابتدائی Dynastic Period سے تقریباً ۳۰۰۰ ق م کی Narmer کی پلیٹ دریافت ہوئی ہے جو سلیٹ پتھر میں ہے اور اس پر ریلیف میں انسانی جانوروں اور پرندوں کی شبیہیں ابھار کر تراشی گئی ہیں ۔ اس کے ایک طرف Narmer کو کوبرا سانپ کا تاج پہنے دکھایا گیا ہے جو شکست خوردہ دشمن کو بالوں سے پکڑ کر گرز مارنے میں مصروف ہے اور پس منظر میں عقاب دیوتا بادشاہ کی مدد کے لیے موجود ہے۔ اس پر اور اس جیسی کئی اور پلیٹوں پر سبز رنگ کے پسینے کے آثار موجود ہیں۔ یہ وہی سبز رنگ ہے جو خواتین اپنی آنکھوں کے گرد لگاتی تھیں اور مکھیوں سے بچاؤ کی غرض سے خوب رگڑ رگڑ کر ملتی تھیں۔ (۱۳) سبز رنگ حسن و جمال کو ابھارتا ہے اسی مناسبت سے دنیا بھر میں خواتین کے لباس میں سبز رنگ فراخدلی سے استعمال ہوتا ہے ۔ مگر سرتاپا سبز رنگ میں رنگے جانے کی خواہش کا قدرے مطلب اور ہوتا ہے' خصوصاً لڑکیوں کے حوالے سے۔ ایسی لڑکیاں دنیا کے مسائل و مصائب سے فرار چاہتی ہیں اور یہ نہایت فارغ البالی اور لاابالی پن کی بھی علامت ہے ۔ ایسی خواتین ولیم ورڈز ورتھ کی مانند تہذیب سے گریزاں اور فطرت کی بے پناہ عاشق ہوتی ہیں ۔ اگر کوئی حسینہ اپنے کمرے میں ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک سبز رنگ کی اشیاء سجائے" یعنی سبز دیواریں سبز پردے، سبز لباس وغیرہ میں اسے گوشہ عافیت نظر آئے تو سمجھ لیں کہ کسی سبز پری نے دنیا کی مشکلات سے منہ موڑ کر راہ فرار اختیار کرلی ہے۔ کھلتا ہوا سبز رنگ آسودگی اور خوشحالی کی علامت ہے ۔ مگر بچھو جیسا سیاہی مائل گہرا سبز رنگ حسد کی علامت ہے اور اس کو پسند کرنے والا شخص کبھی دوستوں سے باوفا نہیں ہوسکتا۔ مگر خوبصورت سبز رنگ کا شخص بطور دوست قابل اعتماد اور پرخلوص ہوتا ہے' اگرچہ وہ قدرے لاابالی' غیر سنجیدہ اور کبھی کبھی غیر ذمہ دار بھی ہوسکتا ہے۔

پیلا رنگ

پیلا یا زرد رنگ بین الاقوامی طور پر بیماری، کمزوری، نقاہت یا بزدلی کی علامت ہے ۔ امریکہ میں داخل ہوتے وقت پیلے رنگ کا میڈیکل کارڈ دیا جاتا ہے ۔ اس رنگ کو اسپتالوں اور

Marfat.com

مریضوں کے ساتھ خاص مناسبت ہے ۔ جاپان میں اسپتال میں داخل ہوتے وقت پیلے رنگ کے سلیپر پہننے پڑتے ہیں ۔ پلیگ کو پیلا بخار کہتے ہیں ۔ زرد صحافت کے معانی بھی منفی لیے جاتے ہیں ۔ بعض اوقات یہ ناپسندیدگی کی علامت کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے، یعنی پیلا ربن باندھ کر کسی کو دعوت نامہ دینا اُسے ناپسند کرنے کے مترادف ہے ۔ اردو ادب میں منفی رجحانات کے ساتھ یہ رنگ استعمال ہوتا ہے' مثلاً پیلا پڑجانا۔ پیلاہٹ وغیرہ۔ پیلے رنگ سے کمزوری کو بھی ظاہر کرتے ہیں ۔ جاپان میں کسی ہیوی ٹریفک والی سڑک کو عبور کرنے کے لیے اسکول کے چھوٹے ناتواں بچے سڑک کے دونوں کناروں پر رکھی پیلے رنگ کی جھنڈی اٹھالیتے ہیں اور تمام گاڑیاں ایک لمحہ میں رک جاتی ہیں ۔ گویا ناتواں بچے کو مدد کی ضرورت ہے ۔

بلوچی ادب میں بھی پیلارنگ اظہار ناپسندیدگی اور عیب کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے مگر کبھی کبھی شاعری میں اچھے معنوں میں بھی نظر آ جاتا ہے، مگر بہت کم ۔ مثلاً ایک بلوچی شعر کا ترجمہ ہے :

جنگلوں میں سرخ سرخ بیر پک کر تیار ہوگئے ہیں ۔

ان میں کہیں کہیں زرد بیر بھی ہیں' بالکل جیسے محبوبہ کے آویزے ہوں۔ (۱۴) تاہم بلوچی ادب اور معاشرے میں پیلے رنگ کو عموماً ناپسندیدہ رنگ کے طور پر مانا جاتا ہے' مثلاً خواتین بچوں کو پیلے رنگ کے کپڑے پہنانے سے گریز کرتی ہیں ۔ خود بھی پیلے رنگ کا لباس شاذ و نادر ہی استعمال کرتی ہیں ۔ رنگدار لباس میں پیلے رنگ کا فقدان یا کمی ہوتی ہے ۔ مرد عموماً پیلے رنگ کا لباس زیب تن نہیں کرتے ۔

بلوچ ادب میں پیلے رنگ کے ساتھ منفی معنوں کے استعارے کافی تعداد میں ملتے ہیں' مثلاً زرد ترنگ (زرد پڑجانا)' ویم زردی (شرمندگی)' زردیں دیگر(وقت عصر سورج کا زوال)، زرد کاؤ(یرقان)۔ چنانچہ ایک جملے میں کہا جاسکتا ہے کہ وجدانی اور روحانی اعتبار سے بلوچوں کو پیلا رنگ ناپسند ہے اور یہی بات تقریباً تمام مسلمان معاشرے کے بارے میں کہی جاسکتی ہے ۔

اس رنگ کے نفسیاتی اثرات یہ ہیں کہ یہ ذہن کو تھکا دیتا ہے اور اس کے خلیات کو گہری نیند سلا دیتا ہے ۔ ہندومت میں خاص طور پر مذہبی رسوم کے لیے پیلے رنگ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔رانی مہارانیوں کے لیے سرتاپا پیلے رنگ میں ملبوس رہنا' جسم کے مختلف حصوں کو سونے میں پیلا کرلینا اور رسوم میں پیلے رنگ کے پرساد' پیلے رنگ کے ظروف استعمال کرنا اچھا بھی لگتا ہے اور ان کے مذہب کا ایک اہم جزو بھی ہے۔ سونے کے رنگ سے

Marfat.com

قریب ترین ہونے کی وجہ سے اردو ادب میں کم سہی مگر مثبت معنوں میں بھی پیلے رنگ کے استعارے موجود ہیں' مثلاً سونے میں پیلی ہونا' امارت اور خوشحالی کی علامت ہے۔ ہاتھ پیلے کرنا' بیٹی کو رخصت کرنا ہے۔

پیلا رنگ اندھیرے میں اور رنگوں کی نسبت دور سے بھی نظر آتا ہے۔ اسی اعتبار سے اس رنگ کو پسند کرنے والے انسان انتہائی دور اندیش اور موقع شناس ہوتے ہیں اور کئی سالوں پر محیط اپنی زندگی کی پلاننگ کرتے ہیں' اور اپنے دوست احباب کی توجہ حاصل کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ہمارے ہاں پیلا پتھر خوش بختی کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔ پیلا رنگ کہر دھند اور تاریکی میں بہت دور سے نظر آجاتا ہے۔ اسی لیے ٹریفک لائٹس عموماً پیلے رنگ کی ہوتی ہیں خصوصاً جو شہروں سے باہر کی ٹریفک ہو۔

اس رنگ کو پسند کرنے والے' خصوصاً خواتین صاف' ہموار اور متوازن ذہن کی حامل ہوتی ہیں۔ ہمارے ملک اور مذہب میں عموماً پیلے رنگ کو کم استعمال میں لایا جاتا ہے' اور خصوصاً مردوں کے لباس میں یہ استعمال نہیں ہوتا۔

یاد رہے کہ یہاں پیلے رنگ سے مراد وہ خوبصورت اور کھلتا کھلتا پیلا رنگ نہیں ہے۔ جو آنکھوں کو بھلا لگتا ہے اور روح کو زندگی بخشتا ہے اور جو پیلا رنگ ہم عموماً پھولوں میں دیکھتے ہیں' بلکہ یہاں مراد گھٹا پیلا' زردی مائل پیلا، گدلا پیلا اور خاکی مائل پیلا رنگ ہے۔ ایسے پیلے رنگ انسانی ذہن پر مثبت اثرات نہیں ڈالتے۔

اوپر ذکر کیے گئے یہ تمام وہ رنگ تھے جن کے اثرات' سوائے پیلے کے' انسانی ذہن پر مثبت ہوتے ہیں یا کم از کم منفی نہیں ہوتے۔ علاوہ ازیں بہت سے ایسے رنگ بھی ہیں جن کے اثرات منفی ہوتے ہیں' مثلاً جامنی رنگ انسان کو ڈیپریشن میں لے جاتے ہیں اور اس کو پسند کرنے والے لوگ بھی اعصابی ڈیپریشن کا شکار ہوتے ہیں۔ کیمل کلر اور ہلدی کی مانند پیلا رنگ انسان کے ذہن کو سست کر دیتا ہے۔ گدلا مٹیالا رنگ' گدلا نسواری رنگ اور خاکی رنگ بھی ذہن کو سست اور کاہل بنا دیتے ہیں اور ذہن کے خلیات کو سلانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ بھورے اور سلیٹی مائل گدلے رنگ بھی انسانی ذہن کے لیے خواب آور گولیوں سے کم نہیں ہوتے۔ سب سے زیادہ نقصان دہ گدلا پیلا رنگ' سلیٹی' سلیٹی مائل گدلا سبز رنگ' خاکی' گدلا نیلا' اور براؤن کے تقریباً تمام شیڈز ہیں۔ یہ رنگ انسان کی قوت ارادی قوت مدافعت' جذباتی ابال اور ذہنی طاقت کو آہستہ آہستہ سلب کر لیتے ہیں اور ایک ایسا وقت بھی آتا ہے' جسے اقبال نے خوبصورت الفاظ اور عمدہ انداز میں کیا خوب بیان کیا ہے:

Marfat.com

چشم آدم سے چھپاتے ہیں، مقاماتِ بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ، بدن کو بیمار

اب آیئے اس سب سے اہم نکتے کی طرف کہ وہ کونسا میکانزم ہے جس کے ذریعے رنگ انسان کے دماغ تک پہنچتے ہیں اور اس کے خلیات پر مثبت یا منفی اثرات مرتب کرتے ہیں اور اس کو اسقدر متاثر کرتے ہیں کہ کسی انسان کی شخصیت کا اہم حصہ بن جاتے ہیں؟ ہوتا دراصل یوں ہے کہ سورج کی شعاؤں کی وجہ سے کائنات میں پھیلے ہوئے رنگ پردہ بصارت کو متاثر کرتے ہیں۔ حس بصارت (Optic Nerve) پردۂ بصارت کا دماغ کے سب سے اہم حصے Hypothalamus کے ساتھ تعلق پیدا کرتی ہے اور اس حس کو دماغ تک لے جاتی ہے۔ چنانچہ Hypothalamus جو Neurohumours چھوڑتا ہے اُن کے ذریعے Pituitary Gland کو متاثر کرتا ہے۔ یہ چھوٹا سا گلینڈ جو Hypothalamus کے عین نیچے واقع ہے (مگر دماغ کا حصہ نہیں) انسانی جسم کے تقریباً تمام بڑے بڑے نظاموں (میکانزمز) کو کنٹرول کرتا ہے۔ یہ نو قسم کے ہارمونز چھوڑتا ہے جن میں Growth Hormones اور Gonadotrophic Hormones جیسے اہم ہارمونز بھی شامل ہیں۔ یہیں سے انسان کی شخصیت بننا شروع ہوجاتی ہے۔ چنانچہ جو ساخت اور رنگ انسان پیدا ہونے کے فوراً بعد سے دیکھنا شروع کردیتا ہے وہ اس کی شخصیت کو متاثر کرتے رہتے ہیں اور پھر ایک ایسا وقت بھی آجاتا ہے کہ وہ مخصوص ساخت اور رنگ اس کی شخصیت کا مستقل حصہ بن جاتے ہیں اور وہی اس کے پسندیدہ رنگ کہلاتے ہیں اور انہیں کے مطابق اس کی شخصیت ڈھل چکی ہوتی ہے۔ یاد رہے کہ ہر رنگ کی حس جداگانہ نوعیت کی حامل ہے۔ اس لیے انسان کے پسندیدہ رنگ کی مخصوص حس Hypothalamus پر مستقل طور پر مخصوص اثرات چھوڑتی رہتی ہے۔ اُدھر اس مخصوص رنگ کی حس سے اعصاب بھی ایک مخصوص نوعیت میں ڈھلتے جاتے ہیں اور بالآخر ایک مخصوص ردِّعمل کے عادی ہوجاتے ہیں۔ اس ضمن میں رنگوں کی طول موج کو بھی خاصی اہمیت حاصل ہے۔ یہ طول موج سب برابر نہیں ہوتیں، بلکہ ان کی لمبائی، کم لمبائی اور زیادہ لمبائی ہی اعصاب پر جداگانہ طریقے سے اثرانداز ہوکر ایک مخصوص قسم کی حس پیدا کرنے کا موجب بنتی ہیں۔ جب ایک انسان کسی مخصوص رنگ کو بقایا رنگوں پر ترجیح دیتا ہے تو وہ خود کو اور اپنے ماحول کو زیادہ تر اسی رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کے اعصاب اور ان کے زیر اثر Hypothalamus ایک مخصوص اثر کے عادی ہو جاتے ہیں اور یوں وہ رنگ اس کی شخصیت اور نفسیات پر اثر انداز ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی شخصیت اور ذہنی کیفیت

Marfat.com

کے مطابق ہی تمام کائنات کو دیکھتا ہے اور محسوس کرتا رہتا ہے۔ اس نقطے پر پہنچ کر ہم یہ بخوبی سمجھ چکے ہوں گے کہ مختلف رنگوں کو پسند کرنے والے اشخاص اس کائنات کو نہایت مختلف انداز میں دیکھتے ہوں گے۔ چنانچہ اگر ایک شخص کو یہ کائنات بنیادی طور پر پیلی نظر آتی ہے اور دوسرے کو سرخ تو یہ محض ان کی پسند ہی کا فرق نہیں' بلکہ ان کے دماغ، ان کی Optic Nerve ان کے Hypothalamus کے خلیات اور اُن کی Pituitary Glands تمام بالترتیب پیلے اور سرخ رنگ اور ان کی طول موج سے متاثر Entities بن چکے ہوتے ہیں۔

مآخذ

(۱) فلم ''نائٹ آف دی جنرلز'' نیز: عطاالحق قاسمی، ''ہنتے' بولتے اور چہچہاتے رنگوں کے مصور''، نوائے وقت مڈویک ایڈیشن، ۱۵ جنوری ۱۹۸۵ء

(۲) گارڈنر لوئیس' آرٹ تھرو دی ایجز' ہارکورٹ' براس اینڈ ورلڈ انکارپوریشن' نیویارک' ۱۹۲۰ء، ص ۹۶-۶۹۳

(۳) ایضاً ' ص ۱۹۳' پلیٹ ۲' ۶

(۴) عابد حسین قریشی' ''تاریخ پاک وہند کا خونریز مگر باعث فخر باب'' قسط ۱، پیغام بیداری کا عجیب علامتی انداز' محور' کوئٹہ' مئی ۲۰۰۲ء' ص ۴۶-۴۵

(۵) یوسف حسین خان' روح اقبال' آئینہ ادب' لاہور' ص ۴۱-۴۴۰

(۶) عابد حسین قریشی' ''بلوچ قوم میں رنگوں کی بصیرت''، امروز' جمعہ میگزین' ۳۱ مئی ۱۹۹۱ء' ص ۸

(۷) ایضاً ' ص ۸

(۸) ایضاً' ص ۹

(۹) ایضاً

(۱۰) ایضاً

(۱۱) ایضاً

(۱۲) ایضاً

(۱۳) گارڈنر لوئیس' آرٹ تھرو دی ایجز' ص ۶۴

(۱۴) عابد حسین قریشی' ''بلوچ قوم میں رنگوں کی بصیرت'' ص ۹

☆☆☆

Marfat.com

زیاراتِ شام

حافظ افتخار احمد قادری☆

سرزمینِ شام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شہر تجارت، عظیم انبیاءؑ، اہلبیت اطہار، صحابہ کرامؓ اور اولیاءاللہ کا مسکن و مدفن ہے۔ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور بیت المقدس کے بعد احادیثِ مبارکہ میں اگر کسی سرزمین کے فضائل ملتے ہیں تو وہ سرزمین ''ملک شام'' ہی ہے۔ یہی وہ جگہ ہے کہ جس کے لیے آپؐ نے بے شمار دعائیں کیں اور جس کی طرف آپؐ نے متعدد سفر فرمائے۔ نبوت سے پہلے آپؐ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کا مال تجارت لے کر اس سرزمین کی طرف سفر فرماتے ہیں۔ ملک شام کی طرف آپؐ کا یہ دوسرا سفر ہے۔ پہلا سفر آپؐ نے بچپن میں اپنے پیارے چچا حضرت ابو طالبؓ کے ہمراہ فرمایا تھا۔ اسی سفر میں مقام بُصریٰ پر بُحیرا نامی راہب جو آپؐ کے انتظار میں ایک کلیسا میں مقیم تھا اور بوقت ملاقات جب اس نے آپؐ میں نبوت کی تمام نشانیاں دیکھیں تو حضرت ابو طالبؓ سے فرمایا کہ اس بچے کو واپس لے جاؤ اور اس کی حفاظت کرو کیونکہ یہ بڑی عظمت اور شان والا بچہ ہے۔ ''بُصریٰ الشام'' میں اس کلیسا کے بقیہ آثار اور بحیرا راہب کا کمرہ ابھی تک ان ملاقاتوں اور یادوں کو اپنے سینے میں محفوظ کیے ہوئے ہے اور جس مقام پر آپؐ کی اونٹنی نے آرام کیا تھا اُس بابرکت مقام کو ''مبرک الناقۃ'' کے نام سے ایک جامع کے اندر محفوظ کردیا گیا ہے۔

سرزمین شام کی فضیلت کے بارے میں آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ملک شام اللہ تبارک و تعالیٰ کے پسندیدہ بقعات (سرزمینوں) میں سے ایک ہے۔ اسی طرح حضرت ابوذرؓ کی ایک روایت کے مطابق نبی پاکؐ نے شام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ حشر ونشر کی سرزمین ہے۔ سرکار دو عالمؐ کا ارشاد مبارک ہے اللھم بارک فی شامنا و یمننا (کہ اے اللہ ہمارے شام اور یمن میں برکت عطا فرما)

اہل شام کو بُرا مت کہو

حضرت عوف بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ اہل شام کو بُرا مت کہو کیونکہ میں نے

☆ A-6، گلی نمبر 9، افشاں کالونی، راولپنڈی

Marfat.com

نبی پاکؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ شام میں ابدال ہیں جن کی وجہ سے تمہیں رزق ملتا ہے اور تمہاری مدد ہوتی ہے۔

ایک موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ملک شام میں چالیس ابدال ہوں گے جن میں سے کوئی فوت ہوگا تو اللہ تبارک و تعالیٰ اس کے بدلے اور مقرر فرما دیں گے۔ انہی ابدال کی وجہ سے بارش ہوگی اور انہی کی وجہ سے دشمنوں پر فتح حاصل ہوگی۔ نبی اکرمؐ کے وصال کے بعد کئی صحابہ کرامؓ اور اہل بیت اطہارؑ اس سرزمین میں جلوہ افروز ہوئے۔ کئی انبیاء سابقین کے مزاراتِ مقدسہ بھی اسی سرزمین میں ہیں۔ بے شمار بزرگان دین اور اولیائے عظام نے اس خطہ کو اپنا مسکن و مدفن بنایا۔ انہی عظیم اور مبارک ہستیوں کے مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے لیے ہمیں بھی اس سرزمین کے پانچ شہروں دمشق، بُصریٰ الشام، حمص، حماہ اور جبلہ میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ اب ترتیب وار ان شہروں میں جن جن مقامات پر حاضری ہوئی ان کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں۔

دمشق

مزارِ مبارک سیدہ زینب بنت علیؑ: یہ مقام مدینہ شہر سے تقریباً پندرہ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے اور سّت زینب کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت سیدہ زینبؓ عظمت اور صبر و تحمل کی پیکر وہ خاتون ہیں کہ جنہوں نے کربلا کا خونی میدان اپنی آنکھوں سے دیکھا اور یزید کے دربار میں ایسی تقریر کی جس کے الفاظ رہتی دنیا تک کتابوں میں محفوظ رہیں گے۔

مزار مبارک سیدہ رقیہؓ: مقبرہ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ سے تھوڑا آگے ایک گلی میں شہید کربلا کی کمسن صاحبزادی حضرت رقیہؓ کا مزارِ پر انوار ہے۔ آپؓ میدان کربلا سے بیماری کی حالت میں واپس لوٹیں اور آپؓ کا انتقال دمشق میں ہوا۔ انتہائی خوبصورت اور پُر کیف مزار ہے۔

مزارات مبارکہ سیدہ ام کلثوم و سیدہ سکینہؓ: یہ دونوں مزاراتِ مبارکہ قبرستان باب الصغیر میں واقع ہیں۔ سیدہ ام کلثومؓ حضرت امام علیؑ کی صاحبزادی تھیں اور سیدہ سکینہ حضرت امام حسینؑ کی صاحبزادی جو سانحہ کربلا میں اپنے بابا کے ساتھ تھیں۔

امہات المؤمنین کی قبور مبارکہ: مذکورہ بالا قبرستان میں دو الگ کمروں میں آنحضرتؐ کی دو ازواج مطہرات سیدہ ام سلمہؓ اور سیدہ ام حبیبہ کی قبور مبارکہ ہیں۔

سولہ شہداء کربلا کے سر مبارک: ایک خوبصورت کمرہ میں سولہ شہداء کے سر مبارک ہیں جو کہ عبداللہ بن زیاد نے یزید کے پاس بھیجے تھے۔ دروازے کے اوپر جو عربی عبارت لکھی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے "اس مقام پر سولہ شہداء کے سر مدفون ہیں جنہوں نے یوم کربلا حضرت

Marfat.com

امام حسینؓ کے ساتھ جام شہادت نوش فرمایا۔"

حضرت بلال حبشیؓ کا مزار: دربارہ نبویؐ میں حضرت بلال حبشیؓ کا جو مقام تھا اس سے کون واقف نہیں۔ اس عظیم مؤذنِ رسول کا مزار مبارک قبرستان باب الصغیر میں ہے جس کے اوپر سبز رنگ کا چھوٹا سا گنبد بنا ہوا ہے۔ اس مقام پر حاضری دینے سے قلبی سکون حاصل ہوتا ہے۔

مزارِ مبارک سیدنا شرجیلؓ اور سیدہ خولہؓ: باب تومہ کے مقام پر سڑک کے کنارے ایک چھوٹے سے باغ میں یہ دو خوبصورت مزارات مبارکہ ہیں۔ سیدہ خولہ وہ عظیم صحابیہ اور مجاہدہ ہیں جو گھوڑے پر سوار ہو کر ہرقل روم کے لشکر میں گھس گئیں اور ایک عیسائی جرنیل تومہ کو قتل کر دیا۔

سیدنا معاذ بن جبلؓ: مدحت پاشا بازار میں مسجد معاذ بن جبلؓ ہے جس کے ایک کمرے میں اس عظیم صحابی رسولؐ کا مزار مبارک واقع ہے۔

ابی بن کعب الانصاریؓ: باب شرقی میں سڑک کے پار دو گنبد اور مینار نظر آتے ہیں ایک گنبد کے نیچے حضور اکرمؐ کے یہ محبوب قاری ومفسر آرام فرما ہیں۔

مسجد اموی اور اس کے مقامات مبارکہ

مزار نبی یحییٰؑ: مسجد اموی کے اندر عین درمیان میں آپ کا مزار مبارک دکھائی دیتا ہے جس کے اوپر ایک چھوٹا سا گنبد بنا ہوا ہے اور چاروں طرف جالی لگی ہوئی ہے۔

مقام رأس امام حسینؓ: مسجد کے ایک جانب کونے میں ایک چھوٹے سے کمرے کے اندر شہید کربلا حضرت امام حسینؓ کا سرمبارک مدفون ہے۔ ساتھ ایک مسجد ہے جسے امام زین العابدینؓ کے ایام اسیری کے دوران آپ کی عبادت گاہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔

سلطان نور الدین زنگیؒ: سُوق حمیدیہ سے پہلے ایک بازار "سُوق الخیاطین" کے نام سے آتا ہے۔ اس بازار کے عین درمیان میں دائیں جانب ایک کمرے میں عظیم سلطان نورالدین زنگیؒ آرام فرما ہیں۔ یہ وہی سلطان ہے جس نے مدینہ منورہ میں گستاخ رسول نصرانیوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے بعد حجرۂ نبویہ کے اردگرد پانی کی تہہ تک سیسہ پلائی ہوئی دیوار تعمیر کروائی تھی۔

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ: مسجد اموی سے چند فرلانگ کے فاصلے پر اس مرد مجاہد کا مزار پرانوار ہے جس نے بیت المقدس کو آزاد کروایا۔ اے مرد مجاہد تیری شجاعت اور عظمت کو سلام!

Marfat.com

شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ: جبل قاسیون کے اردگرد پھیلی ہوئی آبادی کا نام ''میدان شیخ'' ہے۔ اسی مقام پر آپ کا خوبصورت و پُرکیف مزار مبارک ایک تہہ خانے میں واقع ہے۔ آپ کے پہلو میں آپ کے دو صاحبزادوں کی قبور مبارکہ ہیں۔

اس کے علاوہ بھی دمشق میں کئی مقامات مقدسہ موجود ہیں جن کی زیارت کی جاسکتی ہے۔ منجملہ حضرت ابوہریرہؓ کا مزار مبارک بھی دمشق کے کورڈ بازار ''سوق حمیدیہ'' میں واقع ہے۔

حمص

حمص ملک شام کا قدیم، تاریخی اور خوبصورت شہر ہے جو دمشق سے ۱۵۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اسی شہر میں اسلام کے وہ عظیم سپہ سالار آرام فرما ہیں جنگ موتہ کے موقع پر اسلامی لشکر نے دشمن کی فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا حضرت زیدؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت عبداللہؓ جان توڑ کر لڑے اور بے شمار زخم کھا کر باری باری شہید ہوگئے۔ حضرت سیدنا خالد بن الولیدؓ نے جھنڈا اپنے ہاتھ میں لیا اور ایسی بہادری اور دلیری سے لڑے کے دشمن کو پیچھے دھکیل دیا۔ اسی لڑائی میں آپ کے ہاتھ سے نو تلواریں ٹوٹیں۔اس کے علاوہ بھی حضرت خالد بن الولیدؓ بے شمار جنگوں میں شامل ہوئے۔ آپ کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جس پر تیر، تلوار یا نیزے کے زخموں کے نشان نہ ہوں۔ آپ ہر جنگ میں شہادت کی خواہش لے کر شریک ہوتے لیکن آپ کو شہادت نصیب نہ ہوسکی۔ حضرت خالد بن الولیدؓ کے مزار مبارک اور مسجد کے گنبد اور مینار دور ہی سے نظر آنے شروع ہوجاتے ہیں۔ مسجد میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب ایک گوشے میں آپؓ کا مزار مبارک ہے جس کے اوپر ایک خوبصورت گنبد بنا ہوا ہے اور مزار مبارک کے اردگرد پیتل کی خوبصورت جالی لگی ہوئی ہے۔ آپ کے ساتھ آپ کے فرزند حضرت عبدالرحمٰن بن خالدؓ بھی آرام فرما ہیں۔ آپؓ کے مزار مبارک کے بالمقابل بائیں گوشے میں سیدنا عبیداللہ بن عمرؓ استراحت فرما ہیں۔ ہم اس عظیم سپہ سالار اور صحابی رسولﷺ کی خدمت اقدس میں بھی سلام کے لیے حاضر ہوئے۔ سب سے پہلے مزار مبارک پر ایک خوبصورت چادر کا نذرانہ پیش کیا، پھر بیٹھ کر محفل نعت منعقد کی اور جب قصیدہ بردہ کا ذکر باآواز بلند شروع کیا تو مسجد میں موجود حضرات اس محفل میں شامل ہوکر ہمارے ساتھ ذکر کرنے لگے۔ ختم شریف اور اجتماعی دعا کروائی گئی جس میں کثیر تعداد میں لوگ شامل ہوئے۔ بعد میں امام و خطیب صاحب نے ہمارے لیے جائے نماز کا تحفہ ارسال کیا۔ محفل کے اختتام پر ان سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

Marfat.com

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ:

مسجد سیدنا خالد ابن ولیدؓ سے نکل کر ہم گاڑی میں سوار ہوئے اور کچھ فاصلے پر واقع مزار مبارک حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی زیارت کے لیے چل پڑے۔ چند منٹوں میں ہم مسجد سیدنا عمر بن عبدالعزیزؒ کے مرکزی دروازے پر پہنچ گئے۔ مسجد میں داخل ہو کر بائیں جانب ایک کمرے میں آپ کا مزار مبارک ہے۔ آپ کی خدمت اقدس میں سلام پیش کر کے ایک چادر کا نذرانہ پیش کیا۔ قارئین کرام، یہ وہی شخصیت ہیں جنہوں نے نبی پاکؐ کے حجرہ مبارکہ کی حفاظت کا ایسا انتظام کیا کہ وہ آج تک اپنی اصلی صورت میں موجود و محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ مدینہ منورہ کی دوسری تعمیرات کے حوالے سے بھی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ دنیا آپ کو فاروقِ ثانی اور خلیفہ پنجم کے نام سے بھی یاد کرتی ہے۔ آپ کے مزار مبارک کے قریب بیٹھ کر محفل نعت منعقد کی پھر اجتماعی دعا کے بعد تمام حاضرین سے ملے۔

شہر حماہ

حماہ بھی ملک شام کا ایک قدیم اور خوبصورت شہر ہے جو حمص سے تقریباً پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کے ایک پہاڑ کی چوٹی پر سیدنا امام زین العابدینؓ کا مقام ہے۔ دو بڑے بڑے گنبدوں میں سے ایک گنبد میں مسجد ہے اور دوسرے گنبد میں سیدنا امام زین العابدینؓ کا مقام بتایا جاتا ہے۔ اس مقام پر بھی حاضری کا شرف حاصل کیا۔ باہر ایک کنواں بنا ہوا ہے جس کی گہرائی زیادہ سے زیادہ سات، آٹھ فٹ ہوگی، مگر پانی انتہائی صاف ستھرا اور میٹھا ہے۔

حماہ شہر میں مسجد ابی الفداء قابل دید ہے۔ اسی مسجد کے دائیں جانب ایک کمرے میں ملک حماہ کی قبر ہے۔ اسی مسجد سے تھوڑا دور جا کر شاعر و عاشق رسولؐ حضرت حسان بن ثابتؓ کا مقام مبارک ہے جس کا دروازہ ہر وقت بند رہتا ہے۔ باہر ایک تختی لگی ہوئی ہے۔ جس پر لکھا ہوا ہے: ''مقام الصحابی الجلیل شاعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حسان بن ثابت الانصاریؓ''

جبلہ

جبلہ شہر کی ایک قدیم مسجد میں دین و دنیا کے بادشاہ حضرت سلطان ابراہیم بن ادھم کا مزار مبارک ہے۔ ابتداء میں آپ بلخ کے بادشاہ تھے ایک رات آپ اپنے محل میں محو خواب تھے کہ اچانک آدھی رات کے وقت آپکی آنکھ کھل گئی۔ معلوم ہوا کہ کوئی شخص چھت پر چل رہا ہے۔ اس سوال پر کہ تو کون ہے اور اس وقت یہاں کیا کر رہا ہے؟ اس نے کہا کہ میں اپنا گمشدہ اونٹ تلاش کر رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ شاہی محلات کی چھتوں پر

Marfat.com

اونٹ آجائیں۔ اس پر اس شخص نے جواب دیا تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ شاہی لباس پہن کر عیش و عشرت میں خدا مل جائے۔ اس بات سے آپ کے دل پر خوفِ الٰہی کا ایسا غلبہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آپ کی باطنی آنکھیں منور ہوگئیں اور برکاتِ الٰہی کا نزول ہونے لگا۔ چنانچہ آپ بادشاہی کو چھوڑ، فقیرانہ لباس پہن، شہر سے باہر جنگلوں میں نکل گئے۔ ایک غار میں نو سال تک عبادت و ریاضت میں مشغول رہے۔ جب لوگ آپ کے مرتبہ سے واقف ہوگئے تو آپ نے اس غار کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ ایک روایت کے مطابق جب آپ نے وفات پائی ہے تو ایک غیبی آواز سنی گئی کہ آگاہ ہوجاؤ کہ زمین کی امان نے آج وفات پائی۔ لوگ حیران تھے کہ وہ کون سی شخصیت تھی کہ اسی اثنا میں آپ کی وفات کی خبر مشہور ہوگئی۔

اس عظیم شخصیت اور کامل ولی کی خدمت میں حاضری کے لیے ایک طویل سفر طے کر کے جبلہ پہنچے۔ جمعۃ المبارک کا دن تھا اور نماز کا وقت بھی قریب تھا۔ وضو کے بعد مسجد میں داخل ہوئے مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔ ایک مقام پر نماز جمعہ ادا کی۔ نماز کے بعد آپ کے مزار مبارک پر حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ مختصر سی محفل کے بعد دعا کی اور کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد دمشق روانہ ہوگئے۔ قارئین، بحمداللہ ان تمام مقاماتِ مقدسہ پر حاضری کی سعادت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ میں ان مقامات مبارکہ کے تمام مناظر کو کیمرے کی نگاہ سے محفوظ کرتا رہا اور اب ان مذکورہ بالا مقاماتِ مقدسہ کو ایک تصویری البم بنام ''زیاراتِ شام'' پیش کرنے کا شرف حاصل کیا ہے۔ آرٹ پیپر کے ۱۱۲ صفحات پر ۱۲۰ عدد دیدہ زیب و دلکش خوبصورت رنگین تصاویر سے مزین یہ البم جو ایک نادر تصویری خزانہ ہے آپ مبلغ ۲۵۰ روپے کا منی آرڈر ارسال کر کے (A-6، گلی نمبر 9، افشاں کالونی، راولپنڈی) سے حاصل کر سکتے ہیں۔
آخر میں بارگاہ رب العزت میں دعا ہے کہ یا رب العالمین اپنے حبیب پاکؐ کے وسیلۂ جلیلہ سے ہمیں بھی اسی نظرِ خاص سے مستفیض فرما جو ان بزرگان پر رہتی ہے۔ آمین، بحق سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

☆☆☆

Marfat.com

"غالب کا ذوق تماشہ"

پروفیسر جمیل آذر☆

۱۹۹۷ء کو "غالب کے دوصد سالہ یوم پیدائش" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ غالب کا ذوق تماشہ ڈاکٹر وزیر آغا کے آٹھ گرانقدر مقالوں کا مجموعہ ہے جنہیں پروفیسر سجاد نقوی نے منتخب کیا اور اقبال اکادمی پاکستان نے غالب کے دوصد سالہ یوم پیدائش کے موقع پر شائع کرایا اور غالباً یہ پہلی کتاب ہے جو اس مناسبت سے اُسی سال منصۂ شہود پر آئی۔ اس کتاب کی اشاعت سے جہاں ڈاکٹر وزیر آغا کی غالب پسندی کا اظہار ہوتا ہے وہاں اہل پاکستان کی غالب دوستی کا بھی پتا چلتا ہے۔ غالب ان عظیم شعراء میں سے ہے جو زمان و مکان کی قیود سے ماوراء ہوتے ہیں اور جنہیں دنیا کے تمام اہل نظر خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

ان مضامین میں ڈاکٹر وزیر آغا نے غالب کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے فکر انگیز بحث کی ہے۔ وہ زندہ ہمیں میں وزیر آغا نے غالب کے ان پہلوؤں کو چھوا ہے جو انہیں اپنے وقت ہی میں نہیں بلکہ ہمارے وقت میں بھی عظیم شاعر بناتے ہیں۔ غالب بے پناہ لیاقت، ذہانت اور علمی استعداد کا مالک تھا۔ لوگ غالب کے وسیع مطالعہ اور بے پناہ لیاقت سے مرعوب ہوگئے تھے جس کے نتیجے میں ان کا رویہ غالب کی طرف حاسدانہ اور منتقمانہ ہوگیا تھا۔ غالب اتنا عظیم تھا کہ اس نے لوگوں کے جارحانہ حملوں کو خندہ پیشانی سے پسپا کردیا۔ چونکہ غالب انسانی نفسیات سے کماحقہ واقف تھا اس لیے جب ایک دشمن نے انہیں گمنام خط لکھا اور اس میں انہیں ماں کی گالی دی تو غالب مسکرا کہنے لگے "الو کو گالی دینی بھی نہیں آتی۔ بڈھے یا ادھیڑ عمر آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں تاکہ اس کو غیرت آئے، جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں کیوں کہ اس کو جورو سے زیادہ تعلق ہوتا ہے، بچے کو ماں کی گالی دیتے ہیں کہ ▪ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا۔" غالب کے کلام کو پڑھ کر عبدالرحمان بجنوری یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، وید مقدس اور دیوان غالب۔" ڈاکٹر وزیر آغا نے ان کے کلام اور شخصیت کے آئینہ میں غالب کو تازہ اور زندہ شاعر کے طور

☆بی۔۴۔۸۷۲، سیٹلائیٹ ٹاؤن، راولپنڈی

Marfat.com

پر دیکھا ہے، وہ لکھتے ہیں:'' غالب کی عظمت کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ وہ بیک وقت ماضی، حال اور مستقبل کے شاعر ہیں اور اس لیے ہر زمانے کو غالب میں اس کا اپنا عکس نظر آتا ہے۔''

غالب کو اپنے زمانے میں اس لیے مخالفت اور مخاصمت کا سامنا کرنا پڑا کہ وہ اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہوگیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو عندلیب گلشن نا آفریدہ سمجھتا تھا۔ غالب وقت کی زنجیروں سے آزاد، ماضی کے لاشعور سے سرشار، حال کی معاشی و سیاسی بدحالی سے واقف، اور مستقبل کے شعری یوٹوپیا کا معمار تھا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے غالب کے ان پہلوؤں کی روشنی میں انہیں زندۂ جاوید شاعر کے طور پر دیکھا اور پرکھا ہے۔

غالب کا ذوقِ تماشہ میں وہ ان کے اس مزاج کی نشان دہی کرتے ہیں جو زندگی میں بھرپور شرکت وشمولیت کا حامل ہے۔غالب زندگی کا بیک وقت تماشائی بھی ہے اور خود اس میں بھرپور شرکت کرکے اپنا ہی تماشا بھی دیکھتا ہے۔ وہ فقیروں کا بھیس بدل کر تماشائے اہلِ کرم کا نظارہ کرنے کا فن جانتا تھا۔ غالب نے زندگی کو اس کے حسن و قبح اور اُس کی مسرتوں اور دکھوں میں بھرپور شرکت کرکے کلی طور پر قبول کیا۔ وہ دہری بصیرت کا حامل انسان تھا جو مشکلوں کو بھی اپنے لیے آسان بنالیتا تھا:

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

ڈاکٹر وزیر آغا نے غالب کے کلام سے متعدد اشعار پیش کرکے یہ ثابت کیا ہے کہ غالب نے زندگی کے تماشا میں دل و جان سے شرکت کی۔ بحیثیت تماشائی غالب کا ڈھنگ نرالا ہے۔ اس نرالے ڈھنگ کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:'' غالب کی خوبی یہ ہے کہ وہ تماشا میں خود کو یکسر ضم کرنے کے باوجود ایک '' تیسری آنکھ'' سے اپنے اس عمل کا نظارہ بھی کرتا ہے اور یوں انبوہ سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ غالب کا یہ رجحان زندگی کی نفی سے روح تک پہنچنے کا عمل نہیں بلکہ زندگی کی سچائی کو قبول کرکے روحانی رفعت کی تحصیل کا عمل ہے جو صوفی کی بجائے فن کار کو حاصل ہوتا ہے۔''

ہوں میں بھی تماشائی نیرنگ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آئے
بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

وزیر آغا اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ غالب کو''ہمہ وقت اپنے تماشا بننے کی حیثیت کا عرفان بھی

Marfat.com

حاصل رہتا ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ۔"

"غالب کی آوارہ خرامی" والے مقالے میں ڈاکٹر وزیر آغا نے غالب کی سیماب آسا بیقرار روح کو منعکس کیا ہے۔ غالب ہمہ وقت اپنی مادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے سفر میں رہا۔ آگرہ میں پیدا ہوا، دہلی میں پروان چڑھا، میرٹھ، مراد آباد ہوتے ہوئے رام پور پہنچا، دہلی سے کلکتہ کا سفر ایک ماہ کی بجائے دس ماہ میں طے کیا۔ کیونکہ راستے میں لکھنؤ جانے کا شوق چرایا۔ یوں لکھنو میں مقیم رہنے کے بعد کلکتے روانہ ہوگئے، لیکن کلکتہ سیدھے نہیں گئے۔ لکھنؤ سے کانپور اور کانپور سے باندہ پھر الہ آباد اور وہاں سے بنارس اور یہاں سے کلکتہ پہنچے۔ عجب مرد آزاد تھا! دراصل فطری طور پر غالب سیر و سیاحت کا شوقین تھا۔ کلکتہ سے لوٹ آنے کے بعد رام پور اور میرٹھ کا سفر اختیار کرلیا۔ اور تو اور اُسے تو مصر ایران اور بغداد جانے کی تمنا بھی رہی۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے نہایت دلچسپ پیرائے میں ان کے ذوق سفر کو اپنے اس مضمون میں اجاگر کیا ہے۔ انہوں نے غالب کے کلام کے حوالہ سے بھی یہ ثابت کیا ہے کہ ان کے اشعار میں جو تشبیہات، استعارات اور تخیلات کے ہیولے تعمیر ہوتے ہیں اس سے بھی پتا چلتا ہے کہ ان کی بیقرار روح کس قدر آوارہ خرامی کی طرف مائل تھی۔

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

غالب کی آوارہ خرامی نہ صرف ان کی گوشت پوست کی زندگی سے مترشح ہوتی ہے بلکہ ان کے تخیل کی دنیا میں بھی بھرپور انداز میں جلوگر ہوئی ہے۔ وزیر آغا نے چغتائی کے حوالے سے بھی ثابت کیا ہے کہ کس طرح غالب کے تخیل میں حرکی عناصر کا غلبہ ہے۔

"غالب ایک جدید شاعر" میں ڈاکٹر وزیر آغا نے بتایا ہے کہ غالب ہر لحاظ سے جدید شاعر ہے جو ہمارے دور کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور روشن مستقبل کی نوید بھی دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں: "غالب کے اشعار آج کے ذہن کو مطمئن کرتے ہیں کہ وہ حال سے منسلک ہونے کے علاوہ مستقبل سے بھی مربوط ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں آج کا انسان کھڑا ہے۔" غالب اس لیے بھی جدید ہے کہ وہ " آج کے حساس فرد کی طرح اپنی ذہنی اور جذباتی صلاحیتوں سے واقف تھا اور اپنی طباعی اور جدت طراز طبیعت کا عرفان رکھتا تھا، نیز قدم قدم پر اپنے ماحول کے انجماد اور افراد کی بھیڑ چال میں اثبات ذات کا اظہار کرنے پر خود کو مجبور پاتا تھا۔"

وہ انبوہِ کثیر میں اپنی انفرادیت کا حامل شخص تھا۔ اس کی شاعری بھی اپنے وقت میں

Marfat.com

منفرد نوعیت کی تھی۔ اسی لیے وہ عام شاعروں کی تضحیک کا نشانہ بھی بنا۔ اس کی شاعری فرد کو شخصیت کی تنگنا سے آزاد کر کے ماحول کی مختلف لہروں سے روشناس کراتی ہے۔ جو فرد کے تخیل کو وسیع تر دنیا سے ہمکنار کرتی ہے۔ غالب کی شاعری بیسویں ہی نہیں اکیسویں صدی کے باشعور فرد کو بھی فکری، تخیلی اور حسیاتی اعتبار سے مطمئن کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے غالب کے کلام کے شواہد سے ثابت کیا ہے کہ کن وجوہات کی بنا پر غالب ایک جدید شاعر ہے جو اپنے وقت میں عندلیب گلشن نا آفریدہ کے طور پر جلوہ گر ہوا تھا۔ فکری لحاظ سے یہ مضمون نہایت عمدہ اور دلپذیر ہے۔

"غالب کے بارے میں ایک سوال" میں ڈاکٹر صاحب نے سلیم احمد کے حوالہ سے بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ غالب کی انفرادیت پسندی مغربی تہذیب کے اثرات کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ وہ ایک ایسا نابغۂ روزگار شخص تھا جو بطور واقع وقت کی آندھیوں اور موسم کی تبدیلیوں کے باوجود رونما ہو کر رہتا ہے۔ وزیر آغا کہتے ہیں: "غالب وہ آؤٹ سائیڈر ہے جو شہاب ثاقب کی طرح تہذیب کے افق پر گاہے گاہے نمودار ہوتا ہے اور پھر اُسے بدل کر رکھ دیتا ہے... اور شاعری میں غالب ایک دھماکے کے ساتھ نمودار ہوا" ڈاکٹر وزیر آغا نے غالب کو حالات کی پیداوار نہیں بلکہ فطرت کی پیداوار کے طور پر جانا ہے۔ بالکل جس طرح گوتم بدھ اور گورونانک اس سماج میں آؤٹ سائیڈرز کی طرح آئے اور انہوں نے سماج کو بدل کر رکھ دیا۔ چنانچہ وزیر آغا کہتے ہیں: "لہذا غالب کا معنوی سلسلۂ نسب ان عظیم آؤٹ سائیڈرز سے جا ملتا ہے جو وقتاً فوقتاً برصغیر کے معاشرے میں نمودار ہوتے رہے اور اس "مغربی تہذیب" سے بالکل نہیں ملتا جو غالب کے زمانے کے بعد اس برصغیر میں مثل ایک بلائے ناگہانی نازل ہوئی۔

"کلام غالب: شخصیت کے آئینے میں" میں ڈاکٹر صاحب نے ہماری توجہ اس طرف مبذول کی ہے کہ غالب کے کلام معنی آفرین میں اس کی مادی زندگی پوری طرح منعکس ہوئی ہے۔ جو کچھ غالب اپنی عام زندگی میں تھا وہی کچھ وہ اپنے کلام میں بھی نظر آتا ہے۔ یوں اس کے کلام اور زندگی میں یکجہتی و ہم آہنگی ہے۔ اسی لیے غالب کی شخصیت میں تضاد، تصنع اور ریاکاری نہیں ہے اور نہ ہی اس کے کلام اور زندگی کے مابین کوئی خلیج حائل ہے۔

"غالب اور فیض" اس مقالہ میں ڈاکٹر وزیر آغا نے غالب اور فیض کے یہاں جہاں اختلافی پہلوؤں کو گرفت میں لیا ہے وہاں ان کے مشترک صفات کی بھی نہایت خوبصورتی سے نشان دہی کی ہے۔ اسی طرح "غالب اور تصوف کی روایت" میں وزیر آغا نے بتایا ہے کہ جہاں غالب کی شاعری میں مروجہ صوفیانہ تصورات ملتے ہیں وہاں ان کے ہاں تجربہ کا انکھوا بھی

Marfat.com

پھوٹتا ہے جو اسے عام صوفیانہ شاعری سے جدا کر دیتا ہے۔ غالب نے " تصوف کے رائج فکری نظام کو سوال کی زد پر لا کر حقیقت و سراب، وحدت اور کثرت، سانپ اور رسی کے عین درمیان ایک حقیقت کو بھی ابھارا ہے جو ان دونوں کو دیکھنے پر قادر ہے۔"

آگے چل کر وزیر آغا لکھتے ہیں " غالب نے یکتائی اور وحدت کے متوازی ایک ایسے جہان دیگر کا نظارہ کیا ہے جو مجسم حسن ہے مگر تجریدی یا ماورائی حسن نہیں۔ یہ حسن موجود کا ہے جس کے زاویے، قوسیں، دائرے، جس کی خوشبو، رنگت اور آواز اپنا ایک گوشت پوست کا جسم رکھتی ہے۔" صوفیانہ مسلک میں خواہش کی نفی ہے جبکہ غالب کے ہاں یہ ایک مثبت قوت ہے جو مؤثر فورس کے طور پر کام آتی ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

غالب خواہشات اور تمناؤں کو زندگی کا جزو لاینفک سمجھتا ہے۔ وزیر آغا نے نہایت عالمانہ پیرائے میں غالب کے مثبت صوفیانہ رنگ کا جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی اس کتاب نے بھی ان کی اقبال پر لکھی ہوئی کتاب تصورات عشق و خرد کی طرح اہل فکر و نظر کے ہاں شرف قبولیت پایا۔ ان مضامین سے ڈاکٹر وزیر آغا کے تبحر علمی اور علوم متداولہ پر ان کی گرفت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ بلاشبہ وہ ہمارے عہد کے مفکر، نقاد، محقق اور دانشور ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا ہمہ جہت پہلوؤں کے مالک ہیں۔ وہ بیک وقت شاعر، ادیب اور نقاد کی حیثیت سے دنیائے ادب میں اپنا منفرد اور ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کی تحریریں ان کے وسعت مطالعہ اور فکر تازہ کی غمازی کرتی ہیں۔ "غالب کا ذوق تماشہ" سے ان کی غالب پرستی نہیں بلکہ غالب دوستی کا پتا چلتا ہے۔ ویسے بھی غالب مزاجاً پرستش سے زیادہ دوستی کا قائل تھا۔

☆☆☆

Marfat.com

''یادِ یارِ مہربان''

ایران ذوالفقار علی شاہ کی نظر میں

رانا سمیع اللہ☆

سفر زندگی ہے یا زندگی سفر ہے یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہیں کیونکہ زندگی اور سفر کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ گویا سفر لازمۂ حیات ہے۔ سفر ظاہری بھی ہے اور باطنی بھی۔ اپنے آج کو گذرے ہوئے کل سے بہتر بنانا ہی اصل مقصود سفر ہے۔

اگر امروز تو تصویرِ دوش است
بہ خاکِ تو شرار زندگی نیست

مختلف اصناف ادب نے انسان کے باطنی سفر کو بخوبی اپنے اندر سمو لیا ہے۔ انسانی ذہن اور دل کی ان گنت جہتیں اور زمانی تغیرات کی بے شمار صورتیں ہمارے شعری اور نثری سرمائے میں محفوظ ہیں۔

سفرنامہ فی زمانہ ایک معروف صنفِ ادب ہے۔ عصر موجود کے سفرناموں میں اسلوب کا تنوع بھی ہے اور نقطۂ نظر کی رنگا رنگی بھی۔ کوئی مصنف اپنی قوتِ اظہار کو سفرنامے کے ذریعے آزماتا ہے تو کوئی زندگی کا شعور اس کے ذریعے سے عام کرنا چاہتا ہے۔ اس وقت ہمارے پیش نظر ذوالفقار علی شاہ کا سفرنامہ یادِ یارِ مھربان ہے جو کہ ایران کی سرسبز و شاداب اور پرکشش سرزمین کی سیر کی روائیداد ہے۔

ملک ایران اپنی تاریخ، ثقافت، روایات اور تہذیب و تمدن کے حوالے سے دنیا میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ اسلامی دور اور اس سے پہلے بھی ایران سے ہمارا ہمیشہ ایک خصوصی تعلق رہا ہے۔ اسلامی عہد میں تو ہم مذہب ہونے کی بدولت یہ تعلق '' من تو شدم تو من شدی'' کی کیفیت اختیار کرگیا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے ثقافتی، روحانی اور لسانی رشتے ہمارے اور اہل ایران کے درمیان موجود ہیں۔ انگریزی عہد سے پہلے فارسی ہی ہماری قومی

☆ اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

Marfat.com

زبان تھی اور گلستان و بوستان سعدی ہمارے درسی نصاب کا لازمی جزو تھیں۔ ہماری قومی زبان اردو کا وجود بھی درحقیقت ایک حد تک فارسی ہی کا رہین منت ہے۔ فارسی سے ہی اردو کو غزل کا مزاج ملا ہے۔ جب فارسی نے ہی گیسوئے اردو کو نکھارا اور سنوارا ہے تو پھر اردو شاعری میں حافظ اور سعدی کے اثر کو کون نظر انداز کرسکتا ہے۔

ذوالفقار علی شاہ کا سفرِ ایران ۳۰ ستمبر ۱۹۷۵ سے ۲۷ جنوری ۱۹۷۶ تک چار ماہ کے عرصے پر محیط تھا۔ حکومت ایران کی دعوت پر پاکستان سے ۳۶ اساتذہ پر مشتمل ایک وفد تہران روانہ ہوا۔ اس وفد میں تیرہ خواتین بھی شامل تھیں۔ برادر ملک ایران کے دورے سے اس وفد کا مقصد ان دو ہم مذہب، ہم نسل اور ہمسایہ اقوام میں صدیوں سے استوار تاریخی، تہذیبی، ثقافتی اور لسانی روابط کو مزید استحکام بخشنا تھا۔ مصنف اس وفد میں شامل تھا اور مصنف کا یہی سفر ایران اس کے سفرنامے یادِ یارِ مہربان کی تالیف کا سبب بنا۔

چار ماہ کے اس سفر میں سیروسیاحت کا لطف خاکِ وطن سے دوری کا غم، عزیز و اقارب سے جدائی کی اداسی اور میزبانی کی عنایات کا لطف سبھی چیزیں شامل تھیں۔ مصنف نے جن خوبصورت یا تاریخی مقامات کی سیر کی، وہاں کے مناظر کی خوبصورتی، تاریخ، ثقافت اور معاشرت وغیرہ کی بڑی دلکش اور معلوماتی عکاسی کی ہے۔

یادِ یارِ مہربان سلیس، دلنشین اور خوشگوار پیرائے میں ان تمام عوامل کا احاطہ کیے ہوئے ہے جو سرزمین حافظ و سعدی کی گل رنگ، گل پوش اور گل ریز فضاؤں کی دلکشی کا باعث ہیں، جس کی وجہ سے یہ خطہ مثل بہشت پوری دنیا کی نظروں میں کُھبا ہوا ہے۔

مصنف ایران کے قدرتی مناظر سرسبز و شاداب زمین اور مرغزاروں کے بارے میں رقمطراز ہے کہ "ایران کا ذرہ ذرہ مہر درخشان ہے، قطرہ قطرہ محبت کا بحر بیکران ہے اور سینہ سینہ شہد و شکر ہے" اور ایرانی لوگوں کے بارے میں مصنف اپنی رائے کا اظہار یوں کرتا ہے:
"ایرانی بڑے باذوق لوگ ہیں۔ مہر و محبت اور لطف و عنایات میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ ان کی یہی دلکشی و دلربا خوبیاں فارسی ادب میں نظر آتی ہیں۔"

اس سفرنامے میں محبوبیت کی فضا کیف آگیں حسینوں نے بھی پیدا کی ہے۔ چنانچہ ہر قدم پر سفرنامے کی روانی، رعنائی اور اثر آفرینی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور جمالیاتی حس آزادی اظہار میں بے باک ہوجاتی ہے:

شہر رشت شمالی ایران کے ایک پُرفضا مقام پر آباد ہے۔ یہاں کی عورتیں بے حد حسین و جمیل ہوتی ہیں مگر وہاں کا موسم مردوں کے لیے صحت افزا نہیں اور اکثر کمزوری کا شکار ہوجاتے

Marfat.com

ہیں۔ رنگ و روپ کا شاہکار خانم طیبہ اسی شہر کی باسی ہے۔ نازک اندام، صنوبر خرام، تیکھے تیکھے نقوش اور مسکراہٹ سے مزین باریک گلابی ہونٹ، ناک کی تلوار پر مکھی تو مکھی مچھر ایسی ہلکی پھلکی چیز بیٹھنے کی جرأت نہ کرسکتی تھی۔ بڑی ملنسار اور خوش خلق... طرح و رسم میں حدود و قیود کی پاسداری بھی بڑی سختی سے کرتی تھی، مگر بعض نئے آنے والے حضرات اسکی ملنساری اور خوش خلقی کو عنایت خسروانہ کا کرشمہ سمجھ کر عرض مدعا میں قباحت محسوس نہیں کرتے تھے... یہ اور بات ہے کہ چند دن آہیں بھرنے اور سبک سر ہو کر اپنی وضع بدلنے پر مجبور ہو جائیں۔

ایک اور جگہ پر مصنف ایرانی حسن پر یوں اظہار خیال کرتا ہے:

مجھے ایران جا کر اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ ایرانی شاعروں نے ماہ طلعت، زہرہ جبیں، غزال چشم، لالہ رخ، مرمریں بدن اور سیمیں بر کی سی اصطلاحیں کیوں وضع کر رکھی ہیں، سرو قامت اور صنوبر خرام کیسے لوگ ہوتے ہیں، زلفوں کو بنفشہ اور کمند سے کیوں تشبیہ دیتے ہیں۔ شاعروں نے ان کو خوابوں کے کسی غیر مرئی جہان سے مستعار نہیں لیا بلکہ جلوہ گاہِ حسن کی اصلی اور سچی عکاسی کی ہے۔

بسا اوقات مصنف فکری طور پر ایران کے ان مقامات سے جو ہماری مشترکہ تاریخی، تہذیبی اور سیاسی یگانگت کی سرحدوں پر واقع ہیں، پاکستان لوٹ آتا ہے اور دونوں ملکوں کے ماحول اور ثقافت کا موازنہ کرتے ہوئے وطن کی محبت میں سرشار ہو جاتا ہے: جیسے "پہاڑی ڈھلوان پر کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے دیہات بھی نظر آئے مگر پنجابی دیہاتوں کی رونق کہیں نام کو نہ تھی، نہ چوپال، نہ رہٹ، نہ ٹمیاریں":

مہیں ریساں دیس پنجاب دیاں

یادِ یارِ مہربان پوری جزئیات، خوبصورت تشبیہات اور دلکش انداز نگارش کے ساتھ ایک بہت دلچسپ سفرنامہ ہے۔ ذوالفقار علی شاہ نے اس سفرنامے میں لطف نظارہ کو ایک مرقع نگار کی طرح مجسم کیا ہے اور ایران کی لطافت و جاذبیت کو مزید دل افروز بنا دیا ہے۔ مصنف کے روح پرور اسلوب نے ہر قدم پر سفرنامے کی روانی، رعنائی اور اثر آفرینی میں اضافہ کیا ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

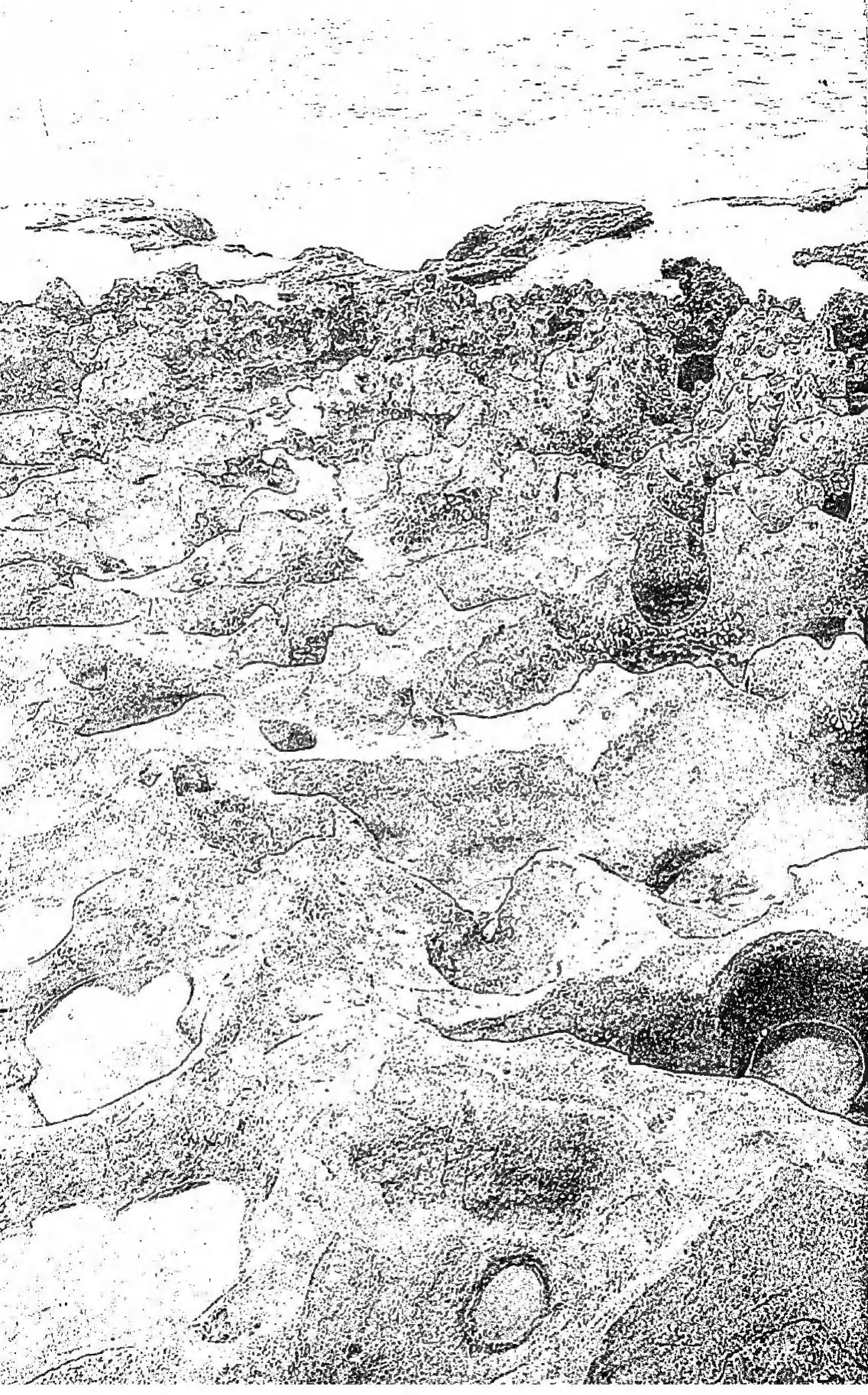

Marfat.com

PAYGHAM-E-ASHNA

Islamabad - Pakistan

Vol vi, Serial No 20 (Winter), March 2005

A Quarterly Journal of the Cultural Consulate of the Islamic Republic of Iran With a focus on the Common Cultural Heritage of Iran and South Asia

Marfat.com